# کاغذی ہے پیرہن



عصمت چغتائی

# کاغذی ہے پیرہن

عصمت چغتائی



پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

پہلی بار اکتوبر ۱۹۹۴ء - اشون، کارتک شک ۱۹۱۶ء



ISBN— 81— 230 —0269 - 6

KAGHZI HAI PAIRHAN
By Ismat Chughtai

PRICE: Rs. 65/ قیمت: روپے

ناشر: ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند،
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز ایمپوریا • پبلی کیشنز ڈویژن

- سپر بازار (دوسری منزل) کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
- کامرس ہاؤس، کریم بھائی روڈ، بلارڈ پائر، بمبئی ۴۰۰۰۳۸
- ۸، ایسپلینڈ ایسٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۶۹
- ایل ایل۔ آڈی ٹوریم، ۷۳۶، انا سلئے، مدراس ۶۰۰۰۰۲
- بہار سرکار کوآپریٹو بلڈنگ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
- نزد گورنمنٹ پریس، پریس روڈ، ترِی وینڈرم ۶۹۵۰۰۱
- ۱۰۔ بی، اسٹیشن روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴
- اسٹیٹ آرکیالاجیکل میوزیم بلڈنگ، پبلک گارڈن، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

# عرضِ ناشر

"کاغذی ہے پیرہن" کو کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے ہمیں خوشی ہو رہی ہے۔ مشہور ادیبہ عصمت چغتائی کی یہ نامکمل سوانح ہمارے رسالے "آجکل" میں مارچ ۱۹۷۹ء سے مئی ۱۹۸۰ء تک ۱۴ قسطوں میں شائع ہوئی ہے۔

موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے "غبارِ کارواں" (خود نوشت) کو بھی اس میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جو نومبر ۱۹۷۰ء میں "آجکل" میں شائع ہوا تھا۔

مصنفہ کا ارادہ تھا کہ سوانح عمری مکمل ہونے کے بعد وہ اسے ترتیب دیں گی اس لیے یہ قسطیں جیسے جیسے موصول ہوتی گئیں اسی طرح سے یہ "آجکل" میں شائع ہوتی رہیں۔ ارادہ کے باوجود نہ تو سوانحی حالات مکمل ہو سکے اور نہ انھیں ترتیب دیا جا سکا۔

ہماری درخواست پر مشہور نقاد جناب وارث علوی نے اس کی ایڈیٹنگ کی ذمہ داری قبول کی لیکن واقعات کو ترتیب دینا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے مشورے پر ہم اسے ویسے ہی اسی ترتیب سے ان کے دیباچے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اردو دنیا میں یہ سوانح نامکمل ہونے کے باوجود بھی مقبول ہوگی۔

ناشر

# فہرست

# دیباچہ

یہ نظریہ کہ فن پارے کی جمالیاتی قدر کے تعین میں فنکار کے ارادے اور سوانح کا استعمال نہیں ہونا چاہیے فن پارے کے قائم بالذات اور خود کفیل ہونے کے تصور سے فطری طور پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فن پارے کی معنوی تعلیقات فن کار کے لاشعور اور اجتماعی لاشعور اور اس کے ثقافتی ورثہ میں اتنی دور تک گئی ہوتی ہیں کہ ان کی تفہیم کے لیے فنکار کی زندگی، شخصیت، تاریخ اور ثقافتی پس منظر کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تفہیم اور تحسین کا عمل فن پارے کی پوری ساخت اور بافت سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی فن پارے کی ہیئت کے مطالعہ کے بغیر معنی تک رسائی ممکن نہیں۔ گویا تفہیم معانی اپنی ارتقائی شکل میں ہیئتی تنقید ہی کا روپ اختیار کرتی ہے۔ تفہیم معانی کے اس پیچیدہ عمل میں فن پارے کی جمالیاتی قدر کا تعین بھی ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہیئتی تنقید صرف تکنیک سے سروکار رکھتی ہے۔ ہیئت کے مطالعہ میں وہ حسب ضرورت شخصیت اور ثقافت دونوں کو حساب میں رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فنکاروں کی زندگی میں دلچسپی آج بھی قائم ہے اور سوانح عمریاں اور سرگذشتیں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ ایلیٹ نے تو ہملٹ کے متعلق یہاں تک کہا ہے کہ ہملٹ کو سمجھنے کے لیے ہمیں شیکسپیئر کے متعلق اتنا کچھ جاننا پڑے گا کہ وہ خود اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

اسی لیے تفریحی ادب کے مقابلہ میں سنجیدہ ادب ایک زیادہ تربیت یافتہ، سوفسطائی اور دقت پسند ذہن کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ذہن نہ صرف فن پاروں کا پرستار ہوتا ہے بلکہ اتنا ہی ان تنقیدوں کا دلدادہ ہوتا ہے جو ان پر لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے بڑے فن پاروں پر لکھی گئی تنقیدیں

ان کے فن کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں حقیقت پسند فنکار کا فن زیادہ تر اس کے شخصی تجربات اور گرد و پیش کے مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی اور زمانہ کا مطالعہ اس کے آرٹ کے حقیقی سرچشموں کا سراغ بن جاتا ہے۔ سوانح، تاریخ اور ماخذات سے ایک باشعور نقاد کیا کام لیتا ہے اس کی بہترین مثال جیمس جائیس کے سوانح نگار رچارڈ ایلمین میں ہمیں ملتی ہے ـــــ ایلمین کی ذات میں سوانح نگار اور نقاد کا ایسا خوبصورت امتزاج ہے کہ جائیس کی زندگی اور اس کا آرٹ قدم سے قدم ملاکر چلتے ہیں۔ اس کی شخصیت اور زندگی کی ہر تفصیل اس کے فن کے کسی نہ کسی پہلو کو متوثر کرتی ہے۔ جائیس کے مشہور افسانے The Dead کے تجزیہ میں اس نے کرداروں کا سراغ جائیس کے حقیقی دوستوں اور رشتہ داروں میں لگایا ہے۔ افسانہ کے شہر، شہر کے راستوں، مکانوں، ہوٹلوں، کا تعین کیا ہے، یہاں تک کہ افسانہ کے آخر میں برف باری کے بے مثال بیان میں دوسرے مصنفین کی اسلوبی خصوصیات کے اثرات کا کھوج بھی لگایا ہے۔ تشکیل افسانہ کے مختلف مراحل کا یہ پورا بیان افسانہ جتنا نہیں تو اس سے کم ہوش ربا نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ کہ ادب کا تنقیدی مطالعہ فنکار کی شخصیت، زندگی، خاندان اور معاشرے کے علم سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ اس نظر سے دیکھیں تو عصمت چغتائی کی خود نوشت سوانح عمری "کاغذی ہے پیرہن" عصمت کی زندگی اور شخصیت کے مطالعہ میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے کل ۱۴ ابواب رسالہ "آج کل" میں مارچ ۱۹۷۹ء سے مئی ۱۹۸۰ء تک چھپتے رہے۔ اس سلسلہ کو "مسلسل ناول" کا توصیفی نام پانچویں قسط اور بعد کی ایک دو قسطوں میں دیا گیا۔ سوائے پہلے باب کے باقی کے تمام ابواب پر عنوانات دیے گئے ہیں پہلے باب کے ایک بلاک میں کتاب کا انتساب ہے۔ دوسرے باب کے ایک بلاک میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔ جو اس تصنیف کی نوعیت کو اجاگر کرتی ہے۔

> "دوسرا باب بھیج رہی ہوں۔ میں اپنی یادداشت اور خاندان کے لوگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں کو جنھوں نے مجھے متاثر کیا اور ہر ایک طبقہ کی اُلجھنوں، نئے سوالوں اور ان کے حل کے مسائل ـــ سب ایک عجیب الجھی ہوئی سی چیز ہے۔ جو چیز جب بھی تیار ہو جائے گی بھیجتی رہوں گی۔ اسے مختلف عنوان سے چھپنے دیجئے۔ تسلسل بعد میں ایڈٹ کرتے وقت قائم

ہو جائے گا۔"

یہ تسلسل قائم نہیں ہو سکا کیوں کہ عصمت کی زندگی میں کتاب کو ایڈٹ کرنے کا موقع نہیں آیا۔ میرا خیال ہے اگر وہ ایڈٹ کرتیں بھی تو تسلسل محض واہمہ ہی رہتا۔ بہر حال جس ترتیب سے ابواب شائع ہوئے ان میں جو بھی تسلسل مل جائے اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ ذکر ہوا اسے مسلسل ناول بھی کہا گیا ہے لیکن اسے بطور ناول یا خود نوشت سوانحی ناول پڑھنا بھی مشکل ہے کیوں کہ اس کے تمام کرداروں کے نام اور انھیں پیش آنے والے واقعات حقیقی ہیں یہ صریحاً خود نوشت ہے گو اس کی واقعہ نگاری اور کردار نگاری میں ناول نگاری کی تکنیکوں اور اسالیب کا استعمال ہوا ہے جو بالکل فطری ہے کیونکہ سوانح کو ناول کے ڈھنگ سے لکھا جا سکتا ہے۔

ایک مکمل آپ بیتی میں عموماً پیدائش سے لے کر دم تحریر تک کے واقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ کتاب کا زمانی وقفہ عصمت کے گریجویٹ ہونے اور اسکول میں ملازمت اور لحاف پر مقدمہ کے زمانہ تک یعنی صرف چند برسوں پر مشتمل ہے۔ بچپن کے واقعات شمن کے کردار کے ذریعہ "ٹیڑھی لکیر" میں بیان ہوئے ہیں جو صحیح معنی میں خود نوشت سوانحی ناول ہے۔ بچپن کے واقعات کا ذکر زیر نظر کتاب میں شامل ایک اور مضمون میں ہوا ہے جو انھوں نے "آج کل" کے سلسلہ مضامین میں "غبار کارواں" کے تحت لکھا تھا۔ یہ مضمون بھی بہت خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ عصمت اپنے انٹرویوز اور قلمی خاکوں میں بچپن کے واقعات کا ذکر کرتی رہی ہیں لہٰذا ان کا اعادہ نہ کرکے وہ تکرار کے عیب سے بچ گئی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر کتاب کے زمانی عرصہ کو ۱۹۹۰ء تک پھیلایا جاتا تو کیا یہ زیادہ دلچسپ اور کارآمد بن سکتی تھی۔ میرا خیال ہے کارآمد تو ہوتی لیکن شاید دلچسپ نہ بنتی۔ کارآمد اس معنی میں کہ ترقی پسند تحریک، روس اور چین کے سفر، عصری واقعات اور فلمی دنیا کی جھلکیاں اس کی دستاویزی اہمیت میں اضافہ کرتیں، لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوتا کہ صحافتی مواد بڑھ جاتا اور بالخصوص ان واقعات کا ذکر ہوتا جو ہم عقیدہ ہم عصروں میں مشترک ہوتے ہیں۔ ان پر عصمت کی رائے زنی کے مختلف طریقوں سے بھی ہم ان کے مضامین اور انٹرویوز کے ذریعے سے واقف ہیں۔ اس لیے میں نے شبہ ظاہر کیا کہ خود نوشت کو زمانی عرصہ پر دور تک پھیلانے سے شاید وہ دلچسپ نہ بنتی۔

تو کیا کتاب کی موجودہ صورت عصمت کی شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایک خاص ذہنی کیفیت کے تحت لکھی گئی ہے۔ یہ کیفیت پوری کتاب میں موجود ہے۔ یہ کیفیت اپنے

خاندان کے بھولے بسرے افراد اور واقعات کو محبت بھرے دل سے یاد کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ یادیں اتنی شخصی ہیں کہ غیر شخصی واقعات، خارجی دنیا کے جھمیلوں کا، دوسرے ملکوں کی سیاست کا اور ادبی اور فلمی دنیا کی دوسری نامور ہستیوں کا ذکر شاید تحریر کے اس آہنگ کو جو ایک خاص ذہنی کیفیت کی تخلیق سے مضروب کرتا۔ عصمت کی طبیعت اس طرف آتی ہی نہیں اور اس کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "کاغذی ہے پیرہن" تکرار اور اطناب، صحافتی مواد، بھرتی کی باتوں، اکتانے والی رائے زنی اور تھکانے والے باتونی پن سے بچ جاتی ہے۔

اور سچ بات یہ ہے کہ "کاغذی ہے پیرہن" عصمت چغتائی کی "یادوں کی بارات" ہے۔ وہ کہہ چکی ہیں کہ وہ اپنی یادداشت اور خاندان کے لوگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں کو جیسے جیسے انھیں یاد آتا جائے گا، جیسا ان کا جی چاہے گا قلم بند کرتی جائیں گی۔ اور انھوں نے یہی کیا۔ نہ تسلسل کی پروا کی نہ اسے ناول بنانے کی۔ اور یہ بھی ان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ دراصل اس کتاب کا پورا مواد خود نوشت ہی کے لیے مناسب ہے۔ اسے ناول بنائے جائیں تو ناول تو بنتا نہیں اور خود نوشت بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ دراصل حقیقی کرداروں اور سچے واقعات کا دباؤ تخیل پر اتنا زیادہ ہے کہ انھیں افسانوی کرداروں اور حقائق میں بدلا نہیں جا سکتا۔ پھر یہاں حقیقت افسانہ سے زیادہ حیران کن ہے خصوصاً بچھو پھوپھی کا کردار جس پر عصمت نے ایک افسانہ لکھا۔ دوسرے واقعات اور کرداروں پر عصمت نے افسانے نہیں لکھے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ واقعات چاہے اتنے ڈرامائی اور حیرت ناک کیوں نہ ہوں سب کے سب افسانوں میں نہیں ڈھلتے۔ اور عصمت نے عقلمندی کی کہ انھیں افسانہ نہیں بنایا گو ان کے بیان نے افسانہ کا لطف پیدا کر دیا۔

بصورتِ موجودہ "کاغذی ہے پیرہن" ایک انوکھے اور دلچسپ خاندان کے طور طریقوں، عادات و عقائد، رسم و رواج، ہٹ دھرمیوں، نفرتوں اور محبتوں کی عجیب و غریب داستان بن گئی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ مرزا نسیم بیگ چغتائی اور ان کے بھائی اور بہنیں اور خود ان کے دس بچے، بھانجے بھتیجے، اور نہ جانے کس کس کے ماموں ممانیاں، خالو خالائیں، پھوپھا پھپھیاں اور ان کی اولادیں، بے شمار نوکروں اور ان کے کنبوں پر مشتمل یہ خاندان ایک آبائی چغتائی قبیلہ کی مانند ہی نظر آتا ہے جس کے افراد آگرہ، علی گڑھ، بریلی، لکھنؤ، دہلی، جودھپور، سانبھر، سوجت، جاورا، اور نہ جانے کہاں کہاں ہمہ وقت آمد و رفت کرتے رہتے ہیں۔ سب کی رگوں میں چنگیزی خون ہے جل

کے سبب اکثر گھریلو جھگڑوں میں بھی تاتاریوں کی یلغار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس خاندان میں پنپنے اور جوان ہونے کے لیے قدرت نے اس کے افراد کو ایک غیر معمولی حسین ظرافت سے نوازا ہے۔ ایک دوسرے کو ستاتے ہیں، بلکہ رلاتے ہیں تو ہنستے ہیں، زخم لگتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ پھیپھڑوں میں کیڑے پڑتے ہیں تو ہنستے ہیں۔

عصمت کی شخصیت کا سب سے دلنواز عنصر یہی حسین ظرافت ہے ظرافت ہی اس کے طنز کو معتدل بناتی ہے اور اس کے زہر کا تریاق بنتی ہے عموماً سرگذشتوں میں بزرگوں کے کارناموں ان کے اعمالِ صالحہ اور ان کی ثقہ شخصیتوں کا دل پر رعب طاری کرنے والا بیان ہوتا ہے ——— لیکن عصمت تو ان لوگوں میں سے ہے جو بتوں کو توڑتے ہیں تو وہ پرستش کے قابل لگتے ہیں کیونکہ ان کی بنیادی انسانیت سامنے آتی ہے جو ہمارے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ عصمت نے تو واقعی اس کتاب میں لنکا ڈھائی ہے، کسی کو نہیں بخشا، سب راز طشت ازبام کیے ہیں۔ اور دراصل خاندان کے Scandals راز بھی کہاں ہوتے ہیں دیر سویر سبھی کے علم میں آتے ہیں۔ یہ کتاب بہت تلخ، بہت ترش، بہت سفاک، بہت دل شکن بن سکتی تھی اگر لیڈی چنگیز خاں دقیانوسیت توہمات، خاندانی پندار، ضد اور ہٹ دھرمیوں پر اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی بوچھاڑ کرتیں، لیکن اب ان یادوں میں شام کی خنکی پیدا ہو چکی ہے بیتی محبتیں یاد آتی ہیں۔ جو بھی لوگ تھے انسانی رشتوں میں جیتے تھے۔ لاگ اور لگاؤ کے ہیر پھیر تھے کشش بھی تھی اور کشیدگی بھی۔ عصمت کے بیان میں بے لاگ حقیقت نگاری ہے لیکن کلبیت نہیں۔ خوش طبعی ہے چڑچڑاپن نہیں۔ اور سب سے بڑی چیز تو وہ بے پناہ محبت ہے جو ایک عورت اپنے خاندان کو دے سکتی ہے۔

عصمت دل کی صاف، محبت اور ماتا سے بھری ہوئی نہایت ذہین۔ ہوشیار، جرأت مند اور بے باک خاتون تھیں۔ ایک چیز جو ان میں سرے سے ناپید تھی وہ سماج کا، مرد کا، اور طاقت کا خوف تھا۔ وہ عورتوں کی بے وقوفیوں، مردوں کی حماقتوں، پڑھے لکھوں کی جہالتوں اور دولتمندوں کی ذہنی تہی مائگی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ زندگی کی مسرتوں کی طلب گار اور ظلم، تشدد، سفاکی، جبر اور ناانصافی کے خلاف سدا مصروف پیکار رہتی تھیں وہ Feminist بنے بغیر آزادیٔ نسواں کی علمبردار تھیں۔ وہ مرد کو دیکھ کر چراغ پا اور عورت کو دیکھ کر نمناک نہیں ہوتی تھیں۔ انھوں نے عورت پر مرد کی چیرہ دستی کی داستان سنائی لیکن عورت پر عورت کے ظلم کی پردہ پوشی نہیں کی۔ نہ ہی مرد میں عورت کی اور عورت میں مرد کی فطری جنسی دلچسپی کی قدر کم کی عیاری، ریاکاری، سمجھوتہ بازی سے بیزار

وہ ایک ایسی خاتون تھیں جن کی خوش طبعی، فراخ حوصلگی، رواداری اور وسعت قلب نے ان کی شخصیت کی دل رُبائی کو دو بالا کر دیا تھا۔ وہ جن سماجی اور خاندانی حالات میں پروان چڑھیں ان میں ڈرپوک اور سعادت مند نہیں بلکہ سرکش اور باغیانہ شخصیت کی ضرورت تھی جو عصمت کے لیے فطری تھی کیوں کہ ان کی رگوں میں چنگیزی خون بہتا تھا اور بہت سے بھائیوں کی چھوٹی بہن ہونے کے سبب وہ لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں نہیں بلکہ لڑکوں کے ساتھ لڑکوں ہی کے کھیل کھیلتی تھیں۔

اس سرگزشت میں جو کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں عصمت کے والد مرزا نسیم بیگ کا کردار ایک قبائلی سردار کی شان رکھتا ہے۔ ماں کے کردار میں زمین کی وسعت ہے جس کی آغوش میں اپنے اور دوسروں کے ڈھیروں بچے پل کر جوان ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو میں سے بھائی کی محبت اور نتیجتاً پھوپھی اور بھتیجوں کے رشتہ کی ترجمانی ہے مثلاً عصمت کا ماموں زاد بھائی جگنو اسی گھر میں بڑا ہوا۔ وہ گھر کے تمام بچوں میں جو شیطان کے پرکالے تھے، ایک سیانا سمجھدار اور بردبار لڑکا تھا۔ دیکھنے میں بھی خوبصورت اور ہماری عصمت بی بی کا پہلا پیار۔

"مجھے جگنو ہمیشہ بہت پیارے تھے۔ اگر ان سے میری شادی ہو جاتی تو میں ایک نہایت پتی ورتا بن جاتی۔ مجھے دراز قد مرد پسند تھے اور وہ گھر میں سب سے اونچے نکلتے تھے آج میں اپنی کہانیوں کے ہیرو کو پرکھتی ہوں تو انھیں بالکل جگنو پاتی ہوں۔ جگنو کے دل کا حال میں وثوق سے نہیں بتا سکتی ہوں مگر میں نے ہمیشہ انھیں اپنا رومانی ہیرو مانا۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ عصمت اگر پتی ورتا بن جاتیں تو افسانہ نگار نہ بن سکتیں اگر بنتیں بھی تو دوسری قسم کی جن کے افسانوں کے کاشانہ میں جگنو ہی کی روشنی ہوتی۔ خود عصمت کو اس بات کا احساس تھا۔ وہ لکھتی ہیں :

"وہ ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر، بہترین شوہر، اچھے باپ اور اب تو ماشاء اللہ نانا اور دادا بھی بن گئے ہیں۔ اگر میری شادی ان سے ہو جاتی تو وہ مجھے مٹی کا تودہ بنا دیتے اور ساری سیمابیت ختم ہو جاتی میری سمجھ بوجھ پر ایک بھاری سا تالا بن کر جم جاتے۔"

اس کتاب کا دوسرا جاندار کردار بھی پھوپھی ہی کا ہے اور وہ ہیں عصمت کی سگی پھوپھی — بچھو پھوپھی، اردو افسانہ کا شہرۂ آفاق کردار۔ مرزا نسیم بیگ کی یہ بہن اندر سے اتنی جلی بھنی اور تلخ کیوں

تھیں اس کا جواب افسانہ نہیں دیتا لیکن کاغذی ہے پیرہن میں مل جاتا ہے جس کے تیسرے اور چوتھے باب میں جن کے عنوانات "تصادم" اور "ادھوری عورت" ہیں۔ بچھو پھوپھی کی زندگی اور کردار کا ہوش رُبا بیان ملتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی نے بچھو پھوپھی کے وجود کو زہر سے بھر دیا تھا جو ان کی زبان سے طنز طعنہ اور کوسنوں سے ظاہر ہوتا۔ کوسنے دوسروں کے لیے اتنے نہیں تھے جتنے اپنوں کے لیے تھے خصوصاً ان کے بھائی اور عصمت کے والد مرزا قسیم بیگ کے لیے۔ ان میں دل کی آگ کم اور بھڑاس کی کیفیت زیادہ تھی۔ نفرت بناوٹی تھی، محبت سچی تھی۔ یا یوں کہیے کہ وقت نے نفرت کی شدت ختم کردی تھی زبان میں ڈنک رہ گیا تھا لیکن زہر نہیں تھا۔ بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے کیوں کہ وہ ماں کے دودھ میں دُھلے ہوتے ہیں۔

سچ بات یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ایک انوکھے چغتائی خاندان کے طور طریقوں اور کش مکشوں اور رنگ برنگے کرداروں سے واقف ہونے کا ایسا موقع فراہم کرتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہم زندگی کے ایک بڑے تجربے سے دوچار ہوئے ہیں کتنی خود نوشتیں تخلیق کے اس بلند مقام کو پہنچ پائی ہیں؟

جودھپور، سانبھر، سوجت اور جاورا ــــــ راجستھان کے ان چھوٹے شہروں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی آئینہ داری اس تصنیف کا امتیازی وصف ہے مثلاً سوجت کی بال ودھواؤں کا ذکر لیجیے۔ بیوہ کی شادی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ستی کی رسم کے ختم ہونے کے ساتھ ان ودھواؤں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ جب وہ جوان ہوجاتیں تو کسی عہدے دار یا جاگیر دار سے تعلق ہوجاتا جس پر ان کے عہدوں اور دولت کی وجہ سے کوئی انگشت نمائی کی جرأت نہ کرتا۔ ان کے بچے راج گولے کہلاتے تھے۔ محل کی ڈاکٹرنیاں جناتی تھیں اور بچہ وہیں پلتا تھا۔ ناجائز بچوں کو مارنے کی کوئی ضرورت نہ تھی نہ لڑکی کے ساس سسر یا والدین لڑکی کو کچھ کہتے تھے۔ بچہ جس کا جی چاہے محل میں پہنچا دے۔ کچھ انعام ہی ملتا تھا۔ ان بچوں کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی تھی۔ ان کے الگ اسکول تھے اور ملٹری کی ٹریننگ کے بعد راج گولا پلٹن میں بھرتی ہوجاتے تھے۔ یہ پلٹن عموماً مہاراج کی سالگرہ یا کسی شادی کے موقع پر نکلتی تھی اور اس میں ایک ایک جوان مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ راج گولے کے معنی ہیں راجہ کے بیٹے یا متبنّیٰ (لے پالک)۔ اس قسم کی لڑکیاں بھی بڑے لاڈ سے پالی جاتی تھیں۔ اور مہارانی کی ڈاوڑیاں کہلاتی تھیں۔ کہنے والے کہتے تھے ان کی آپس میں نہ شادیاں ہوسکتی ہیں نہ تعلق۔ کیوں کہ کون جانے آپس میں ان کا بھائی بہن کا رشتہ ہو۔ ڈاوڑیوں کی شادی کا کبھی کوئی قصہ نہیں

سُنا ـــــ ویسے عموماً بیوہ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی تھیں کسی کے ساتھ بھاگ بھی جاتیں سُنا تھا کراچی میں ان کی بڑی مارکیٹ تھی۔ وہاں کے وڈیرے جوان تندرست لڑکیاں شوق سے خریدتے تھے اور وہاں سے وہ مرکری نکلتی تھیں۔

کیا کسی سماجی تحقیق میں آپ کو یہ باتیں جاننے کو ملی تھیں۔ اور عصمت کا بیان دیکھیے۔ کیسے تضادات کو آہنگ میں بدلتا ہے۔ ایک سسٹم کے لیے رواداری ہے لیکن ان حالات کے لیے نہیں جنھوں نے سسٹم کی ضرورت پیدا کی۔ یہ پورا مواد قرۃ العین حیدر کی ناولوں کے کام آسکتا ہے۔ دلچسپ سوال یہ ہے کہ عصمت نے اس مواد سے کوئی تخلیقی کام کیوں نہیں لیا۔ وجہ شاید یہ ہو کہ رسم و رواج، تہذیبی رنگ آمیزی اور تقدیر کی گردشوں میں قرۃ العین حیدر کی مانند عصمت کو دلچسپی نہیں تھی یعصمت کی سفاک حقیقت نگاری غیر منصفانہ رسوم کی المناکیوں کے ذکر میں تلافیٔ حیات کے دلاسوں کو قبول نہیں کرتی۔ عصمت کے فن پر غور کرتے وقت اس نکتہ کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ باوجود اس کے کہ ان کا سماج کا مشاہدہ وسیع تھا انھوں نے اپنے سماجی افسانوں کو سماجیاتی نہیں بننے دیا۔ وہ اپنے تخلیقی تخیل کو دستاویزی یا تاریخی بننے نہیں دیتیں۔

'کاغذی ہے پیرہن' میں راجستھانی زندگیوں کی اتنی رنگا رنگ اور معنی خیز جھلکیاں ہیں کہ دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش اس کے پس منظر میں انھوں نے کوئی ناول لکھا ہوتا۔ بیوہ بانیوں اور ان کے راجستھانی لباس کا ذکر تو اتنا خوبصورت ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ اسی طرح شاہی شمشان کے بیان میں دیواروں پر ان رانیوں اور داسیوں کے ہاتھوں کے نشانات کا ذکر جو راجہ کے ساتھ چتا پر پھونکی گئیں۔ مارواڑی عورتوں کا بھڑک دار لباس جس کا رنگ مہینوں کھلا رہتا اور جب تک تار تار نہ ہوجاتا بدلا نہ جاتا۔ عورتوں کا تال پر جاکر کپڑے اتار کر کپڑے دھونا۔ مرد پلٹ کر بھی نہ دیکھتے۔ عورتوں کا جسم کوئی عجوبہ نہ تھا۔ عورتوں کی آوازوں کا سریلا پن، ان کے گیت، سروں میں غضب کا سوز اور اداسی، ایک عجیب سی تنہائی کی پکار، میٹھا میٹھا غم، چلچلاتی دھوپ میں سپیروں کا ناچ، رات کی خاموشیوں میں کٹھ پتلیوں کا تماشہ۔ جودھپور کے شیر و شکر مسلمان، مسلمان جو معتبر عہدوں پر فائز تھے اور صلح پسند میاں بھائی کہلاتے تھے۔ نہ جانے کب برقع غائب ہوگیا۔ باہر نکلتے وقت ہندو عورتوں کے رواج کے مطابق سب شریف گھرانوں کی بیویاں چادر اوڑھتی تھیں عظیم بیگ کا راجپوتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس لیے ہر وقت راجپوتی آن بان کا ذکر رہتا۔ عظیم بیگ اپنے بچوں کو بھی موہن سنگھ، سوہن سنگھ اور مکھن سنگھ کے نام سے پکارتے تھے۔

اس خودنوشت میں عظیم بیگ کے کردار کی کچھ دلچسپ جھلکیاں سامنے آتی ہیں مثلاً شاہد احمد دہلوی سے عظیم بیگ کے گہرے مراسم تھے۔ شاہد احمد کے والد ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "امت کی مائیں" کے خلاف مسلمانوں میں بڑا غم و غصہ تھا۔ اس پر پابندی لگادی گئی تھی۔ شاہد احمد بھی نچلے کہاں بیٹھتے تھے پھر کتاب چھاپ دی پھر احتجاج ہوا۔ اب شاہد احمد کی یاری کے لیے عظیم بیگ میدان میں کود پڑے اور انھیں چوری کا راستہ دکھایا۔ یعنی لکھا کہ کتابیں انھیں بھیج دی جائیں۔ ریاست جودھپور خود مختار ہے اور برٹش سرکار کی لگائی ہوئی بندشوں پر یہاں عمل نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کتاب کی حفاظت کروں گا دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔

روکنے والے نکل ہی آئے۔ ان کا تانگہ روکا اور خوب پٹائی کی۔ دوسرے دن اخبار میں نکلا کہ جودھپور میں برٹش قانون نہ چل سکے، لیکن اسلام جودھپور میں بھی زندہ ہے اور مسلمانوں نے ابھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔

دراصل عظیم بیگ کا کردار تو ایسا ہے کہ اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا پوری خودنوشت پر چھا جاتا۔ عصمت نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اسے قابو میں رکھا۔

اپنے افسانہ "لحاف" کے مقدمہ کے سلسلہ میں عصمت شاہد احمد دہلوی کے ساتھ ہی لاہور گئی تھیں اور وہ مہمان بھی بنیں تو کس کی؟ میاں ایم اسلم کی۔ "گناہ کی راتیں" کے مصنف کو لحاف پر سخت اعتراضات تھے۔ عصمت نے ان کے مردانہ پندار کو جس طرح پاش پاش کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مرد کے فکری حصاروں پر یہ حملہ ایک نئی عورت کی نشاندہی کرتا ہے۔ زندگی میں، ادب میں، سماج میں کتنا ہو کس کو کس کا تھا جسے عصمت چلا لینے کو رضامند نہیں تھیں۔

اس نئی عورت کے خدوخال کی شناخت کے اشارے پوری کتاب میں بکھرے پڑے ہیں مثلاً جاورہ کے نواب صاحب کے یہاں عصمت چند مہینوں کے لیے ان کی لڑکیوں کو پڑھانے پر مامور تھیں۔ وہ تو کہیے نواب صاحب کے کسی ایک بیٹے کی بہو بنتے بنتے بچ گئیں۔ ایک جدید تعلیم یافتہ خود مختار عورت اور ایک سڑے ہوئے جاگیردارانہ نظام کا تضاد یہاں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بھلا عصمت کا آزاد، شگفتہ، اور زندگی کے ولولوں سے گونجتا ذہن، حقہ پیتے نواب، ان کے محل کی اداس دیواروں، ان کے کاہل لڑکوں اور بے مصرف زندگی گزارتی کم علم، بھی ہوئی لڑکیوں کو کیا قبول کرتا۔ جاورے کے نواب صاحب تو محض علامت تھے ایک پورے طریقۂ زندگی کی جو انحطاط کا شکار تھا اور جس سے جدید ذہن اس طرح بدکتا تھا گویا وہ حنوط زدہ لاش ہو۔ عصمت کے یہاں اس

شدید ردِّ عمل کا علامتی اظہار سونے کی اگالدان میں ہوا ہے۔ ذرا سوچیے تو کہ اگر عصمت کی شادی نوابی خاندان میں ہوجاتی تو عصمت کیا کرتیں۔ انہی کے الفاظ میں سنیے : "میں نے کبھی سونے کی اگال دان" میں نہیں تھوکا۔ جاتے ہی پہلا کام یہ کروں گی کہ غلاموں کو سونے کا اگالدان حاضر کرنے کا حکم کروں گی اور جب اگالدان حاضر کی جائے گی تو میں پٹاک سے تھوک دوں گی۔"

یہاں پوری جاگیردارانہ تہذیب مع اس کے کھوکھلے تکلفات اور دکھاووں کے، نااہلیت، کاہلیت اور پژمردگی کے عصمت کے طنز کا ہدف ہے۔ جب عصمت کا سابقہ نو دولتیوں سے پڑا تو ان کے ذہن دولت کے دکھاووں اور اندرونی خالی پن کو عصمت نے اسی طرح بے نقاب کیا۔ مڈل کلاس کی گھٹن، محدود اور پابند زندگی، اور حیات دشمن اخلاقیات کا بھی انھوں نے پردہ چاک کیا۔

دراصل عصمت زندگی میں آزادی، شگفتگی، کام، ذمہ داری، تعلیم اور چھوٹی موٹی مسرتوں اور ولولۂ حیات اور تخلیقی نشاط آفرینیوں کی قائل تھیں۔ عصمت نے خود اپنے آپ کو بنایا تھا۔ اپنے بل بوتے پر تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اپنی کارکردگی کا آغاز لڑکیوں کے اسکول میں بطور پرنسپل کیا تھا یعنی ملازمت میں بھی عورتوں کی تعلیم کا آئیڈیل در پیش رہا۔ دراصل عصمت کی نسل کے سبھی لوگوں کے ذہن آزادی، سماجی خوش حالی، پچھڑے طبقوں کی سماج سیوا اور عورتوں کی تعلیم اور حریت کے آدرشوں سے تابناک تھے۔

بریلی کے جس اسکول سے عصمت نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اس میں چند طالبات، ایک کلاس روم، ایک آفس کا کمرہ اور پرنسپل کی رہائش گاہ تھی جو ہاسٹل کے کام بھی آتی۔ اس ہاسٹل میں جو چار پانچ لڑکیاں رہتی تھیں ان میں ٹرینی کی لڑکیوں کے علاوہ خود عصمت کی بھانجیاں بھتیجیاں تھیں غرض کہ جو ماڈرن عورت ہندوستان میں پیدا ہورہی تھی وہ آزاد تو کیا ہوتی۔ گھر کی، خاندان کی سماج کی اور پورے طبقۂ نسواں کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر تھیں۔

علی گڑھ میں شیخ عبداللہ، ان کی بیگم عالیہ آپا اور ان کی بیٹی ڈاکٹر رشید جہاں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے علمبردار تھے۔ ان کے یہاں جن لڑکیوں کو پناہ ملتی تھی وہ کیسی بپتاؤں سے گزر کر آتی تھیں ان کا دل ہلا دینے والا بیان عصمت نے کیا ہے۔ دراصل عورتوں سے ناانصافیوں، ان پر ظلم، اور ان کی دُردشاؤں کے ایسے ایسے واقعات اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں کہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عصمت کا ذہن جو کچھ بنا وہ کیوں اور کیسے بنا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عصمت کے یہاں بغاوت جدید تعلیم کا عطیہ تھی۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بغاوت کی یہ چنگاریاں ظلم و جبر کی اس سنگ باری سے پھوٹی تھیں جس کا ہدف

ہندوستانی عورت تھی۔

رشید جہاں عصمت کا آئیڈیل تھیں لیکن رشید جہاں کا ذکر اس کتاب میں بہت زیادہ نہیں۔ البتہ "انگارے" کی اشاعت پر جو ہنگامہ پورے ملک میں پیدا ہوا اور علی گڑھ میں خصوصی طور پر جس کا ہدف رشید جہاں تھیں کیوں کہ اس میں ان کا افسانہ شامل تھا۔ اس کا تاریخی بیان اس کتاب میں ملتا ہے۔ اسی طرح ان مشکل حالات میں تعلیم نسواں کی ذمہ داری اٹھانے والے لوگوں کی دشواریوں، عجیب و غریب ٹرسٹیوں کے مضحکہ خیز تجربات، اور ایک اسکول ٹیچر کی آزمائشوں کے بیان میں عصمت کے قلم نے جو گل کھلائے ہیں ان کے سبب یہ ابواب زعفران زار بن گئے ہیں۔

عصمت ہماری بہت مقبول، بہت مشہور، ایک جغادری مصنفہ ہیں۔ لیکن ان کی صحیح قدر آج بھی پہچانی نہیں جاتی۔ دقیانوسی ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ ہے جو آج بھی انھیں محض "لحاف" اور "تل" کی مصنفہ کے طور پر جانتا ہے۔ وہ ان کی بے باکی اور بغاوت سے خوش نہیں ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اردو تنقید نے ان پر جس توجہ کی وہ مستحق تھیں وہ توجہ نہیں کی۔ انھیں ایک بھی ایسا معتبر نقاد نہیں ملا جو انھیں سمجھ اور سمجھا سکے اور ان کے فن کی بلندیوں کا احاطہ کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ "کاغذی ہے پیرہن" کی کتابی صورت میں اشاعت سے عصمت کی شخصیت میں ایک نئی دلچسپی کا آغاز ہوگا اور اگر اس کا مطالعہ صحیح ڈھنگ سے کیا گیا تو ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جائے گا کیوں کہ ان صفحات سے عصمت کا جو کردار ابھرتا ہے وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونے والی، جدید تعلیم یافتہ عورت کا کردار ہے جو مردانہ برتری کے تعصبات عورت کی طرف مذہبی تنگ نظری کی زائیدہ افترا پردازیوں، دقیانوسیت، لکیر کی فقیری، رسم و رواج کی غلامی، جہالت، غربت، اور توہمات کی ماری ہوئی ہماری دیمک زدہ زندگی کے کسی ایک پہلو سے بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ جاگیردارانہ اور مہاجنی تمدن کے دکھاوے، زیورات میں لدی پھندی جاہل بے وقوف عورتیں، بچوں کی نگہداشت سے بے پروا بڑے کنبے، ادھر ادھر ہاتھ مارنے والی جنسی آوارگی، طبقاتی، نسلی اور جنسی تفوق کی باتیں، ظلم، جور، جبر اور استحصال، فرقہ وارانہ تشدد، جنگ کی سیاست ــــ ان سب کے خلاف عصمت کی بغاوت قطعی، حتمی اور شوریدہ سر تھی۔ جب دوسرے باغیوں کے سر جھک گئے تب بھی عصمت کا بانکپن قائم رہا۔

جب عصمت نے لکھنا شروع کیا تھا تو یہ جدید ہندوستانی عورت نئی نئی ادب کے افق پر نمودار ہوئی تھی نمودار ہو کر اب پھر کہیں کھو گئی ہے آزاد جنس پرستی، شو بزنس اور فیشن کی دنیا کمرشل

کلچر، پاپ کلچر، اور جدید تہذیبی انارکی میں یہ عورت جو کبھی آئیڈیل تھی، ٹائپ بنی اور اب خود کو ماڈل میں کھوتی جا رہی ہے۔ آزادیٔ نسواں کا یہ تو مقدر نہیں تھا۔ "کاغذی ہے پیرہن" اگر کارواں کے دل میں یہ احساسِ زیاں بھی پیدا کردے تو بہت بڑا کام ہوگا۔

وارث علوی

# غبارِ کارواں

میں زار و قطار رو رہی تھی۔

کوئی کسی کو بڑی بے دردی سے مار رہا تھا۔ مارنے والا بہت دیوزاد تھا اور پٹنے والا منحنی سا کالا کلوٹا بچہ تھا۔ کون مار رہا تھا کسے اور کیوں مار رہا تھا۔ یہ قطعی یاد نہیں کیوں کہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مگر موٹا بینت جب پٹنے والے کی ہڈیوں پر بجتا تھا تو بڑی خوفناک چٹاخے دار آواز نکلتی تھی جو اب تک میرے کان میں محفوظ ہے اور اکثر سنائی دیتی ہے۔

شاید جب ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑا چھوٹے کو مارتا ہے۔ اور طاقتور کمزور کو مارتا ہے۔ طاقتور ایک قدِ آدم ستون کی طرح میرے لاشعور میں کھڑا ہو گیا جس کے پیروں تلے کمزور کیڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ تب میرا سر طاقتور کے حضور میں جھک گیا اور کمزور سے گھن آنے لگی۔

پھر بھی دل میں ایک چور تھا جو خود مجھ سے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب کبھی میں کسی عالیشان محل کو دیکھتی جس پر کائی جم جاتی اور گھاس بے رحمی سے چھا جاتی تو دل میں دبکا چور چپکے چپکے مسکرا اٹھتا اور گھاس پھونس کی بے بساط طاقت کا رعب میرے دل پر بیٹھ جاتا۔

ہم اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی۔ ایک کے بعد ایک۔ ہم ان کی کوکھ کو روندتے کچلتے چلے آئے تھے۔ اُلٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ کم عمری ہی میں پھیل کر چبوترہ ہو گئی تھیں پینتیس برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا در سزا جھیلنے لگیں۔ ہم بچے نوکروں کے رحم و کرم پر پلتے تھے اور ان سے بے طرح مانوس تھے۔

نوکروں کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک آقا کے سامنے دوسرا آقا کے پیچھے۔ سامنے وہ ہاتھ

پیر چومتے ہیں، پیٹھ پیچھے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ گھریلو نوکر سے زیادہ کوئی بدقسمت اور مجبور طبقہ نہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں بے کاری اور غربت نے ایک کثیر تعداد کو ایک محدود طبقے کا محکوم اور غلام بنا رکھا ہے۔ ہمارے ہاں چند ایسے نوکر تھے جو پشتہا پشت سے ہمارے ہی خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے، جسم کے ساتھ ان کا ذہن بھی غلام بن چکا تھا۔ یہ نوکر نہایت نکمے، غبی اور مکار تھے۔ تنگ آکر نکال دیے جاتے تو ادھر ادھر دھکّے کھا کر پھر کھونٹے پر لوٹ آتے۔ بالکل پالتو کتوں کی طرح سے۔ اب تو ملک ترقی کر گیا ہے اور کچھ بے کاری کم ہو گئی ہے اس لیے اب ایسے غلامانہ ذہنیت کے نوکر نہیں ملتے۔ اپنے بچپن میں میں نے نوکروں کی ایسی درگت دیکھی کہ مجھے آقا اور نوکر کے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔ میری بہت سی کہانیوں میں نوکروں کے کردار نظر آتے ہیں۔ کمزور و لاچار نوکر، جھوٹے، مکّار اور چالباز نوکر، میری کہانیاں نوکروں سے بھری پڑی ہیں۔ میری محدود دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتہ میں نظر آئی۔ اس نے مجھے متاثر کیا۔ جب باقی کی وسیع دنیا سے سابقہ پڑا تو پتہ چلا اونچ نیچ، ذات پات، صرف ڈھونگ ہے۔ اصل چیز امیری اور غریبی ہے یہ ایک رویّہ ہے۔ امیر خواہ کتنا ہی اللہ والا ہو اور قوم پرست ہو، غریب کے ساتھ نوکر جیسا برتاؤ کرتا ہے۔ لاڈ پیار کی کے فرصت تھی، نوکروں سے سیکھی ہوئی ہوشیاری ہی کارآمد ثابت ہوئی۔ جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کی ادھر ادھر ہاتھ مار کر حاصل کی۔

رونے اور گلا پھاڑ کر چلّانے میں ہم سب بہن بھائیوں کو خاصی مہارت حاصل تھی۔ ہماری اماں بوکھلا کر ہمارا کہنا ماننے پر مجبور ہو جاتیں۔ ہمیں اپنی اس طاقت کا شدت سے احساس تھا۔ بچّے رو پیٹ کر ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

ایک دن ایک مجلس میں پہلی بار مرثیوں اور نوحوں کا مطلب سمجھ میں آیا۔ اور جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا تو خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے بری طرح دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا۔ ماتم کرنے والی بیویاں ایک دم چپ ہو گئیں اور بڑی حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ سمجھیں شاید تبرک کے انتظار کی زحمتیں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں یا کہیں چوٹ چپیٹ آ گئی یا کسی کیڑے مکوڑے نے ڈس لیا۔

"کیوں مارا؟ حلق میں تیر کیوں مارا؟" میں نے حسبِ عادت مچل مچل کر پوچھا۔ کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے پاگل اور ضدی سمجھ کر مجلس سے بھگا دیا گیا۔ گھر واپس آکر فوراً بھائیوں نے میری شکایت کی کہ میں نے مجلس میں فیل مچائے۔ بدتمیزی کی اور سب کو شرمندہ کروایا۔

سخت ذلت سے نکالی گئی۔

"تیر کیوں مارا؟ ہاتھ میں مار دیا ہوتا بچارے کے حلق میں کیوں مارا؟" میں اپنی بات پر اڑی رہی۔

"اچھا بس بک بک بند کرو اور سو جاؤ" ڈانٹ پڑی۔

مگر میرے حصے کی نیند کہاں! جیسے ہی آنکھ بند کرتی سامنے بچے کے منھ میں چبھا ہوا تیر نظر آتا۔ میں پھر چیخیں مارنے لگتی۔

"لے غارت ہو بدنصیب، سو جا چڑیل نہیں تو گلا گھونٹ دوں گی؛ باری باری سب بڑوں نے مجھے قتل کر کے مجھ سے نجات پانے کی دھمکیاں دیں مگر میری سسکیاں نہ رکیں تب ڈر کے مارے میں شیخانی بوا کے پاس گھس گئی کیوں کہ اکیلے پلنگ پر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

"کیوں مارا تیر"؟ میں نے شیخانی بوا کی بغل میں سسک کر پوچھا۔

"اُو اَجید حرامی رہے" انھوں نے سمجھایا۔

"تو اس کے پاس بچے کو کیوں لے گئے؟"

"بچہ پیاسا رہے۔"

"تو اسے دودھ دیا ہوتا؟"

"دودھ ماں کا کھسک ہوئی گوا رہے۔"

"تو پانی ہی دے دیا ہوتا۔"

"پانی کہاں رہے؛ نہر پہ تو اد کی بھوج کا پہرہ رہے۔"

"کیوں؟"

"اب ای ہم کا جانیں۔ رہے کچھ گڑبڑ۔"

"پھر؟"

"بچہ کا پانی پیائے کھاطر نہر پہ لئے کے گئے۔ توں مار دہس تیر"

"حلق میں؟"

"ہاں"

اور میرے حلق میں بڑے بڑے کانٹوں دار گولے پھنسنے لگے۔

"تیر کی بچی نہ سوتی ہے نہ سونے دیتی ہے" میری اماں نے ایسے کس کس کے تھپڑ اور گھونسے

لگائے کہ سچ مچ میری کربلا کردی۔

برسوں گھر میں میرا اس واقعہ پر مذاق اڑتا رہا۔ جب کوئی مہمان آتا تو بھائی مجھے ذلیل کرنے کے لیے کہتے ۔

"یہ مجلس میں بھوں بھوں روئی تھی بنکالی گئی۔ پھر اماں نے اس کی خوب ٹھکائی کی میں شرم سے پانی پانی ہوجاتی۔ یہ میری زندگی کا پہلا اہم المیہ تھا اور برسوں اثر رہا۔ مجلسوں میں جاتے میرا دم نکلتا تھا، پھر حلق میں تیر مارنے کا ذکر ہوگا اور کانٹوں دار گولے میرے گلے میں اٹکیں گے۔ مجلس کا تقدس بھنگ ہوگا۔

ابھی چند سال ہوئے ہٹلر کے کارناموں کے بارے میں ایک فلم دیکھی۔ لاکھوں گلی سڑی لاشوں کو دیکھ کر میرے ضمیر میں علی اصغر کے حلق میں اٹکا ہوا تیر کھٹکنے لگا۔ ویت نام میں بارہ سال سے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ سب کہاں ہیں، کوئی روکتا کیوں نہیں۔ انسانیت کب تک یوں ہی بے بس تماشہ دیکھتی رہے گی۔ انسان نے انسان کا بظاہر گوشت کھانا بند کردیا ہے لیکن اس کی مومیائی بنا کر اب بھی ہضم کر رہا ہے۔ مجھے ایسی دنیا سے پیار نہیں، اس کے اصولوں سے گھن آتی ہے۔

ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ والد کافی روشن خیال تھے۔ بہت سے ہندو خاندانوں سے میل جول تھا یعنی ایک خاص طبقے کے ہندو مسلمان نہایت سلیقے سے گھلے ملے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے۔ ہم کافی چھوٹے تھے جب ہی احساس ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہیں۔ زبانی بھائی چارے کے پرچار کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی احتیاط کا احساس ہوتا تھا۔ اگر کوئی ہندو آئے تو گوشت دوشت کا نام نہ لیا جائے، ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھاتے وقت بھی خیال رکھا جائے کہ ان کی کوئی چیز نہ چھو جائے۔ سارا کھانا دوسرے لوکر لگائیں۔ ان کا کھانا پڑوس کا مہاراج لگائے۔ برتن بھی وہیں سے منگادیے جائیں۔ عجب گھٹن سی طاری ہوجاتی تھی۔ بے حد اونچی اونچی روشن خیالی کی باتیں ہورہی ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت اور جاں نثاری کے قصے دہرائے جارہے ہیں۔ انگریزوں کو مجرم ٹھہرایا جارہا ہے۔ ساتھ ساتھ سب بزرگ لرز رہے ہیں کہ کہیں بچے کہ چھٹے بل ہیں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ دھرم بھرشٹ ہوجائے۔

"کیا ہندو آرہے ہیں؟" پابندیاں لگتے دیکھ کر ہم لوگ بور ہوکر پوچھتے۔

"خبردار چاچاجی اور چاچی جی آ رہے ہیں۔ بدتمیزی کی تو کھال کھینچ کر بھوسا بھر دیا جائے گا۔"

اور ہم فوراً سمجھ جاتے کہ چاچا جان اور چچی جان نہیں آ رہے ہیں، جب وہ آتے ہیں تو سیخ کباب اور مرغ مسلم پکتا ہے۔ لوکی کا رائتہ اور دہی بڑے نہیں بنتے۔ یہ پکنے اور بننے کا فرق بھی بڑا دلچسپ ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے ان کی بیٹی سے میری دانت کاٹی روٹی تھی۔ ایک عمر تک بچوں پر چھوت کی پابندی لازمی نہیں سمجھی جاتی۔ سوشی ہمارے ہاں کھانا بھی کھا لیتی تھی۔ پھل، دال موٹ، بسکٹ میں اتنی چھوت نہیں ہوتی لیکن چوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ سوشی گوشت نہیں کھاتی۔ اس لیے اسے دھوکے سے کسی طرح گوشت کھلا کے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ حالاں کہ اسے پتہ نہیں چلتا تھا مگر ہمارا نہ جانے کون سا جذبہ تسلی پا جاتا تھا۔ ویسے دن بھر ایک دوسرے کے گھر میں گھسے رہتے تھے مگر بقرعید کے دن سوشی تالے میں بند کر دی جاتی تھی۔ بکرے احاطے کے پیچھے نپی کھڑی کر کے کاٹے جاتے۔ کئی دن تک گوشت بٹتا رہتا۔ ان دنوں ہمارے گھر سے لالہ جی سے ناطہ ٹوٹ جاتا۔ ان کے ہاں بھی جب کوئی تہوار ہوتا تو ہم پر پہرہ بٹھا دیا جاتا۔

لالہ جی کے ہاں بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جا رہا تھا۔ جنم اشٹمی تھی۔ ایک طرف کڑاہ چڑھ رہے تھے اور دھڑا دھڑ پکوان تلے جا رہے تھے۔ باہر ہم فقیروں کی طرح کھڑے حسرت سے تک رہے تھے۔ مٹھائیوں کی ہوش ربا خوشبو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سوشی ایسے موقعوں پر بڑی مذہبی بن جایا کرتی تھی۔ ویسے تو ہم دونوں بارہا ایک ہی امرود باری باری دانت سے کاٹ کر کھا چکے تھے مگر سب سے چھپ کر۔

"بھاگو یہاں سے" آتے جاتے لوگ ہمیں دھتکار جاتے۔ ہم پھر کھسک آتے۔ چھوٹے پیٹ کی پوریاں تلتے دیکھنے کا کس بچہ کو شوق نہیں ہوتا ہے۔

"اندر کیا ہے؟" میں نے سوشی سے پوچھا۔ سامنے کا کمرہ پھول پتوں سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اندر سے گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جی میں کھُد بُد ہو رہی تھی، ہائے اللہ اندر کون ہے۔

"وہاں بھگوان براجے ہیں۔" سوشی نے غرور سے گردن اکڑائی۔

"بھگوان" مجھے بے انتہا احساس کمتری ستانے لگا۔ ان کے بھگوان کیا مزے سے آتے جاتے

ہیں۔ایک ہمارے اللہ میاں ہیں نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں۔ نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ فقیروں کی صف سے کھسک کے میں برآمدے میں پہنچ گئی۔گھر کے کسی فرد کی نظر نہ پڑی میرے منہ پر میرا مذہب تو لکھا نہیں تھا۔ ادھر سے ایک دیوی جی آرتی کی تھالی لیے سب کے ماتھے پر چندن چاول چپکاتی آئیں۔میرے ماتھے پر بھی لگاتی گزر گئیں۔ میں نے فوراً ہتھیلی سے ٹیکہ چھٹانا چاہا پھر میری بدذاتی آڑے آگئی۔ سنتے تھے جہاں ٹیکہ لگے اتنا گوشت جہنم میں جاتا ہے۔ خیر میرے پاس گوشت کی فراوانی تھی اتنا سا گوشت چلا گیا جہنم میں تو کون سا ٹوٹا آجائے گا۔ نوکروں کی صحبت میں بڑی ہوشیاریاں آجاتی ہیں۔ ماتھے پر سرٹیفکٹ لیے میں مزے سے اس کمرے میں گھس گئی جہاں بھگوان براج رہے تھے۔

بچپن کی آنکھیں کیسے سہانے خوابوں کا جال بن لیتی ہیں۔گھی اور لوبان کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔بیچ کمرے میں ایک چاندی کا پلنا لٹک رہا تھا۔ریشم اور گوٹے کے تکیوں اور گدوں پر ایک روپہلی بچہ لیٹا جھول رہا تھا۔کیا نفیس اور باریک کام تھا۔ بال بال خوب صورتی سے تراشا گیا تھا گلے میں مالا سر پہ مور پنکھی کا مکٹ۔

اور صورت اس غضب کی بھولی۔آنکھیں جیسے بہکتے ہوئے دیئے میرے ننھے سے دل میں ماتا کی ہوک اٹھی بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہمک کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ضد کر رہا ہے مجھے گودی میں لے لو۔ ہولے سے میں نے بچے کا نرم گرم گال چھوا۔میرا رواں رواں مسکرا دیا۔میں نے بے اختیار اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

ایک دم جیسے طوفان پھٹ پڑا اور بچہ چیخ مار کر میری گود سے اچھل کر گر پڑا۔سوشی کی نانی ماں کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ہذیانی کیفیت طاری تھی جیسے میں نے روپہلی بچے کو چوم کر اس کے حلق میں تیر پیوست کر دیا ہو۔

چاچی جی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑا بھگاتی ہوئی لائیں اور دروازے سے باہر مجھے مری ہوئی چھپکلی کی طرح پھینک دیا۔فوراً میرے گھر شکایت پہنچی کہ میں چاندی کے بھگوان کی مورتی چرا رہی تھی۔اماں نے سر پیٹ لیا اور پھر مجھے بھی پیٹا۔ وہ تو کہو اپنے لالہ جی سے ایسے بھائی چارے والے مراسم تھے۔ اس سے بھی معمولی حادثوں پر آج کل آئے دن خون خرابے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے سمجھایا گیا کہ بُت پرستی گناہ ہے۔محمود غزنوی بت شکن تھا۔میری خاک سمجھ میں نہ آیا میرے دل میں اس وقت پرستش کا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا۔میں پوجا نہیں کر رہی تھی ایک بچے کو پیار

کر رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں لوگوں کو میری عاقبت سنوارنے کا خیال آگیا۔ میرے دل میں اسلام کی برتری کوٹ کوٹ کر بھری گئی۔ اسلام جو دنیا کے ہر مذہب سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ یہ بھائی بھائی کا نعرہ اپنی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پھر مسلمان ہے۔ بغدادی قاعدہ بھی شروع کروایا گیا۔ اور الف دوزبر اَن، الف دوزیر اِن، الف دو پیش اُن رٹتے وقت بڑی شدت سے نیند آنے لگتی۔ الفاظ کے ترنم میں لوری کا تاثر ہے اور جب ملانی جی کی قمچی پڑتی تو ساری نیند رفوچکر ہو جاتی۔ ملانی جی، چندھی، بہری اور بلا کی بد دماغ تھیں۔ سنا ہے ان کے مرحوم شوہر انھیں چارپائی سے باندھ کر بھیگی ہوئی رسی سے ان کی چمڑی ادھیڑا کرتے تھے۔ بڑھیا فی لفظ ایک دو تھپڑ رسید کرتی تھی۔ کوئی بیس یا بائیس بچوں کو پڑھاتی تھی اور سب کو مستقل چانٹے تھپڑ گھونسے مارتی تھی۔ سوکھی سوکھی انگلیوں سے میری موٹی موٹی رانوں میں ایسی چٹکیاں لیتی تھی اور ہاتھ نہیں ٹوٹتے تھے۔ ہم آیتیں پڑھ پڑھ کر اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ میں نے کبھی کسی انسان سے ایسی شدید نفرت نہیں کی جیسی اس بڑھیا سے کی۔ ساتھ ساتھ اس نے جو کچھ پڑھایا وہ بھی مجھے عذاب الٰہی معلوم ہوا۔

بچپن جیسے تیسے بیتا۔ یہ کبھی پتہ نہ چلا کہ لوگ بچپن کے بارے میں ایسے سہانے راگ کیوں الاپتے ہیں۔ بچپن نام ہے بہت سی مجبوریوں کا، محرومیوں کا۔ بڑے ہو کر ایک پوزیشن بنتی ہے جو ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ آٹھ بڑے بھائی بہنوں کی شفقتیں جھیلنے کے بعد بڑے ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب گھر میں چھوٹے بھانجے بھتیجے پیدا ہونے لگے تو اپنی بزرگی کا احساس نہایت تسلی بخش ثابت ہوا۔ مساوات کا فقدان امیر غریب کے معاملے میں ہی نہیں عورت اور مرد کے مقابلے میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ میرے والد تو روشن خیال تھے۔ اصولاً بھی لڑکوں سے لڑکیوں کے حقوق کا زیادہ خیال رکھتے تھے مگر وہی بات تھی جیسے ہندو مسلم بھائی بھائی، لڑکا لڑکی برابر۔ چند نعرے تھے جن کی لیپ پوت نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔

یہ میری خوش نصیبی یا بدنصیبی تھی کہ ہوش آیا تو باقی کی تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ کئی بھائیوں میں اکیلی لڑکی گھاٹے میں نہیں رہتی اور پھر ذرا بھی میری حق تلفی ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو فوراً ابا کے حضور میں مقدمہ پیش کر دیا جاتا۔ میری بہنیں نہایت سگھڑ تھیں۔ اردو فارسی قرآن شریف کے علاوہ کشیدہ کاری بنائی سلائی اور کھانے پکانے میں مشاق۔ میں نہایت پھوہڑ۔ پتہ مارنے کی عادت نہ دلچسپی۔ بھائیوں کی نقل میں پیڑوں پر چڑھنا، سائیکل دوڑانا، ہر جگہ مجھے اپنی

شکست کا احساس ہوتا۔ بھائیوں کے مقابلہ میں نہایت پھسڈی۔ انھیں بھی مجھ پر ترس کیوں آتا۔ میں ابا کی شہ پر ان کی برابری پر تلی ہوئی تھی۔ باری باری سب کو گھوڑے کی سواری کا موقع ملتا تھا۔ جہاں میں گھوڑے پہ بیٹھی اور بھائیوں نے بڑبڑایا۔ گلّی ڈنڈا کھیلتی تو پدتے پدتے بھوسنکل جاتا۔ فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتی تو سارے لِک میری چاند پر ہی پڑتے۔ بھائی میری اس ڈھٹائی سے سخت نالاں تھے۔ میری بڑی بہنوں کی شادی سے پہلے گھر پر حکومت چلتی تھی۔ گودام کی کنجی قبضہ میں رہتی تھی۔ کپڑے سیتی تھیں۔ اس لیے بھائی ان کے محکوم رہتے تھے۔ میں تو دردِ سری تھی۔

عظیم بھائی ہمیشہ کے بیمار ہی تھے میں لڑکی ہونے کی وجہ سے بھائیوں کے ساتھ نہ نبھا سکتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔ انھیں کچھ مجھ پر ترس آگیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ لڑکے تو بیل ہیں۔ تم بیل کیوں بنو۔ پڑھائی میں تم ان سے ٹکر لو۔ وہاں تم انھیں مار لوگی۔

پھر انھوں نے مجھے بڑی محنت سے پڑھانا شروع کیا۔ دو بار مجھے ڈبل پرموشن دلوایا اور ایک بار مجھ سے بڑے بھائی فیل ہوئے۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ مگر تین درجے آگے تھے۔ پھر ایک دن ہم دونوں جب ایک کلاس میں آگئے اور میں نے ان کا ہوم ورک کر کے ان کی مدد کرنی شروع کی تب میں ان سے بڑی ہوگئی۔ عظیم بیگ چغتائی کی شہ پا کر میں نے قرآن کا ترجمہ، حدیث اور مسلم ہسٹری پڑھی اور اپنے ابا کے بزرگ دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنی تازہ تازہ معلومات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ میری اماں دھک سے رہ گئیں اور حسبِ عادت جوتی سنبھالی، مگر ابا کی شہ پا کر میں نے اپنے والد کے معمر دوستوں کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا۔

میری اماں کو میری حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ میرے انجام کی انھیں سخت فکر تھی۔ یہ مردمار باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔ وہ اتنی گہرائی سے نہ ان باتوں کو سمجھتی تھیں اور نہ سمجھا سکتی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میری اماں کیوں ڈرتی تھیں۔ یہ مرد کی دنیا ہے، مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے۔ عورت ایک ٹکڑا ہے اس کی دنیا کا جسے اس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اسے موڈ کے مطابق پوجتا بھی ہے اور ٹھکراتا بھی ہے۔ عورت کو دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے نسوانی حربوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ صبر، ہوشیاری، دانش مندی، سلیقہ، جو مرد کو اس کا محتاج بنا دے۔ شروع ہی سے لڑکے کو محتاج بنانا کہ وہ اپنا بٹن ٹانکتے شرمائے۔ روٹی ٹھنڈی کے ڈوب مرے۔ آسان آسان چھوٹے چھوٹے کام جو نوکر کر سکتے ہیں، اپنے ہاتھ سے کرنا اس کی زیادتیوں کو سر جھکا کر سہنا کہ وہ شرمندہ ہو کر قدموں پر گر پڑے۔

مگر میں نے تو بھائیوں کے حلقہ میں زندگی گذاری تھی۔ ان کی حرص کی تھی اور ان سے سبقت لے جانے کی قسم کھائی تھی۔ یہ نسوانیت مجھے ڈھونگ لگتی تھی۔ مصلحت مجھے جھوٹ معلوم ہوتی تھی، صبر، بزدلی اور شکر مکاری۔ میں نے ہاتھ گھما کر کبھی ناک نہیں پکڑی۔ یہاں تک کہ بننا، سنورنا، سنگھار کرنا اور بھڑکیلے کپڑے پہننا بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے عیوب چھپا کر دھوکہ دے رہی ہوں۔

"کوئی لڑکا ایسی لڑکی پر جان نہیں دے گا" میری ہوشیار سہیلیوں نے سمجھایا۔ سہم کر میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی اور میرے بھائیوں کی بن آئی۔ تکلف تو رہا نہیں تھا جو الٹی سیدھی بات نہ کہتے۔ میں صاف گو تو وہ چار ہاتھ صاف گو۔ میرے پیچھے دھیری لگ گئی۔ لڑکے پھانسنے کو پھنکنیاں لگا رہی ہوں۔ بھلا پھر میری کیا مجال تھی جو سولہ سنگھار کر جاتی۔

اور تجربے سے مجھے معلوم ہوا کہ سولہ یا بتیس سنگھار قطعی ضروری نہیں۔ مجھے دوستوں کی کبھی کمی محسوس نہ ہوئی، یہی دوستیاں اکثر عشق کی حدوں کو چھوگئیں۔ روس میں جب میں ایسی لڑکیوں سے ملی جو مصنوعات میں قطعی دلچسپی نہیں لیتیں۔ اور نہایت سیدھے سادھے کام چلاؤ کپڑے پہنتی ہیں تو میں نے ان سے پوچھا وہ سنگھار کیوں نہیں کرتیں۔

"ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیوں کیا میں بری لگتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں، مگر اور زیادہ اچھی لگوگی۔"

"میں کھرا مال پیش کرنے کی قائل ہوں۔ میری اپنی جلد، اپنے ہونٹ، میری نسوانیت ہی کافی ہے۔" اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

یورپ میں بھی نوجوان طبقہ مصنوعات سے بور ہو چکا ہے۔ عورت اور مرد کے ازلی رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے مرد کا مرد اور عورت کا عورت ہونا کافی ہے۔ مجھے روسی لڑکیوں نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی اقتصادی محکومی اور مجبوری کا ہمیشہ رونا رویا ہے ایک لڑکی اگر اپنے وارثوں کا صرف اس لیے حکم مانتی ہے کہ اقتصادی طور پر مجبور ہے تو فرماں بردار نہیں دھوکہ باز ضرور ہو سکتی ہے۔ ایک بیوی شوہر سے صرف اس لیے چپکی رہتی ہے کہ روٹی کپڑے کا سہارا ہے تو وہ طوائف سے کم مجبور نہیں۔ ایسی مجبور عورت کی کوکھ سے مجبور اور محکوم ذہنیت انسان ہی جنم لے سکیں گے۔ ہمیشہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کے رحم و کرم پر اکتفا کریں گے۔ جب تک ہمارے ملک کی عورت مجبور لاچار ظلم سہتی رہے گی، ہم اقتصادی اور سیاسی میدان میں احساس کمتری کا شکار

بے رہیں گے ۔

رشید جہاں نے مجھے کم سنی ہی میں بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے ان سے صاف گوئی اور خودداری سیکھنے کی کوشش کی ۔

بچپن میں میری ایک اور بڑی پیاری سہیلی تھی۔ ہمارے کوچوان کی بیٹی منگو تھوڑی سی مجھ سے بڑی تھی اور بڑا رعب گانٹھا کرتی تھی۔ تیرہ چودہ برس کی تھی کہ شادی ہو کر لکھنؤ چلی گئی۔ جب اپنی پہلی بیٹی لے کر آئی تو بڑی بجھی بجھی سی ہو گئی تھی۔ سارا کھلنڈراپن غائب، ہنسی گم۔ لڑکی جننے کے جرم میں اس کی ساس اسے بہت مارتی تھی اور اس کے میاں سے بھی پٹواتی تھی ۔

جب وہ تیسری بیٹی لے کر آئی تو ابا پنشن لے کر آگرہ آ گئے تھے۔ آگرے کی گھٹی فضا میں مجھے عورت کی بے کسی کا تجربہ ہوا۔ پاس پڑوس کی سبھی عورتیں مدقوق مرجھائی اور شوہروں اور ساس نندوں کی ستائی ہوئی تھیں۔ تعویذ، گنڈوں اور جان توڑ خدمت کے بل بوتے پر ٹکی ہوئی تھیں مجھے اپنے عورت پنے سے اور بھی گھن آ گئی ۔

منگو بھی دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ ساس دوسری بہو لانے کے پلان بنا رہی تھی۔ جو بیٹا جن سکے۔ منگو کے ماں باپ رو پیٹ رہے تھے۔ منگو اور اس کی تین بیٹیوں کے بوجھ کے خیال سے کانپ رہے تھے۔ منگو کی تین روتی بھنکتی لڑکیاں عورت ذات کی نا اہلی کا کھلا اشتہار تھیں۔ مجھے خدا کی اس ناانصافی پر غصہ آتا تھا کہ اس نے مجھے بھی لڑکی بنایا تھا۔ میں گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتی تھی کہ اللہ پاک کسی طرح مجھے لڑکا بنا دے ۔

ابا نے لکھنؤ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ منگو کے میاں پر زور ڈلوایا کہ وہ اسے بلالے اور اگر اس پر سوت لایا تو ہتھکڑیاں ڈلوا دی جائیں گی۔ سال بھر بعد جو منگو آئی تو پہچان نہ پڑتی تھی۔ لڑکا بھی نہیں جنا تھا پھر بھی چکنی چپڑی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا منگو پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا تھا۔ نہایت خطرناک قسم کے مرکھنے بھوت ؛ جو منگو کے جسم میں سما کر اسے ورغلاتے تھے اور وہ اپنی ساس کی ٹھکائی کرتی۔ میاں تک کی پنڈلی میں ایک دن کاٹ کھایا۔ سب پر اس کی دہشت بیٹھ گئی۔ بھوت اتارنے والے آئے انھوں نے کہا کہ ساس منحوس ہے اگر بہو اس کے ساتھ رہی تو سات بیٹیاں جنے گی اور سارے کنبے کا ناس ہو جائے گا۔ ساس بے چاری کا پتا ہو گیا۔ منگو کا میاں اسے اپنی نئی نوکری پر ڈالی گنج لے گیا۔ وہاں وہ صاحب لوگوں کے گھوڑوں پر لگ گیا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منگو جاہل اور ان پڑھ تھی بالکل احمق نہ تھی۔ اپنی بساط بھر جو کچھ کر سکتی تھی کر ڈالا۔

عورت کمزور ہوسکتی ہے ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے کچھ احساسِ کمتری نکل گیا۔ لڑکا ہونا ضروری نہیں، لڑکوں جیسی عقل اور سوجھ بوجھ چاہیئے۔ پھر تو میں نے سینا پرونا اور سگھڑاپا دھرا طاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

مذہب ہماری جانوں پر کبھی صرف جنت کی لالچ اور جہنم کا خوف بن کر لاگو نہیں کیا گیا۔ ابا کے دوست ہر خیال اور عقیدے کے تھے۔ ان کی باتیں سن کر بہت سے وہم اور وسوسے دل سے دور ہو گئے۔ ہر انسان اپنی قبر میں جائے گا، اپنے خدا سے خود بھگتے گا۔ دنیا کا بھی کوئی خاص خوف نہ تھا۔ مغل ویسے ہی سرپھرے اور جھکی ہوتے ہیں اور ہمارا خاندان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ وہیں ساری دنیا سمٹی نظر آتی تھی۔ ہر شخص اپنی چمڑی میں مگن اور خود مختار۔

لڑکوں کے لیے یہ عام رویہ مناسب سمجھا جاتا ہے۔ میں لڑکی تھی۔ اماں، خالائیں، پھوپھیاں، چچیاں ہیبت زدہ تھیں۔ عورت ذات کو یہ منہ زوریاں زیب نہیں دیتیں۔ سسرال میں کیسے گذر ہوگی۔ سماج نے عورت کا ایک ٹھکانا مقرر کردیا ہے۔ اس سے باہر قدم رکھا تو پیر چھانٹ دیے جائیں گے۔ زیادہ تعلیم بھی بلائے جان ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں قول و فعل پر پابندی نہیں تھی۔ مگر یہ شرط صرف مردوں تک تھی۔ مجھے ان حرکتوں پر ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ پتہ نہیں عظیم بھائی کو کیا مزہ آتا تھا۔ وہ مجھے اور شہ دیتے تھے۔ شام دفتر سے آکر اب بھی وہ مجھ سے گھنٹہ دو گھنٹہ ادھر اودھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بقول کسے مجھے بھڑکایا کرتے تھے۔ انھوں نے سنجیدہ و خشک مضامین چھوڑ کر کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ جو کام وہ سنجیدہ مضامین سے نہ کرپائے ان کہانیوں نے کر دکھایا۔ ان کی ہیروئن ایک نہایت شریر اور دلچسپ لڑکی کی مثالی صورت اختیار کرگئی۔ ان سے میں نے سیکھا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو کہانیوں قصوں میں لپیٹ کر کہو، کم گالیاں ملیں گی۔ زیادہ لوگ پڑھیں گے اور متاثر ہوں گے۔ کہانیاں لکھنے سے پہلے میں نے کئی مضامین لکھے جو چھپے بھی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ دو چار ہی کہانیاں لکھی تھیں کہ لے دے شروع ہوگئی۔ جیسے ٹیلی فون پر آپ جو چاہیں کہہ دیجیے، کوئی تھپڑ نہیں مار سکتا۔ ویسے ہی کہانیوں میں کچھ بھی لکھ ماریئے کوئی ہاتھ آپ کے گلے تک نہیں پہنچے گا۔ دوسرے مجھے شروع میں لوگوں کے ردعمل کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف ساقی میں لکھتی تھی۔ ان کے پاس جو خط میرے نام آتے تھے وہ انھیں ضائع کردیتے تھے۔ بد قسمتی سے 'لحاف'، وہ پہلی کہانی تھی جو عین شادی کے بعد چھپی اور شاہد احمد صاحب نے اب مجھے ذمہ دار سمجھ کر سارے خطوط حفاظت سے میرے سپرد کردیے۔ ان خطوں کا لہجہ اتنا بھیانک تھا کہ پہلے تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے سہم کر اپنے قلم

کی لگام کھینچی اور اپنی دانست میں تو میں نے اس کے بعد ڈھیل نہیں چھوڑی لیکن برا ہو اس ماحول کا جہاں میں نے پرورش پائی۔ دھڑتے سے بات کہنے کی عادت نہیں چھوٹی اور لوگ جھلاکر گالیوں پر اتارو ہو جاتے ہیں تو مجھے ان سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا۔ بہت سی مارپیٹ نوچ کھسوٹ کے بعد پھر مل بیٹھنے کی عادت رہی۔ کبھی چٹکی لینے میں مزہ آتا ہے، اگر کوئی پلٹ کر پتھر دے مارے تو اس سے بغض نہیں پیدا ہوتا۔

زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ ملا ہے، اپنی زیادہ تر الجھنوں کا جواب ان میں ہی ڈھونڈا اور پایا ہے۔ کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں، تاریکیاں ان ہی دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گناؤں۔ ہارڈی براونٹی سسٹرز سے شروع کرکے برنارڈ شا تک پہنچی۔ مگر روسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا کہ جب عقل و ہوش کو کسی راہبر کی تلاش تھی تب ان کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولٹیکل، فلاسفی، خشک مضمون رہی اور روسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہو گیا۔ چیخوف کو تو میں آج بھی برکت کے لیے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں نہیں آتی پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش کے لیے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی ہیں، اور قلم چل نکلتا ہے۔

پڑھنے کے بعد باتوں کا نمبر آتا ہے۔ ہمارا خاندان نہایت بکو ہے جب دو چار مل بیٹھتے ہیں تو بس ہوش ہی نہیں رہتا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے بس بکے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب مجبوراً غسل کرتے جا رہے ہیں، مباحثہ میں حصہ لیتے جا رہے ہیں، تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے سر نکالتے ہیں، صابن ملتے جاتے ہیں اور باتوں کا سلسلہ چلائے ہوئے ہیں۔ مجھے ہر انسان سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ دکانداروں سے، سودا سلف والوں سے، ٹیکسی والوں سے، یہاں تک کہ بھیک مانگنے والوں سے۔ بڑھیوں بڈھوں کو چھیڑ کر ان کی ملامتیں گالیاں سننے میں بھی عجب لطف آتا ہے تعلیم یافتہ عالم فاضل ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ نہایت جاہل اور سیدھے سادھے انسانوں سے بات کرکے بعض وقت دماغ میں کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ انسان کو پہچاننے کے لیے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بات کرنے کی اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ میں پوری زندگی کا خلاصہ ہاتھ آجاتا ہے۔ بس چند نہایت سیدھے مختصر سے سوال پوچھ لیجئے۔ ملاقات بھرپور طریقہ پر ہو جائے گی۔

باتیں کرنا دلچسپ ترین مشغلہ ہے صفیہ جاں نثار سے تو اس کی مختصری زندگی میں اتنی باتیں ہوئیں کہ اوروں سے برسوں مل کر بھی نہ ہو پائیں، منٹو سے باتیں کر کے احساسات پر دھار آجاتی تھی۔ چھ چھ سات سات گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے تھے۔ اس کی بیوی صفیہ بھی ایک باتونی عورت ہے۔ سلطانہ جعفری سے تو بس گپیں ہوتی ہیں۔ سردار جعفری سے کج بحثی اور جملہ بازی میں مزہ آتا ہے۔ جن لوگوں نے سردار سے بات کی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ جتنی تلخی ترشی اور کاٹ اس شخص کی زبان میں ہے اتنی ہی نرمی اور مٹھاس بھی ہے۔ جلانے پر آئے تو بھون کے رکھ دے۔ ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں جس کی شامت آجاتی، سردار اسے رلا کے ہی دم لیتے۔ بس چونکھی چوٹوں پر چوٹیں۔ جب سے بیمار ہوئے ہیں محفلیں کچھ بجھی بجھی محتاط سی ہوگئی ہیں۔ قدسیہ زیدی سے باتیں کر کے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اب ان کی بیٹی شمع سے باتیں کرتی ہوں تو ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سلمیٰ صدیقی سے بس دو باتیں کر لو کام دہن معطر ہو جائے گا۔ عینی انتہائی بکی واقع ہوئی ہیں۔ نہایت سرپٹ بولتی ہیں جیسے بولنے کو بہت ہے اور وقت بھاگا جارہا ہے۔

مگر صاحب باتوں کے معاملے میں میری ماموں زاد بہنوں اختر اور جمیلہ کا کوئی جواب نہیں ان کے مقابلے میں عام طور پر لوگ گونگے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے میری اپنی زبان پر سے سارا رنگ کھرچ گیا۔ آپ ہی آپ جملے ہونٹوں پر سے پھسلنے لگتے ہیں۔ ٹوٹے ادھورے کٹے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور ان کی زبان میں اپنی ننھیال کے ناطے دلی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب لٹکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے ان ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں پڑھیے۔

بکواس کرنے کے بعد لکھنے کی باری آتی ہے۔ فارسی ہمارے خاندان کی مادری زبان سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے تایا فارسی کی حمایت میں اکیلے سپاہی کی طرح ہمیشہ دیوار یا کھوں سے لڑتے رہے۔ اپنے بیٹوں کو انھوں نے انگریزی تعلیم قطعی نہیں دی۔ فرفر فارسی بولتے پڑھتے اور لکھتے تھے مگر کسی نوکری میں نہیں کھپے۔ تلاش مرے پھر بھی انھیں ضد تھی کہ سب بھتیجوں کو بھی فارسی ہی پڑھائی جائے۔ ہمارے ابا جو ان کی ہر بات پر صاد کر دیتے تھے اس بات پر اڑ گئے۔ لڑکوں کو نہیں ہاں لڑکیوں کو فارسی پڑھایئے کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب بڑی تین بہنیں فارسی پڑھ کر بیاہی جا چکی تھیں۔ تختہ مشق بننے کے لیے خاکسار ہاتھ آئی۔ بھائیوں نے اس فیصلے پر اپنی برتری مانی اور مجھے مدفاضل قرار دے کر اتنا چڑایا کہ فارسی میری چڑھ ہوگئی مگر تایا ابا کو سوائے نماز پڑھنے کے اور مجھے فارسی پڑھانے کے کوئی کام نہ تھا۔ لہٰذا وہ جیتے اور میں ہاری۔ "پڑھو فارسی بیچو تیل"، بھائی

جلے پر تیل چھڑکتے اور میں آنسو بہاتی جاتی، فارسی رٹتی جاتی۔ جونہی میرا بس چلا میں نے فارسی سے بغاوت کر دی، مگر جب تک تایا ابا اتنی پڑھا چکے تھے کہ بعد میں اپنے شوق سے جب قدیم اور جدید فارسی ادب پر طائرانہ نظر ڈالنے کا موقع ملا تو زبان مانوس معلوم ہوئی اس وقت تایا ابا کا انتقال ہو چکا تھا اور میں ان کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔ پھر بھی انجانے طور پر مجھے فارسی الفاظ کے استعمال میں تکلّف ہوتا تھا۔ دوسرے جو زبان گھر میں بولی جاتی تھی اتنی سرپٹ تھی کہ کہانیاں لکھتے وقت کبھی رک کر سوچنے کی قباحت نہیں ہوئی۔ انسان اپنے ہر خیال کا اظہار روزمرہ کی بولی میں کر سکتا ہے تب میری زبان ہندی سے زیادہ قریب تھی کیوں کہ ہندی جب اتنی گاڑھی نہیں ہوئی تھی۔ نہایت رواں اور میٹھی زبان تھی جو اب دلی آگرہ کی عورتوں کے لبوں پر زندہ رہ گئی ہے۔

لکھنے میں میں نے ہمیشہ پڑھنے جیسا لطف محسوس کیا۔ میں نے اپنی زندگی کے نہایت دلچسپ اور نہایت ہی کٹھن لمحے لکھنے کے سہارے جھیلے ہیں۔ کتنے بوجھ اتارے ہیں اور کتنے چڑھائے ہیں۔ یہ قلم میرا رزّاق بھی ہے اور ہمدم، ہمراز بھی۔ تنہائی کا بولتا چالتا دوست بھی۔ اس کی موجودگی میں میں نے کبھی اکیلاپن محسوس نہیں کیا، میں جب چاہوں اس اڑن کھٹولے کے ذریعے سے جسے چاہوں بلالوں۔ اور جب وہ آجائیں تو جو جی چاہے ان سے کہوں، ہنساؤں، رلاؤں یا جی جلا کر خاک کر دوں پھر موڈ آجائے تو پرزہ پرزہ کر کے فنا کر دوں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح پتلے بنا کر جیسے چاہوں نچاؤں۔ اس وقت مجھے ایک خالق کی سی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ بتانے لگوں کہ مجھے کس نے متاثر نہیں کیا تو آسان ہوگا۔ زندگی میں جس سے بھی واسطہ پڑا اس نے اپنا نقش دماغ پر چھوڑا۔ عظیم بھائی کے بعد میرے دوست، سہیلیاں، استاد اور راہ چلتے ملنے والے۔ ڈاکٹر اشرف نے کتنے ہی سوالوں کو سلجھایا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بکھرے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک سلسلہ قائم کرنے میں سہارا دیا۔ کرشن چندر کی کہانیوں میں عجیب عجیب نازک پتھروں سے ملاقات ہوئی۔

فضل الرحمٰن پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تو جب بھی ملتی ہوں انھیں ڈکشنری کی طرح استعمال کرتی ہوں۔ کسی بھی ڈرامہ یا شعر کا حوالہ دیجئے، پھر وہ سناتے چلے جائیں گے۔ انھوں نے انجانے طور پر مجھے بہت پڑھایا ہے۔ شاہد لطیف سے شوہر کے علاوہ ایک اور رشتہ تھا جب دوستی کے موڈ میں آجاتے تھے تو بہت گھُٹتی تھی۔ گو شادی دوستی کی موت ہے مگر ہماری

دوستی نے بڑی ڈھٹائی سے ساتھ دیا۔میری تمام ناولوں و کہانیوں پر وہ نظر ثانی کیا کرتے تھے۔ کبھی انھیں بتانے کی توفیق نہیں ہوئی۔مگر ان سے چھپا کر میں ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتی تھی۔پکڑ لیتے تھے تو بہت رعب گانٹھتے تھے۔

بچوں کی ناول تین اناڑی میں میں نے اپنے تین بھتیجوں کو بجنسہ اٹھا کر رکھ دیا ہے اگر اسے ان کی سوانح عمری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

علی گڑھ میں ہمارے خاندانی دھوبی نتھارام میرے خاصے گہرے دوست ہیں جب جاتی ہوں خود کپڑے لینے آتے ہیں، گھنٹوں اکڑوں بیٹھے گپیں مارا کرتے ہیں۔میں نے انکی زبان سے وہ کہانیاں سنی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔زیادہ تر اپنی لرزتی ہوئی بوڑھی آواز میں کتھائیں گا کر سناتے ہیں۔چاندی کی انگوٹھی والی انگلی سے چوکھٹ پر تال دیتے جاتے ہیں۔ منکارے سے میوزک پیس بھی لگاتے جاتے ہیں۔ان کے گرو ایک سقہ ہیں جو بہت گیانی ہیں۔ بیچ بیچ میں گرو کے اقوال دہراتے جاتے ہیں۔آلہا اودل بڑی دھوم سے سناتے ہیں۔پانچ روپیہ فیس اور ایک روپیہ ——— آنے جانے کا رکشا کا کرایہ وصول کر کے چار پانچ گھنٹے سنا جاتے ہیں۔پوچھو تو ٹھیٹ برج بھاشا میں تشریح بھی کر دیتے ہیں۔میں نے ان کے طبقہ کی زبان ان ہی سے سیکھی ہے۔

کالج میں مختلف مذاہب کے بارے میں ڈاکٹر ٹکر کی کلاس میں لیکچر سننے کے بعد ان کی رہنمائی میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔مذہب کے بارے میں جو کچھ جالے دماغ پر تن گئے تھے صاف ہو گئے۔بدھ مذہب نے بے حد متاثر کیا۔بی اے کرنے کے بعد جائیداد کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن آگرہ جانے کا اتفاق ہوا معلوم ہوا دوسرے دن سوشی میری بچپن کی گوئیاں کی شادی ہے۔سارے گھر کا بلاوا آیا ہے۔مجھے تعجب ہوا لالہ جی جیسے تنگ خیال کٹر انسان سے میرے بھائی کا لین دین کیسے قائم ہے۔میں خود تو تمام بندھن توڑ کر ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں انسانیت ہی واحد خدارہ جاتا ہے، میرا اور سوشی کا کیا جوڑ۔سوشی فراڈ ہے جس سے ماں باپ نے پلے باندھنے کا فیصلہ کرلیا، اسی کو خدائے مجازی بنانے کو تیار ہوگئی۔مجھے وہ جنم اشٹمی والا دن یاد تھا گو اس کے بعد آگرہ چھوٹ چکا تھا اور ہم لوگ علی گڑھ چلے آئے تھے۔لالہ جی کو پتہ چلا تو جھٹ سے چھوٹے بیٹے سریش کو بھیجا۔میں نے ٹالنا چاہا۔

"شام کو آؤں گی۔"

"دیدی کہتی ہے بس دو گھڑی کو آجاؤ۔ پھر رسمیں شروع ہو جائیں گی تو بات نہ ہوسکے گی۔"
سرش پیچھے پڑ گیا۔

میں گئی تو سوشی ہلدی لگائے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں ایک دن بھگوان کرشن کا جھولا سجایا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے بیک بینی اور دو گوش نکالا گیا تھا۔ جی چاہا الٹے قدم واپس چلی آؤں مگر مجھے دیکھ کر وہ لپکی۔

"کیسی ہے ری چُنّی" اس نے میرا پیار کا نام لے کر پکارا۔ بچپن کے ساتھ یہ نام بھی کہیں دور چھوڑ آئی تھی عجیب سا لگا، جیسے وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر گھسیٹا اور کنڈی چڑھا دی۔ باہر نانی ماں بڑبڑا رہی تھی۔

"ایسے سمے ہر کوئی کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ دیر تک بھری بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری جھوٹی پرتکلف مسکراہٹ سے اس نے دھوکا نہیں کھایا۔ اس نے شرارت سے مسکراہٹ دبا کر دیکھا، جیسے روٹھے ہوئے بچے کو دیکھتے ہیں۔

"ہائے رام کتنی لمبی تاڑ کی تاڑ ہو گئی" پھر بھی دیوار میں کوئی شگاف نہ ملا تو اس نے الماری کھولی اور مٹھائی کی تھالی نکالی۔ میں لڈو ہاتھ میں لینے لگی کہ باہر جا کر کوڑے پر پھینک دوں گی۔ جو ہم سے چھوت کرے ہم اس کا چھوا کیوں کھائیں۔

"اُہنک، منہ کھول۔"

میں نے مجبوراً ذرا سا لڈو کتر لیا۔ باقی کا بچا ہوا لڈو سوشی نے منہ میں ڈال لیا۔ تو وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

دیوار نے باہیں کھول دیں۔ دیر تک ہم سر جوڑے بچپن کی سہاونی حماقتوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ چلتے سمے سوشی نے ایک ننھا سا پیتل کا گھٹنوں چلتا بھگوان کرشن کا مجسمہ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"لے چڑیل! اب تو تیرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔"

میں مسلمان ہوں، بت پرستی شرک ہے۔ مگر دیو مالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔ اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ ایمان علیحدہ ہے، وطن کی تہذیب علیحدہ ہے۔ اس میں میرا برابر کا حصہ ہے جیسے اس کی مٹی دھوپ اور پانی میں میرا حصہ ہے۔ میں ہولی پر رنگ کھیلوں دیوالی

پر دیئے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ میرا یقین اور شعور کیا اتنا بودا ہے، اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

اور میں نے تو پرتش کی حدیں پار کریں۔

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ کھلی آنکھیں۔ کھلے کان کیا کیا دیکھتے سنتے ہیں۔ دماغ میں ایک نکتہ سالگ جاتا ہے۔ یہ نکتے جڑ کر الفاظ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ الفاظ سے عبارت کی لڑی بنتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نکتے کے موتی کی جگہ زخم لگتا ہے۔ زخم سے زخم جڑ کر لفظ نہیں بنتا، عبارت کی لڑی نہیں سنورتی، ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جب ہندو مسلم فساد کی ملک کے کسی حصے سے خبریں آتی ہیں تو میرا قلم میرا منہ چڑھاتا ہے۔ اور سوئی کا کھلایا ہوا لڈو حلق میں زہریلا کانٹوں دار گولہ بن کر پھنسنے لگتا ہے۔ تب میں الماری میں رکھے ہوئے بال کرشن سے پوچھتی ہوں۔

کیا تم واقعی کسی منچلے شاعر کا خواب ہو؟ کیا تم نے میری جنم بھومی پر ہی جنم نہیں لیا بس ایک وہم ایک آرزو سے زیادہ تمہاری حقیقت نہیں۔ کسی مجبور اور بندھنوں میں جکڑی ہوئی ابلا کے تخیل کی پرواز ہو کہ تمہیں رچنے کے بعد اس نے زندگی کا زہر ہنس ہنس کے پی لیا۔

کیا تم اس دھرتی کے حلق میں اٹکا ہوا تیر نہیں نکال سکتے؟

مگر پیتل کا بھگوان میری حماقت پر ہنس بھی نہیں سکتا کہ وہ دھات کے خول میں منجمد ہو چکا ہے۔ سیاست کہ دنیا کا سب سے منافع بخش پیشہ ہے دنیا کا خدا ہے۔ سیاست کے میدان میں کھائی ہوئی مات کے سیاہ دھبے معصوموں کے خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نااہلی ثابت کرنے کے لیے انسانوں کو کتوں کی طرح لڑایا جاتا ہے۔

کیا ایک دن پیتل کا یہ خول توڑ کر خدا باہر نکل آئے گا؟

# ان بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن
بے محبّت ریاکار سیجوں پہ سج سج
کے اکتا گئے ہیں
فیض احمد فیضؔ

شام کے چار بجے ہوں گے یا شاید ساڑھے چار کہ بڑے زور سے گھنٹی بجی۔ نوکر نے دروازہ کھولا اور ہیبت زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔

"کون ہے ؟"

"پولیس!" محلّے میں کہیں چوری ہو نوکری نے سوے جاتے ہیں۔

"پولیس؟" شاہد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"جی ہاں!" نوکر تھر تھر کانپ رہا تھا: مگر صاب میں نے کچھ نہیں کیا قسم سے صاب۔"

"کیا قصہ ہے؟" شاہد نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"سمن ہے۔"

"سمن؟ مگر... خیر لائیے۔"

"سوری آپ کو نہیں دے سکتے۔"

"مگر... کیسا سمن... اور کس کا سمن؟"

"عصمت چغتائی کے نام! انھیں بلائیے۔" نوکر کی جان میں جان آئی۔

"مگر یہ تو بتائیے..."

"آپ ان کو بلائیے۔ لاہور سے سمن آیا ہے۔"

میں یما اپنی دو مہینہ کی بچی کا دودھ بنا کر بوتل کو ٹھنڈا کر رہی تھی۔ "لاہور سے سمن؟" میں نے بوتل ٹھنڈے پانی میں ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی لاہور سے آیا ہے" شاہد جھنجلا گئے۔
میں ہاتھ میں بوتل لیے ننگے پیر نکل آئی۔
"ارے بھئی کیسا سمن ہے؟"
"پڑھ لیجئے" پولیس انسپکٹر نے رکھائی سے کہا۔
اور سمن کی سرخی پڑھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی لکھا تھا: Ismat Chugtai Vs. The Crown
"ارے یہ بادشاہ سلامت کو مجھ سے کیا شکایت ہو گئی جو مقدمہ ٹھونک دیا؟"
"مذاق نہ کیجئے" انسپکٹر صاحب سختی سے بولے "پڑھ کر دستخط کر دیجئے"
میں نے سمن آگے پڑھا بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا میری کہانی "لحاف" پر فحاشی کے الزام میں سرکار نے مقدمہ چلا دیا ہے اور مجھے جنوری میں لاہور ہائی کورٹ میں حاضر ہونا ہے۔ دوسری صورت یعنی میری غیر حاضری پر سخت کارروائی کی جائے گی۔
"بھئی میں نہیں لیتی سمن" میں نے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ اور دودھ کی بوتل ہلانے لگی۔
"مہربانی کر کے واپس لے جائیے"
"آپ کو لینا پڑے گا"
"کیوں؟" میں حسب عادت بحث کرنے لگی۔
"ارے بھئی کیا قصہ ہے" محسن عبداللہ نے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا۔ وہ گرد میں اٹے ہوئے نہ جانے کہاں سے خاک چھان کر آ رہے تھے۔
"دیکھو یہ لوگ مجھے زبردستی سمن دے رہے ہیں میں کیوں لوں؟" محسن نے وکالت پڑھی تھی اور اوّل نمبر پاس ہوئے تھے۔
"ہوں" انھوں نے سمن پڑھ کر کہا "کون سی کہانی ہے؟"
"بھئی ہے ایک کمبخت کہانی جان کی مصیبت ہو گئی ہے"
"سمن تمھیں لینا پڑے گا"
"کیوں؟"
"پھر وہی کٹھ حجتی" شاہد بھڑک اٹھے۔
"میں ہرگز نہیں لوں گی"
"نہیں لوگی تو... تمھیں گرفتار کر لیا جائے گا" محسن غرائے۔

"کر لیجئے دو گرفتار مگر میں ضمانت نہیں لوں گی۔"

"جیل میں بند کر دی جاؤ گی۔"

"جیل میں؟ ارے مجھے جیل دیکھنے کا بہت شوق ہے کتنی دفعہ یوسف سے کہہ چکی ہوں مجھے جیل لے چلو مگر ہنستا ہے کمبخت اور ٹال جاتا ہے! انسپکٹر صاحب مجھے جیل لے چلیے آپ ہتھکڑیاں لائے ہیں۔" میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

انسپکٹر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ غصہ ضبط کر کے بولے۔

"مذاق مت کیجئے، دستخط کیجئے۔"

اور پھر شاہد اور محسن پھٹ پڑے، میں بالکل مذاق کے موڈ میں ہنس ہنس کر بکے جا رہی تھی۔ ابا میاں جب سانبھر میں جج تھے تو کچہری بالکل گھر کے مردانے حصہ میں لگتی تھی۔ ہم لوگ کھڑکی سے چور ڈاکوؤں کو ہتھکڑیوں، بیڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بڑے خطرناک ڈاکو پکڑے گئے ان کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت طرحدار نوجوان عورت بھی تھی۔ باقاعدہ برجس اور کوٹ پہنے شکرے جیسی آنکھیں، چیتے جیسی کمر اور لمبے سیاہ بال میرے اوپر اس کا بہت رعب پڑا تھا۔

شاہد اور محسن نے بوکھلا دیا۔ میں نے قلم انسپکٹر صاحب کو پکڑانی چاہی تاکہ دستخط کر سکوں۔ مگر وہ ایسے بدکے جیسے میں نے ان کی طرف پستول کی نال بڑھا دی ہو۔ جلدی سے محسن نے قلم مجھ سے چھین لی اور میں نے دستخط کر دیے۔

"آپ تھانہ چل کر ضمانت دیجیے۔ پانچ سو کی ضمانت۔"

"میرے پاس اس وقت تو پانچ سو نہیں۔"

"آپ کو نہیں، کسی اور صاحب کو آپ کی ضمانت دینی پڑے گی۔"

"میں کسی کو پھنسانا نہیں چاہتی۔ اگر میں نہیں گئی تو ضمانت ضبط ہو جائے گی۔" میں نے اپنی معلومات کا رعب ڈالا۔ "آپ مجھے گرفتار کر لیجیے۔"

اب کے انسپکٹر صاحب کو غصہ نہیں آیا۔ انھوں نے مسکرا کر شاہد کی طرف دیکھا جو صوفے پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اور مجھ سے بڑی نرمی سے کہا۔

"چلیے بھی۔ ذرا سی دیر کی بات ہے۔"

"مگر ضمانت!" میں نے نرم ہو کر کہا۔ اپنے احمقانہ مذاق پر شرمندہ ہو گئی۔

"میں دوں گا۔" محسن بولے۔

"مگر میری بچی بھوکی ہے۔ اس کی آیا بالکل نئی ہے اور چھوٹی سی لڑکی ہے۔"

"آپ بچی کو دودھ پلادیجیے۔" انسپکٹر صاحب بولے۔

"تو آیئے اندر بیٹھیے۔" محسن نے پولیس والوں کو بٹھایا۔ انسپکٹر صاحب شاہد کے فین نکلے اور ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ ان کا موڈ بھی ٹھیک ہونے لگا۔

میں شاہد اور محسن پولیس اسٹیشن ما ہم گئے۔

خانہ پُری کر کے میں نے پوچھا۔

"قیدی کہاں ہیں؟"

"دیکھیں گی۔"

"ضرور۔"

ایک جنگلے کے پیچھے چھوٹی سی جگہ میں دس پندرہ آدمی آڑے ترچھے لیٹے تھے۔ "یہ ملزم ہیں قیدی نہیں۔ انھیں کل کورٹ میں پیش کیا جائے گا۔" انسپکٹر صاحب بولے۔

"ان کا جُرم؟"

"دنگا، فساد، پاکٹ مارنا، دارو پی کے دنگا کرنا۔"

"انھیں کیا سزا ملے گی؟"

"جُرمانہ یا چند دن کی قید۔" مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنے پھُس پھُسے ملزم دیکھنے کو ملے۔ دو چار قاتل اور ڈاکو ہوتے تو بات بھی تھی۔

"آپ مجھے کہاں رکھتے؟"

"عورتوں کا انتظام یہاں نہیں۔ انھیں اُدھر گرانٹ روڈ یا ٹنگلے جاتے ہیں۔"

واپس آکر شاہد اور محسن مجھ سے خوب لڑے اور شاہد تو ساری رات لڑتے رہے طلاق تک کی نوبت آگئی۔ محسن کو تو میں نے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ اگر زیادہ جان کھاؤ گے تو انڈر گراؤنڈ ہو جاؤں گی۔ پانچ سو کا پھٹکا بیٹھ جائے گا۔ مگر شاہد کسی طرح مقدمے بازی کی ذلت اور بدنامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے والدین اور بڑے بھائی سُنیں گے تو کیا سوچیں گے۔

پھر جب اخباروں میں خبر نکلی تو میرے سسر کا بڑا درد بھرا خط آیا۔ "دلھن کو سمجھاؤ۔ کچھ اللہ رسول کی باتیں لکھیں کہ عاقبت درست ہو۔ مقدمہ اور وہ بھی فحاشی پر۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ اللہ رحم کرے۔"

منٹو کے فون سے معلوم ہوا ان پر بھی مقدمہ چلا ہے۔ اسی کورٹ میں اسی روز ان کی بھی پیشی ہے۔ پھر صفیہ اور منٹو دوڑے آئے۔ منٹو نہایت ہشاش بشاش، جیسے کسی نے وکٹوریہ کراس دے دیا ہو۔ میں دل میں بڑی نادم تھی۔ بظاہر بہادری جتا رہی تھی مگر منٹو سے مل کر شاہد کی بھی ڈھارس بندھ گئی اور مجھے بھی بڑی تسلی ہوئی۔ دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی مگر منٹو نے وہ شہ دی کہ میرا بھی ڈر نکل گیا۔

"ارے ایک ہی تو معرکے کی چیز لکھی ہے آپ نے۔ اماں شاہد تم بھی کیا آدمی ہو۔ یار تم بھی چلنا تم نے جاڑوں کا لاہور نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم ہم تمہیں اپنا لاہور دکھائیں گے۔ کیا تیکھی سردی پڑتی ہے۔ تلی ہوئی مچھلی اہاہا۔ وہسکی کے ساتھ۔ آتش دان میں دہکتی ہوئی آگ جیسے عاشقوں کے دل جل رہے ہوں، اور بلڈ ریڈ مالٹے۔ آہا۔ جیسے معشوق کے بوسے۔"

"ارے چپ کرو منٹو صاب"۔ صفیہ نروس ہونے لگی۔

اور پھر مغلظات سے بھرے خطوں کا تانتا لگ گیا۔ ایسی انوکھی پیچ دار بھاری بھرکم گالیاں کہ مردہ کے سامنے بک دی جائیں تو اٹھ کر بھاگ جائے۔ مجھے ہی نہیں میرے پورے خاندان کو، شاہد کو اور میری دو مہینے کی بچی کو کہ اس کی پیدائش کی خبر کہیں چھپ گئی تھی۔

مجھے پھسلنی کیچڑ چھپکلی اور گرگٹ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بہت سے لوگ بڑی بہادری سے باتیں بنا لیتے ہیں، لیکن مری ہوئی چوہیا سے ڈرتے ہیں۔ مجھے اپنی ڈاک سے ڈر لگتا تھا جیسے لفافوں میں سانپ، بچھو اور اجگر بند ہوں۔ ڈرتے ڈرتے خط کھولتی اگر سانپ، بچھو دکھائی پڑتے تو دو لفظ پڑھ کر خط جلا دیتی۔ مگر شاہد کے ہاتھ خط پڑ جاتا تو پھر طلاق کی نوبت آجاتی۔

ان خطوں کے علاوہ اخباروں میں جو مضمون نکل رہے تھے، محفلوں میں جو بحثیں ہوتیں انھیں مجھ جیسی سخت جان ہی جھیل سکتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کی بات کا جواب نہ دیا۔ کبھی اپنی غلطی کو ماننے سے انکار نہیں کیا۔ ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی مجھے اپنے جرم کا اعتراف تھا۔ صرف منٹو ایک ایسا انسان تھا جو میرے اس بزدلانہ رویہ پر بھڑک اٹھتا تھا۔ میں خود اپنے خلاف تھی اور وہ میری حمایت کرتا تھا۔ میرے اور شاہد کے جتنے بھی دوست تھے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ٹھیک سے یاد نہیں مگر شاید عباس نے لحاف کا انگریزی میں ترجمہ بھی کہیں چھپوایا تھا۔ ترقی پسندوں نے نہ مجھے پھٹکارا نہ میری تعریف کی۔ اور مجھے اس رویہ سے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔

جب میں نے یہ کہانی لکھی تو میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ رات کو میں نے کہانی لکھی صبح میں نے اپنی بھاوج کو سنائی۔ انھوں نے تو یہ نہیں کہا کہ یہ گندی کہانی ہے مگر پہچان گئیں کہ کس کی کہانی ہے۔

بچپن میں نے اپنی خالہ زاد بہن کو جو چودہ برس کی تھی کہانی پڑھ کر سنائی۔ وہ کہنے لگی کیا لکھا ہے ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہانی "ادب لطیف" کو بھیجی انھوں نے کچھ نہ کہا فوراً چھاپ دی اور شاہد احمد دہلوی میری کہانیوں کا مجموعہ چھاپ رہے تھے انھوں نے کتابی صورت میں چھاپ دی۔ یہ کہانی ۱۹۴۲ء میں چھپی تھی اور میری اور شاہد کی دوستی شادی کے ارادے تک پہنچ چکی تھی۔ شاہد نے کہانی پڑھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ہماری جھک جھک بھی ہوئی تھی مگر اس وقت لحاف پر جو حملے ہو رہے تھے وہ بمبئی تک نہیں پہنچے تھے میرے پاس صرف "ساقی" اور "ادب لطیف" آتے تھے۔ شاہد زیادہ بدظن نہیں ہوئے تھے۔ اور ہماری شادی ہو گئی تھی۔

۱۹۴۴ء میں دسمبر کے مہینے میں سمن ملا کہ ہمیں جنوری میں کورٹ میں حاضر ہونا ہے۔ سب کہہ رہے تھے جیل ویل نہیں بس جرمانہ ہو جائے گا۔ اور ہم بڑے جوش سے لاہور کے لیے گرم کپڑے تیار کروانے لگے۔

سیما بہت چھوٹی اور کمزور تھی اور بڑی اونچی آواز سے روتی تھی۔ چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا تو اس نے کہا بالکل تندرست ہے یوں ہی غل مچاتی ہے۔ اسے لاہور کی سردی میں لے جانا ٹھیک نہ تھا۔ ایک دم اتنی سردی نہ جھیل سکے گی۔ تو ہم نے بچی کو علی گڑھ سلطانہ جعفری کی اماں کے پاس چھوڑا اور لاہور روانہ ہو گئے۔ دلی سے شاہد احمد دہلوی اور وہ کاتب جنھوں نے کتابت کی تھی ساتھ ہو گئے تھے۔ کیوں کہ بادشاہ سلامت نے انھیں بھی ملزم قرار دیا تھا۔ یہ مقدمہ "ادب لطیف" پر نہیں بلکہ اس کتاب پر چلا تھا جو شاہد احمد دہلوی نے چھاپی تھی۔

ہمیں سلطانہ لینے آگئی وہ ان دنوں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتی تھی اور لقمان صاحب کے ہاں رہتی تھی۔ ان کی بڑی شاندار کوٹھی تھی۔ بیوی بچے میکے گئے ہوئے تھے اس لیے بس اپنا ہی راج تھا۔

منٹو بھی پہنچ گئے تھے اور پہنچتے ہی ہماری خوب دعوتیں ہوئیں۔ زیادہ تر تو منٹو کے دوست تھے مگر مجھے بھی عجوبہ جانور سمجھ کر دیکھنے آجاتے تھے۔ ہماری ایک دن پیشی ہوئی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ بس جج نے نام پوچھا اور یہ کہ میں نے یہ کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ میں نے اقبال جرم کیا کہ لکھی ہے۔ بس!

بڑی ناامیدی ہوئی۔ سارے وقت کچھ ہمارے وکیل صاحب بولتے رہے۔ ہم چوں کہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے کچھ پلے نہیں پڑا۔ اس کے بعد دوسری پیشی پڑ گئی اور ہم آزاد ہو کر گلچھرے اڑانے لگے۔ میں منٹو شاہد تانگے میں بیٹھ کر خوب شاپنگ کرتے پھرے کشمیری دو شالے اور جوتے خریدے۔ جوتوں کی

دکان پر منٹو کے نازک سفید پیر دیکھ کر مجھے بڑا رشک آیا۔ اپنے بھدّے پیر کو دیکھ کر مور کی طرح ماتم کو جی چاہا۔

"مجھے اپنے پیروں سے گھن آتی ہے۔" منٹو نے کہا۔

"کیوں؟ اتنے تو خوبصورت ہیں۔" میں نے بحث کی۔

"میرے پیر بالکل زنانے ہیں۔"

"مگر زنانیوں سے تو آپنی دلچسپی ہے آپ کو!"

"آپ تو الٹی بحث کرتی ہیں۔ میں عورت سے مرد کی حیثیت سے پیار کرتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خود زنانہ بن جاؤں۔"

ہٹایئے بھی زنانے اور مردانے کی بحث کو، انسانوں کی بات کیجئے۔ پتہ ہے نازک پیروں والے مرد بڑے حساس اور ذہین ہوتے ہیں۔ میرے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے پیر بھی بڑے خوبصورت ہوا کرتے تھے مگر...

اور مجھے اپنے بھائی کے مرنے سے پہلے سوجن سے گھناؤنے ہو جانے والے پیر یاد آ گئے۔ اور سیب اور آلوچے کے پھولوں سے نوخیز دلھن کی طرح آراستہ لاہور، جودھپور کا وہ چٹیل رتیلا قبرستان بن گیا جہاں میرا بھائی منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے جس کی تازہ قبر پہ کانٹے لگا دیے گئے تھے تاکہ بجّو نہ کھود ڈالیں۔ وہ کانٹے میری رگوں میں تیر گئے اور میں نے توس کی نرم شال کاؤنٹر پر ڈال دی۔

لاہور کتنا خوبصورت تھا۔ آج بھی ویسا ہی شاداب قہقہے لگاتا ہوا، بانہیں پھیلا کر آنے والوں کو سمیٹ لینے والا۔ ٹوٹ کر چاہنے والے بے تکلف زندہ دلوں کا شہر، پنجاب کا دل۔

خوب شہر میں گھومے، جیبوں میں چلغوزے بھرے سڑکوں پر کھاتے، باتوں میں غرق چلے جا رہے ہیں۔ گلی میں کھڑے تلی ہوئی مچھلی پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ بھوک کتنی لگتی ہے۔ کھاتے جاؤ چلتے جاؤ سب ہضم۔ ایک ہوٹل میں گھس گئے۔ ہیم برگر اور ہوٹ ڈاگ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔

"ہیم برگر میں ہیم یعنی سؤر کا گوشت ہوتا ہے ہوٹ ڈاگ کھا سکتے ہیں۔" شاہد نے رائے دی اور ہم نے شریف مسلمانوں کی طرح دھرم کا پالن کرتے ہوئے ڈٹ کے ہوٹ ڈاگ کھائے اور قندھاری انار کا رس پیا۔

بعد میں معلوم ہوا یہ گوری قوم بڑی چالباز ہے۔ ہیم برگر میں بیف ہوتا ہے اور ہوٹ ڈاگ میں سؤر کی سوسیج! حالاں کہ ہوٹ ڈاگ کھائے دو دن بیت چکے تھے مگر شاہد کا یہ سنتے ہی جی متلانے لگا۔ پھر ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا کہ بھول چوک میں کھا جاؤ تو معافی ہے تب کہیں جا کے شاہد کی متلی رکی۔

مگر شام کو جب منٹو اور شاہد خوب پی گئے تو پھر دونوں کی یہی رائے ہوئی کہ ہم ہرگز قطعی بے ضرر ہیں۔ ہوٹ ڈوگ کھانے ہی میں خیریت ہے۔ بحث خطرناک صورت اختیار کرنے لگی تو فیصلہ ہوا کہ احتیاطاً ان دونوں سے پرہیز کیا جائے کہ ان کی جنم پتری کا کوئی بھروسہ نہیں کون حرام ہے کون حلال۔ بس یہ چکن تکے کھائے جائیں۔ انارکلی میں چکر لگائے، شالیمار میں گھومے، نورجہاں کا مقبرہ دیکھا اور پھر ڈھوتیں اور مشاعرے اور ہو حق۔

تب میرے دل سے بے ساختہ شہنشاہ برطانیہ کے حق میں دعائیہ کلمے نکلنے لگے کہ انھوں نے ہم پر مقدمہ چلا کر لاہور میں عیش کرنے کا سنہرا موقع دیا۔ ہم دوسری پیشی کا بڑی بے قراری سے انتظار کرنے لگے چاہے پھانسی بھی ہو تو کوئی پروا نہیں۔ اگر لاہور میں ہوئی تو یقیناً شہادت کا رتبہ پائیں گے اور لاہور والے بڑی دھوم سے ہمارے جنازے اٹھائیں گے۔

دوسری پیشی نومبر کے خوشگوار موسم میں پڑی یعنی ۱۹۴۶ء میں۔ شاہد اپنی فلم میں الجھے ہوئے تھے۔ سیما کی آیا بہت ہوشیار تھی اور اب سیما خوب موٹی تازی اور تندرست تھی۔ اس لیے میں نے اسے بمبئی میں چھوڑا اور خود ہوائی جہاز سے دہلی اور وہاں سے شاہد احمد دہلوی اور ان کے کاتب کے ساتھ ریل میں گئی۔ کاتب صاحب سے بڑی شرمندگی ہوتی تھی وہ بے چارے مفت میں گھسیٹ لیے گئے۔ بڑے خاموش مسکین سے تھے ہمیشہ آنکھیں جھکی، چہرے پر اکتاہٹ، انھیں دیکھ کر احساس جرم ایک دم ابھر آتا تھا۔ میری کتاب کی کتابت میں پھنس گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہم مقدمہ ہار جائیں گے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں نے کہانی نہیں پڑھی۔"

"مگر کاتب صاحب آپ نے کتابت کی ہے؟"

"میں الفاظ جدا جدا دیکھتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں۔ ان کے معنی پر غور نہیں کرتا۔"

"کمال ہے! اور چھپنے کے بعد بھی نہیں پڑھتے۔"

"پڑھتا ہوں کہیں غلطی تو نہیں رہ گئی۔"

"الگ الگ الفاظ۔"

"جی ہاں!" انھوں نے ندامت سے سر جھکالیا۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گی؟"

"نہیں۔"

"آپ کیاں (کے یہاں) املا کی بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہوتی ہیں۔ اصل میں س، ث اور ص میں گڑبڑا جاتی ہوں۔ ظ، ض، ز، ذ میں بھی بہت کنفیوژن ہوتا ہے۔ یہی حال ہ، ح اور ھ کا ہے۔"

"آپ نے تختیاں نہیں لکھیں؟"

"بہت لکھیں۔ اور مستقل انہی غلطیوں پر بہت مار کھائی مگر ۔ ۔ ۔"

دراصل جیسے میں الفاظ پر دھیان دیتا ہوں معنی کی طرف توجہ نہیں دیتا اسی طرح آپ اپنی بات کہنے میں ایسی آتاولی ہوتی ہیں کہ حروف پر توجہ نہیں دیتیں۔"

انھ "اللہ کا تبوں کو جیتا رکھے وہ میری آبرو رکھ لیں گے۔" میں نے سوچا اور ٹال دیا۔

شاہد صاحب کے ساتھ میں بھی ایم اسلم صاحب کے یہاں ٹھہر گئی۔ سلام و دعا بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے مجھے جھاڑنا شروع کیا۔ میری عریاں نگاری پر برسنے لگے۔ مجھ پر بھی بھوت سوار ہو گیا۔ شاہد صاحب نے بہت روکا مگر میں الجھ پڑی۔

"اور آپ نے جو "گناہ کی راتیں" میں اتنے گندے گندے جملے لکھے ہیں۔ باقاعدہ سیکس ایکٹ کی تفصیل بتائی ہے صرف چٹخارے کے لیے۔"

"میری اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور!"

"کیا مطلب؟" وہ غصے سے سرخ ہو گئے۔

"مطلب یہ کہ آپ کو خدا نے مرد بنایا اس میں میرا کوئی دخل نہیں اور مجھے عورت بنایا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ مجھے آپ جو چاہتے ہیں وہ سب لکھنے کا حق آپ نے نہیں مانگا نہ میں آزادی سے لکھنے کا حق آپ سے مانگنے کی ضرورت سمجھتی ہوں۔"

"آپ ایک شریف مسلمان خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی ہیں۔"

"اور آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں اور شریف مسلمان خاندان سے ہیں۔"

"آپ مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ کلاس میں زیادہ سے زیادہ نمبر پانے کی کوشش کرتی تھی اور اکثر لڑکوں سے زیادہ نمبر لے جاتی تھی۔"

میں جانتی تھی کہ میں اپنی خاندانی کج بحثی پر اتر آئی ہوں مگر اسلم صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا اور

مجھے ڈر ہوا کہ یا تو وہ میرے تھپڑ مار دیں گے یا ان کے دماغ کی شہ رگ پھٹ جائے گی۔ شاید صاحب کی روح فنا ہو رہی تھی وہ بس رونے ہی والے تھے۔ میں نے بڑی نرم آواز میں انکساری سے کہا۔

"اصل میں اسلم صاحب مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ "لحاف" والے موضوع پر لکھنا گناہ ہے۔ نہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا کہ اس ... مرض ... یا لت کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ شاید میرا دماغ عبدالرحمٰن چغتائی کا برش نہیں ایک سستا سا کیمرہ ہے جو کچھ دیکھتا ہے کھٹ سے بند دب جاتا ہے اور میرا قلم میرے ہاتھ میں بے بس ہوتا ہے میرا دماغ اسے ورغلا دیتا ہے۔ دماغ اور قلم کے قصے میں دخل انداز نہیں ہو پاتی۔"

"آپ کو مذہبی تعلیم نہیں ملی۔"

"ارے اسلم صاحب میں نے بہشتی زیور پڑھا اس میں ایسی کھلی کھلی باتیں لکھی ہیں۔" میں نے بڑی معصوم صورت بنا کر کہا۔ اسلم صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"جب بچپن میں میں نے وہ باتیں پڑھیں تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ باتیں گندی لگیں۔ پھر میں نے بی۔اے کے بعد پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ باتیں گندی نہیں، بڑی سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں جو ہر ذی ہوش انسان کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ویسے لوگ چاہیں تو نفسیات اور ڈاکٹروں کے کورس میں جو کتابیں ہیں انھیں بھی گندہ کہہ دیں۔"

دنادن ختم ہو کر باتیں نرم لہجہ میں ہونے لگیں۔ اسلم صاحب کافی ٹھنڈے ہو گئے۔ اتنے میں ناشتہ آ گیا اور ہم چار انسانوں کے لیے اتنا لمبا چوڑا دسترخوان سجا کہ بآسانی پندرہ آدمی ناشتہ کر سکتے تھے۔ تین چار قسم کے انڈے، سادہ، تلے ہوئے، خاگینہ، اُبلے ہوئے، شامی کباب اور قیمہ، پراٹھے بھی اور پوریاں بھی اور توس بھی، سفید اور پیلا مکھن، دہی اور دودھ، شہد اور خشک ترمیوے۔ انڈے کا حلوا، گاجر کا حلوا اور حلوا سوہن۔

"یا اللہ کیا قتل کرنے کا ارادہ ہے۔"

میں نے بہت جلایا تھا اس لیے ان کی تحریروں کی تعریف شروع کر دی۔ میں نے ان کی "نرگس" اور "گناہ کی راتیں" پڑھی تھیں۔ بس ان ہی کو خوب آسمان پر چڑھایا۔ آخر میں وہ کچھ قائل سے ہو گئے کہ بعض وقت عریانی صاف گوئی کا کام کرتی ہے اور سبق دیتی ہے۔ پھر انھوں نے خود اپنی ایک ایک کتاب کی خوبیاں گنانی شروع کیں اور موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔ بڑی نرمی سے بولے۔

"تم جج کے سامنے معافی مانگ لو۔"

"کیوں؟ ہمارے وکیل صاحب تو کہتے ہیں ہم مقدمہ جیت جائیں گے۔"

"نہیں وہ سالا بکتا ہے۔ تم اور منٹو اگر معافی مانگ لو تو یہ مقدمہ ختم ہو سکتا ہے۔ پانچ منٹ کی بات ہے۔"

"یہاں کے معزز لوگوں نے سرکار پر زور ڈال کر ہم پر یہ مقدمہ چلوایا ہے۔"

"بکواس!" اسلم صاحب بولے مگر آنکھ نہ ملا سکے۔

"تو پھر کیا سرکار نے یا شاہ برطانیہ نے یہ کہانیاں پڑھیں جو انھیں مقدمہ چلانے کی سوجھی!"

"اسلم صاحب یہ تو سچ ہے کہ کچھ ادیبوں، نقادوں اور شرفا نے گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ یہ کتابیں مخرب اخلاق ہیں انھیں ضبط کر لیا جائے۔" شاہد صاحب دھیرے سے بولے۔

"اگر مخرب اخلاق تحریروں پر پابندی نہ لگائی جائے تو کیا ان کو سر پر رکھا جائے؟" اسلم صاحب پھٹ پڑے۔ شاہد صاحب کچھ نادم سے ہو گئے۔

"تب تو ہم سزا کے ہی مستحق ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر وہی کٹ حجتی۔"

"نہیں اسلم صاحب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جرم کیا، شریف انسان گمراہ ہوئے اور معافی مانگ کے صاف نکل گئے۔ میں نے اگر جرم کیا ہے اور وہ ثابت ہو جاتا ہے تو صرف سزا ہی میرے ضمیر کو سکون دے سکتی ہے۔" میں نے طنز سے نہیں سچے دل سے کہا۔

"ہٹ دھرمی نہ کرو۔ معافی مانگ لو۔"

"سزا مل گئی تو کیا ہوگا۔ جرمانہ؟"

"ساتھ میں بدنامی ہوگی۔"

"ارے بدنامی تو ہو چکی۔ اب کیا کسر باقی رہ گئی ہے۔ یہ مقدمہ تو کچھ بھی نہیں۔ جرمانہ کتنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے یہی کوئی دو تین سو۔" شاہد صاحب بولے۔

"بس؟"

"پانچ سو بھی ہو سکتا ہے۔" اسلم صاحب نے ڈرایا۔

"با... س؟"

"بہت روپیہ آگیا ہے؟" اسلم صاحب چڑ گئے۔

"آپ کی دعا ہے۔ اور اگر نہ بھی ہوتا تو کیا آپ مجھے جیل جانے سے بچانے کے لیے پانچ سو نہ دے دیں گے۔ آپ کا شمار تو لاہور کے رئیسوں میں ہے۔"

"زبان بہت چلتی ہے۔"

"میری اماں کو بھی یہی شکایت تھی کہتی تھیں بس جیب چلنی رونی کھیتو" بات ہنسی میں مل گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی کہ معافی مانگ لو۔

جی چاہا اپنا اور ان کا سر پھوڑ لوں۔ مگر دم گھونٹے بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم بات بدل کر بولے۔

"تم نے دوزخی کیوں لکھا۔"

میرے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔

"تم کیسی بہن ہو کہ اپنے سگے بھائی کو تم نے دوزخی لکھا۔"

"وہ دوزخی تھے یا جنتی میرا جو جی چاہا میں نے لکھا آپ کون ہوتے ہیں۔"

"وہ میرا دوست تھا۔"

"میرا بھائی تھا۔"

"لعنت ہے ایسی بہن پر۔"

میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے دوزخی لکھا تھا تو میرے اوپر کیا بیتی تھی۔ میں خود بھی دوزخ کے شعلوں سے گذری تھی میرا کیا کچھ جل کر راکھ ہوا تھا۔ رات کے دو بجے تھے جب میں نے یہ مضمون ختم کیا۔ کیسی ہیبت ناک رات تھی۔ سمندر گھر کی سیڑھیوں تک چڑھ آیا تھا۔ جب تک احاطے کی دیوار نہیں بنی تھی مجھ پر عجیب وحشت سی طاری ہو گئی۔ جو میں نے لکھا تھا وہ میرے چاروں طرف سینما کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے لیمپ بجھایا تو دم گھٹنے لگا۔ جلدی سے پھر جلا دیا۔ اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا مجھے وہ قبر یاد آ رہی تھی جسے دیکھ کر آنے کے بعد میں مہینوں اکیلے کمرے میں نہیں سو پاتی تھی اکیلے پلنگ پر مجھے وحشت ہوتی تھی میں اپنے ساتھ اپنی چھوٹی سی خالہ زاد بہن کو سلانے لگی تھی۔ جو دو تیور سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی اسی لیے میں بھی بھاگ آئی تھی۔ دس ستونوں میں سے ایک ڈھے گیا تھا۔ اس خلا کو کون ناپ سکتا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا کمرے میں جا کے اپنا بکس بند کیا اور سلطانہ کو فون کیا کہ فوراً آ جاؤ اور مجھے زبردستی لے جاؤ۔ اگر اسلم صاحب روکیں تو برا مان کر خوب بگڑنا۔ سلطانہ نے پوچھا کیا بات ہے میں پانچ بجے چھٹی ہوتے ہی پہنچوں گی۔"

"تب تک تو ایک آدھ خون ہو جائے گا۔ تم فوراً آؤ۔"

سلطانہ فوراً آ گئی۔ مگر اسلم صاحب نے کہہ دیا کہ میں نہیں جا سکتی۔ سلطانہ ضد کرتی جاتی تھی اور میں اس ڈرامے پر ہنس ہنس کے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ میں سلطانہ کے ساتھ بھاگی۔

پیشی کے دن ہم کورٹ میں حاضر ہوئے اور وہ گواہ پیش ہوئے جنھیں یہ ثابت کرنا تھا کہ منٹو کی "بو" اور میرا "لحاف" فحش ہیں۔ میرے وکیل نے مجھے سمجھا دیا کہ جب تک مجھ سے براہ راست سوال نہ کیا جائے میں منہ نہ کھولوں۔ وکیل خود جو مناسب سمجھے گا کہے گا۔

پہلے "بو" کا نمبر آیا۔

"یہ کہانی فحش ہے؟" منٹو کے وکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں" گواہ بولا۔

"کس لفظ سے آپ کو معلوم ہوا کہ فحش ہے۔"

گواہ : لفظ "چھاتی"۔

وکیل : "مائی لارڈ لفظ چھاتی فحش نہیں ہے۔"

جج : "درست۔"

وکیل : "لفظ چھاتی فحش نہیں؟"

گواہ : "نہیں۔ مگر یہاں مصنف نے عورت کے سینے کو چھاتی کہا ہے۔"

منٹو ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"عورت کے سینے کو چھاتی نہ کہوں تو کیا مونگ پھلی کہوں؟"

کورٹ میں قہقہہ پڑا منٹو بھی ہنسنے لگا۔

"اگر ملزم نے پھر اس قسم کا چھچھورا مذاق کیا تو کنٹمپٹ آف کورٹ کے جرم میں باہر نکال دیا جائے گا یا معقول سزا دی جائے گی۔" منٹو کو اس کے وکیل نے چپکے چپکے سمجھایا اور وہ سمجھ گیا۔ بحث چلتی رہی اور گھوم پھر کے گواہوں کو بس ایک چھاتی ملتا تھا۔ جو فحش ثابت نہ ہو پاتا تھا۔

"لفظ چھاتی فحش ہے۔ گھٹنا یا کہنی کیوں فحش نہیں؟" میں نے منٹو سے پوچھا۔

"بکواس!" منٹو پھر بھڑک اٹھا۔ بحث چلتی رہی۔ ہم لوگ اٹھ کر برآمدے میں ڈگر ڈگر کرتی بنچوں پر جا بیٹھے۔ احمد ندیم قاسمی ایک ٹوکرا مالٹے لائے تھے۔ انھوں نے نفاست سے مالٹے کھانے کی ترکیب بتائی۔ مالٹے کو آم کی طرح پلپلا کر چھوٹا سا سوراخ کر لو اور مزے سے چوستے رہو۔ ٹوکرا بھر مالٹے ہم بیٹھے بیٹھے

چوس گئے۔ مالٹوں سے پیٹ بھرنے کے بجائے اور شدت سے بھوک جاگ اٹھی۔ لنچ بریک میں کسی ہوٹل پر دھاوا بول دیا یسما کی پیدائش کے سلسلے میں میں بہت بیمار رہی تھی ساری چربی چھٹ گئی تھی مرغن کھانوں کا پرہیز نہیں رہا تھا مرغی اتنی قوی ہیکل تھی کہ بالکل گدھ یا چیل کے نکڑے لگ رہے تھے موٹی موٹی کالی مرچ چھڑک کر گرم گرم کلچوں کے ساتھ اور پانی کی جگہ قندھاری انار کا رس۔ بے اختیار جی سے مقدمہ چلانے والوں کے لیے دعا نکل رہی تھی۔

شام کو لقمان نے چند ادیبوں اور شاعروں کی دعوت کی تھی۔ وہاں پہلی بار میری مسز حجاب امتیاز علی سے ملاقات ہوئی۔ بےحد میک اپ، آنکھوں میں دھڑیوں کاجل، کچھ اداس کچھ روٹھی سی عموماً بات کے جواب میں خلا میں گھورنے لگتیں۔

"فراڈ ہے۔" منٹو نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اور پھیلا کر میرے کان میں کہا۔

"نہیں، وہ اس فضا میں کھوئی ہوئی ہے جو اس کے قلم سے خوابناک دھوئیں کی طرح نکلی ہے اور اس کے گرد ایک ست رنگا خول تعمیر کر دیتی ہے۔"

حجاب امتیاز علی خلا میں گھورتی رہیں اور میں امتیاز علی کو ڈھونڈ کر ان سے باتیں کرنے لگی کس قدر فاصلہ تھا میاں بیوی کے مزاج میں۔ امتیاز صاحب نہایت باتونی، قہقہہ باز اور کھلے دل کے مالک تھے محفل لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ ایسا لگا برسوں کی ملاقات ہے۔ ان کی باتیں ان کی تحریروں سے بھی زیادہ پُربہار تھیں۔ حال ہی میں جب پاکستان گئی تو لاہور میں مسز حجاب امتیاز علی سے پھر ملاقات ہوئی۔ ہلکا سا میک اپ، پہلے سے بہت کمسن اور کھلی ہوئی، بڑی بےتکلف اور باتونی، جیسے انھوں نے دوسرا ہی جنم لے لیا ہو۔

مجھے آرغنوں دیکھنے کا بڑا شوق تھا جس کا حجاب کے افسانوں میں بےحد ذکر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی آرغنوں نہیں دیکھا تھا، حجاب کے یہاں گئی تو میں نے ان سے کہا "کیا آپ کے پاس واقعی آرغنوں ہے؟"

"ہاں! دیکھیں گی؟"

"ضرور، وہ لفظ جسے آپ کے افسانوں میں پڑھ کر ہی نشہ طاری ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں بےبات آنسو چھلک اٹھتے تھے میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ کسی زمانے میں آپ کی نقل میں میں نے بھی نثری شاعری کی تھی، جو میں نے بعد میں جلا دی۔"

آرغنوں دیکھ کر میرے سارے جوش اور رومانس پر اوس پڑ گئی۔ ارے یہ تو دہی بچکانہ سا پیانو

کا بچہ ہے جو فلمی گانوں کی ریکارڈنگ میں ڈی میلو بجایا کرتا ہے اور ریکارڈسٹ اسے اکثر ڈانٹا کرتا ہے کبھی اِدھر کھسکواتا ہے کبھی اُدھر اور بیک گراؤنڈ موسیقی میں جب ہیروئن بہت گرماتی ہے تو اسی کے سُر اس کے دماغی بھونچال کو نغمہ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ آرگن، کتنا بھونڈا نام ہے اور غین کی شمولیت سے کتنا نازک گنگناتا ہوا آساوری کا سُر بن جاتا ہے۔

کورٹ میں بڑی بھیڑ تھی کئی اصحاب ہمیں رائے دے چکے تھے کہ ہم معافی مانگ لیں وہ جرمانہ ہماری طرف سے ادا کرنے کو تیار تھے مقدمہ کچھ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ لحاف کو فحش ثابت کرنے والے گواہ ہمارے وکیل کی جرح سے کچھ بوکھلائے رہے تھے۔ کہانی میں کوئی لفظ قابل گرفت نہیں مل رہا تھا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ یہ جملہ "... عاشق جمع کر رہی تھیں فحش ہے۔"

"کون سا لفظ فحش ہے۔ جمع یا عاشق؟" وکیل نے پوچھا۔

"لفظ عاشق"! گواہ نے ذرا تکلف سے کہا۔

"مائی لارڈ، لفظ عاشق بڑے بڑے شعرا نے بڑی فراوانی سے استعمال کیا ہے اور نعتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کو اللہ والوں نے بڑا مقدس مقام دیا ہے۔"

"مگر لڑکیوں کا عاشق جمع کرنا بڑی معیوب بات ہے۔" گواہ نے فرمایا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کیونکہ ... یہ شریف لڑکیوں کے لیے معیوب بات ہے۔"

"جو لڑکیاں شریف نہیں ان کے لیے معیوب نہیں؟"

"ا... نہیں۔"

"میری موکل نے ان لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جو شریف نہیں ہوں گی۔ کیوں صاحب بقول آپ کے غیر شریف لڑکیاں عاشق جمع کرتی ہیں۔"

"جی ہاں"۔

"ان کا ذکر کرنا فحاشی نہیں مگر ایک شریف خاندان کی تعلیم یافتہ عورت کا ان کے بارے میں لکھنا قابل ملامت ہے۔" گواہ صاحب زور سے گرجے۔

"تو شوق سے ملامت فرمائیے مگر قانون کی گرفت کے قابل نہیں۔"

معاملہ بالکل پھس پھسا ہو گیا۔

"اگر آپ لوگ معافی مانگ لیں تو ہم آپ کا سارا خرچہ بھی دیں گے اور ..." ایک صاحب

نہ جانے کون چھپکے سے میرے پاس آکر بولے۔

"کیوں منٹو صاحب معافی مانگ لیں جو روپے ملیں گے مزے سے چیزیں خریدیں گے" میں نے منٹو سے پوچھا۔

"بکواس" منٹو نے اپنی مور پنکھی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے یہ سر پھرا منٹو راضی نہیں"

"مگر آپ۔ اگر آپ ہی . . . "۔

"نہیں، آپ نہیں جانتے یہ شخص بڑا فتین ہے بمبئی میں میرا رہنا دوبھر کردے گا اس کے غصہ سے وہ سزا بدرجہا بہتر ہوگی جو مجھے ملنے والی ہے"

وہ صاحب اداس ہوگئے کیونکہ ہمیں سزا نہیں ملی۔ جج صاحب نے مجھے کورٹ کے پیچھے ایک کمرے میں طلب کیا اور بڑے تپاک سے بولے۔

"میں نے آپ کی اکثر کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ فحش نہیں۔ اور نہ لحاف فحش ہے مگر منٹو کی تحریروں میں بڑی غلاظت بھری ہوتی ہے"

"دنیا میں بھی غلاظت بھری ہے" میں منحنی آواز میں بولی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ اسے اچھالا جائے"

"اچھالنے سے وہ نظر آجاتی ہے اور صفائی کی طرف دھیان جا سکتا ہے"

جج صاحب ہنس دیے۔

نہ مقدمہ چلنے سے پریشانی ہوئی تھی نہ جیتنے کی خوشی ہوئی۔ بلکہ غم ہی ہوا کہ اب پھر لاہور کی سیر خدا جانے کب نصیب ہوگی۔

لاہور کتنا سلونا لفظ ہے۔ لاہوری نمک! جیسے نگینے۔ گلابی اور سفید۔ جی چاہتا ہے کہ تراش کر چندن ہار میں جڑ لوں اور کسی نیار کی ہنس جیسی سفید گردن کے گرد ڈال دوں۔

"نئی نئی تاریاں دی لو" سریندر کور کے گلے میں لاہوری نمک کے نگینے پگھل کر سر بن گئے ہیں۔ ساتھ میں اس کے میاں سوڈی کی آواز میں اطلس و دیبا کی سرسراہٹ عجیب رس گھول دیتی ہے۔ لاہور کو دیکھ کر سریندر اور سوڈی کے سُر دل میں جاگ کر ایک پُر سکون سی ہلچل مچا دیتے ہیں۔ آپ ہی آپ جی بھر آتا ہے انجانے غیر مرئی محبوب کی یاد ہوک بن کر اٹھتی ہے۔ لاہور کی ہوا میں نور گھلا ہوا ہے۔ خاموش گھنگھرو گونجتے ہیں اور مسز حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی نارنگی کی کلیاں مہکنے لگتی ہیں اور عمر کا وہ زمانہ یاد آجاتا

ہے جب ان کے رس میں ڈوبے شفق آلود افسانوں میں کھو جاتے تھے۔ پھر جانے کیا ہوا؟
چارلس ڈکنس کو پڑھا، ڈیوڈ کوپر فیلڈ اولیور ٹوسٹ، ٹوٹو بنگے!
اور گورکی کی "ماں" نے آسمان سے اٹھا کر دھرتی پر پٹخ دیا۔
چیخوف، ایمل زولا، گوگول، ٹولسٹائی، دوستووسکی، موپساں۔
خوابوں کے سارے قلعے اڑ اڑا دھم!

اور میں پھسل کر اس پھوس کے بنگلے میں آن گری جہاں ہم علی گڑھ میں لال ڈگی کے کنارے رہتے تھے۔ یہ بنگلے کچی اینٹوں کے تھے اور کیل ٹھونکو تو بھر بھر کر کے کچی مٹی بہنے لگتی تھی۔ چھپر میں کبوتروں کے گھونسلوں سے بیٹ ٹپکا کرتی تھی اور چمگادڑیں لٹکتی تھیں اور کمروں کے فرش کچے تھے آندھی چلتی تو گھر میں بگولے ناچنے لگتے۔ نہ بجلی تھی نہ نل بہشتی سر پہ لال جھاڑن ڈال کر پانی بھرنے آتا تھا۔ بان کے پلنگوں پر دری اور میلی کھدر کی چادریں اور چیکٹ تکیے۔ اماں نے بارہ گز کا فرشی پاجامہ چھوڑ کر پانچ گز کی دھوتی پہننی شروع کر دی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب گھر میں بیس نوکر تھے۔ جو غریب بھوکا ننگا آتا اماں اسے پناہ دے دیتیں۔ پھر پنشن کے بعد ابا میاں نے کفایت کی قینچی چلائی اور صرف علی بخش اس کی بیوی شیخانی بوا جو کھانا پکاتی تھیں۔ اور کوچوان اور اس کی بیوی رہ گئے۔ کیونکہ اب بھی دو گھوڑے اور ایک بھینس تھی۔

شاید مسز امتیاز علی کی شاعرانہ فضا سے مجھے جلن پیدا ہو گئی۔ اپنے خاندان میں رومانی فضا کچھ ویسے بھی پھل پھول نہیں سکتی تھی اور میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد اپنی پہلی کہانی "بچپن" لکھی۔ گھر میں صرف تہذیب نسواں آتا تھا۔ میں نے وہ کہانی بھیج دی، کہانی واپس آگئی اور ساتھ میں امتیاز علی تاج کے والد اور تہذیب نسواں کے ایڈیٹر ممتاز علی صاحب کا ڈانٹ پھٹکار بھرا خط۔ اس کہانی میں میں نے اپنے اور مسز حجاب امتیاز علی کے بچپن کا موازنہ کیا تھا۔ قابل اعتراض بات یہ تھی کہ مجھے قرآن شریف قرأت سے پڑھانے پر مولوی صاحب کی مار پڑتی تھی اور حلق سے عین صاف نہیں نکلتا تھا کوشش کرنے پر تے آجاتی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ میں نے قرأت کا مذاق اڑا کر اپنی لامذہبیت اور گناہ کاری کا ثبوت دیا تھا۔

یہ مضمون بعد میں جب میری کہانیاں چھپنے لگیں تو ساقی میں چھپا اور بہت پسند کیا گیا۔ مجھے عظیم بھائی کے رومینٹک چھیڑ چھاڑ سے بھری کہانیوں سے بھی چڑ آنے لگی۔ وہ جھوٹی تھیں ان میں ان کی زندگی کے کرب کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ دوسرے بھائیوں کی شوخی شرارت اور زندہ دلی کو اپنا بنا کر لکھتے تھے۔

میری یہ حالت تھی کہ کھسیانی بلی کھمبا کھسوٹے سچ بولنے پر عموماً میری ٹھکائی کی جاتی تھی لیکن جب بات ابامیاں تک جاتی تو وہ فیصلہ میرے حق میں کرتے۔ بڑی آپا جوانیس برس کی عمر میں بیوہ ہوگئیں تھیں کرواتیم بن گئی تھیں علی گڑھ کے اونچے طبقے سے خاص طور پر خواجہ فیملی سے بے انتہا مرعوب تھیں اور خواجہ فیملی کی بیگموں سے میری لمحہ بھر نہ پٹتی میں سر پھری زبان دراز منہ پھٹ بدتمیز تھی۔ مجھ پر پردہ لاگو ہو چکا تھا مگر زبان ننگی تلوار کسی کے بس میں نہ تھی۔

میرے اردگرد ایک دھوکہ رچا ہوا نظر آتا تھا۔ بظاہر شرمیلی اور باعزت۔ بیٹیاں چھپ کر غسل خانوں اور اندھیرے کونوں میں رشتہ کے نوجوانوں سے چھین جھپٹ اور چوما چاٹی کرتی تھیں اور بڑی شریف کہلاتی تھیں۔ مجھ جیسے بے نتھے بیل سے کون لڑکا دلچسپی لیتا میں نے اتنا کچھ پڑھا کہ اگر بحث چھڑ جاتی تو میں ان نوجوانوں کو دھونسا لیتی جو کتاب کی صورت سے کانپتے تھے اور صرف مرد ہونے کے ناطے اپنے آپ کو وہ اونچا گردانتے تھے۔

پھر میں نے چوری چھپے انگارے پڑھی۔ رشیدہ آپا ہی مجھے ایک ایسی ہستی نظر آئیں جنھوں نے مجھ میں خوداعتمادی پیدا کی۔ میں نے انھیں اپنا گرو مان لیا۔ علی گڑھ کی چھوٹی زہر آلود فضا میں وہ بڑی بدنام تھیں۔ میری صاف گوئی کو انھوں نے سراہا اور پھر میں نے ان کی بتائی ہوئی کتابیں چاٹ ڈالیں۔

پھر میں نے لکھنا شروع کیا اور میرا ڈرامہ "فسادی" ساقی میں چھپا۔ اس کے بعد اور کہانیاں لکھیں اور کوئی کہانی رد نہیں ہوئی۔ ایک دم مجھ پر اعتراض ہونے لگے لیکن رسالوں سے میری کہانیوں کی مانگ بڑھنے لگی میں نے اعتراضات کی کوئی پروا نہ کی۔

مگر جب میں نے "لحاف" لکھا تو بم پھٹ پڑا۔ ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑے کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی قلم اٹھایا۔

اس دن سے مجھے فحش نگار کا لقب دے دیا گیا۔ لحاف سے پہلے اور لحاف کے بعد میں نے جو کچھ بھی لکھا کسی نے اس پر غور نہ کیا میں جنسیات پر لکھنے والی فحش نگار ہی مانی گئی۔ یہ تو ابھی چند سال سے نوجوان طبقے نے مجھے بتایا کہ میں فحش نگار نہیں حقیقت نگار ہوں۔

میں خوش قسمت ہوں کہ جیتے جی مجھے سمجھنے والے پیدا ہو گئے۔ منٹو کو تو پاگل بنا دیا گیا ترقی پسندوں نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا مجھے ترقی پسندوں نے ٹھکرایا نہیں اور نہ ہی سر پر چڑھایا۔ منٹو خاک میں مل گیا۔ کیونکہ پاکستان میں وہ کنگال تھا میں بہت آسودہ حال تھی فلموں سے ہماری بہت اچھی آمدنی تھی اور ادبی موت یا زندگی کی پروا نہ تھی اور ویسے میں ترقی پسندوں کی خود بھی کچھ کچی ہی ہوئی تھی بڑے زور شور سے انقلاب

لا رہی تھی۔

لحاف کا لیبل اب بھی میری ہستی پر چپکا ہوا ہے اور جسے لوگ شہرت کہتے ہیں وہ بدنامی کی صورت میں اس افسانہ پر اتنی ملی کہ اُلٹی آنے لگی۔ "لحاف" میری چڑ بن گیا تھا میں کچھ بھی لکھوں لحاف کی تہوں میں دب جاتا تھا۔

جب میں نے "ٹیڑھی لکیر" لکھی اور شاہد احمد دہلوی کو بھیجی تو انھوں نے محمد حسن عسکری کو پڑھنے کو دی انھوں نے مجھے رائے دی کہ میں اپنی ناول کی ہیروئن کو لحاف زدہ بنا دوں۔ مارے غصہ کے میرا خون کھول اٹھا میں نے وہ ناول واپس منگوا لیا حالانکہ کتابت شروع ہو گئی تھی۔ یہ ناول میں نے لاہور کے نذیر احمد کو دے دی۔ جب لاہور ہندوستان کا ایک شہر تھا۔

لحاف نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے۔ اس کہانی پر میری اور شاہد کی اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ زندگی جنگ کا میدان بن گئی۔

مگر مجھے لحاف کی بہت بڑی قیمت ملی، ساری کوفت مٹ گئی۔

بہت دن بعد علی گڑھ گئی وہ بیگم جن پر میں نے کہانی لکھی تھی ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں نے انھیں بتا دیا تھا کہ لحاف ان پر لکھی گئی ہے۔

ایک دعوت میں ان سے سامنا ہو گیا میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھول کی طرح کھل اٹھیں، پھر چیرتی ہوئی لپکیں اور مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے ایک طرف لے گئیں اور بولیں۔

"پتہ ہے میں نے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی ہے۔ ماشاء اللہ میرا چاند سا بیٹا ہے۔"

اور میرا جی چاہا کسی سے لپٹ کر زور زور سے روؤں۔ آنسو روکنے کے بجائے میں قہقہے لگا رہی تھی انھوں نے میری بڑی شاندار دعوت کی۔ میں مالا مال ہو گئی۔ ان کا پھول سا بچہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا وہ میرا بھی کوئی ہے میرے دماغ کا ٹکڑا میرے ذہن کی جیتی جاگتی اولاد۔۔۔ میرے قلم کا بچہ!

اور میں نے جان لیا کہ چٹان میں بھی پھول کھل سکتے ہیں۔ خون جگر سے سینچنے کی شرط ہے۔ چلتے چلتے بس ایک بات اور۔ ایک صاحب سے میں نے پوچھا۔

"لحاف مخرب اخلاق ہے؟"

"قطعی!" وہ صاحب بولے۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کہانی کو پڑھ کر جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔"

"ہائے ہے، کیا لحاف اوڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"نہیں، دراصل بیگم بہت سیکسی ہے۔ ظالم بلا کی حسین ہے۔ رنگ و بو میں شرابور۔ سانچے میں ڈھلا جسم، گرم گرم ہونٹ، نشیلی آنکھیں، بس ایک دہکتی ہوئی شعلہ بداماں، چھلکتا جام ہے۔"

"تو پھر؟"

"شیطان ورغلاتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے شیطان؟"

"کہ... کہ اس کے ساتھ... ۔"

"شیطان بڑا عقلمند ہے۔ یہی تو میں چاہتی تھی کہ کوئی مائی کا لال اُسے ربو چڑیل کے چنگل سے آزاد کر کے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر اس بدنصیب حسینہ کی جنم جنم کی پیاس بجھا دے۔ پیاسی چڑیا کو پانی پلانا بہت بڑا ثواب ہے۔"

"بیگم کا پتہ کیا ہے؟" وہ صاحب مسکرائے۔

"آپ بڑی دیر سے پیدا ہوئے۔ وہ تو اب اللہ کے فضل سے دادی بن گئی ہیں۔ برسوں ہوئے ایک شہزادہ انھیں کالے دیو کے جادوئی محل سے آزاد کر کے زندگی کے پر بہار چمن میں لے اڑا۔"

دور کسی فلیٹ میں نیرہ نور فیض کی نظم گا رہی تھی۔

"ان بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبت ریا کار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں"

اور میں سوچنے لگی، کہاں ہے بھارت کی وہ مہان ناری۔

وہ تقدس کی دیوی سیتا جس کے کنول جیسے نازک پیروں نے آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اور میرا بائی جس نے بڑھ کر خدا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

وہ ستی ساوتری جو یم دوت سے اپنے ستیاوان کی جیون جیوتی چھین لائی اور رضیہ سلطانہ جس نے بڑے بڑے شہنشاہوں کو ٹھکرا کر ایک حبشی غلام کو اپنا ایمان بنا لیا۔

کیا وہ آج لحاف میں دبکی پڑی ہے۔

یا فارس روڈ پر خاک و خون سے ہولی کھیل رہی ہے!

# ننھّے مُنّے

جیسے ہی ننھّے بھائی نے حامی بھری امّاں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
ننھے بھائی نے ایک شرط لگا دی کہ شادی میں بالکل پیسہ خرچ نہیں کیا جائے گا ننھے بھائی اماں کے ساتھ جائیں گے اور دُلھن بیاہ لائیں گے نہ جہیز لیا جائے گا نہ چڑھاوا چڑھے گا خاموشی سے نکاح ہوگا اور بس۔ ابّا نے ان کا ساتھ دیا۔ پنشن کے بعد منّے بھائی کی شادی میں امّاں نے اتنا روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا کہ ابّا کا جی کھٹّا ہو گیا تھا۔ امّاں نے فوراً وعدہ کر لیا، اماں جھوٹے وعدے کرنے کی عادی تھیں ابّا ذرا بھی پیسہ دینے میں کوتاہی کرتے تو وہ چپکے سے قرض لے لیتیں اور الٹے تللے سے خرچ کرتیں۔ اگر بعد میں ابّا چوں چرا کرتے تو منہ پھلا کر بھوک ہڑتال کر دیتیں ابّا پست ہو کر ہار جاتے۔ وہ جانتے تھے خرچ کم کرنے کی دھمکیاں فضول ہیں امّاں جو چاہیں گی کریں گی۔ مگر اس بار ننھے بھائی انکے ساتھ تھے اس لیے ابّا کو یقین تھا کہ امّاں ضرورت سے زیادہ من مانی نہ کر سکیں گی۔

امّاں کہاں تو دنیا سے منہ موڑ رہی تھیں کہاں ایک دم حکم دیا کہ اسی وقت پیغام بھیجا جائے۔ ابّا نے اپنا لکھنے کا صندوقچہ منگوایا اور پیغام کا مضمون مرتب کرنے لگے۔

بڑے ابّا فوراً بلائے گئے کہ یہ مبارک کام اُن کے بغیر کیسے انجام دیا جا سکتا تھا۔ مضمون مرتّب ہونے لگا۔

"رقعہ فارسی میں لکھا جائے گا۔" بڑے ابّا نے الٹی میٹم دے دیا۔ کیوں کہ ہم چغتائیوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ مگر امّاں چھیل پڑیں۔

"اے خاک ڈالو موئی فارسی پر بھلا سا رقعہ لکھ دو۔ ظفر حسین دُلھن کے باپ کہں سے فارسی

پڑھواتے پھریں گے۔ بڑی ردوقدح کے بعد طے ہوا کہ رقعہ اردو میں لکھا جائے گا۔ گلابی کاغذ کے نہ ہونے کا اماں کو بڑا غم تھا لیکن وہ کاغذ منگوانے کا انتظار کہاں کر سکتی تھیں۔ رقعہ لکھا گیا اور طے ہوا کہ ہلدی کے چھینٹے برکت کے لیے ڈالے جائیں۔

شیخانی بوا نے فوراً ہلدی پیسی، سب بچے چھینٹے دینے پر جٹ گئے اور کئی لفافے غارت ہوئے۔ تب اماں نے جوتی سنبھالی اور خدا خدا کر کے لفافہ سنوارا گیا اور رقعہ بھیجا گیا۔

اماں نے فوراً بزاز اور سُنار بلوائے اور ابا کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی اور جوڑے تیار ہونے لگے۔ ہم لوگ بڑے غمگین تھے کہ برات میں نہیں جائیں گے۔ مگر اماں نے کہا۔

"اے بس چپکے بیٹھے رہو، تم سب جاؤ گے۔"

ابا اور ننھے بھائی [1] سے چھپا کر سب کے خوب جوڑے بنے اور بڑی تیاری ہونے لگی۔ "کوئی نہیں جائے گا" والے وعدے کو بھول کر اماں نے ساری برادری اور خاندان کو فوراً رقعے بھجوائے۔ ماموں کا جواب آ گیا تو تاریخ بھی طے ہوگئی۔ آپا بھی دہلی سے آگئیں اور باجی رامپور سے آن دھمکیں۔

ننھے بھائی بہت چراغ پا ہوئے کہ اماں وعدہ خلافی کر رہی ہو۔ اماں نے معصوم صورت بنا کر کہہ دیا۔

"سب اپنا اپنا خرچ کر کے شادی میں جائیں گے پھر تم روکنے والے کون ہوتے ہو۔" اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا، مگر ابا جانتے تھے سب کا خرچ انھیں دینا ہوگا۔ اماں کو وہ اچھی طرح جانتے تھے مگر ان سے ٹکر لینا فضول سمجھتے تھے۔ جانتے تھے ان کی ایک نہ چلے گی اماں جو طے کر چکی ہیں وہ کریں گی۔

منے بھائی نے دولھا میاں کو خوب بھڑکایا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ سارے خاندان کو آگرہ بلاوے گئے ہیں اور سب برات میں جود صپور چلیں گے۔"

"میں شادی نہیں کروں گا۔" ننھے بھائی نے دھمکی دی۔

"شادی تو اب کرنی پڑے گی پیغام منظور ہو گیا۔ اماں سب کو قتل کر دیں گی۔ ہم اپنے ماموں کی اتنی خطرناک بے عزتی نہیں کر سکتے۔"

"مگر ساری برادری تو بہت لمبی چوڑی ہے بہت خرچہ ہوگا میں کوڑی نہیں کماتا، سرکار کی پنشن

---

[1] خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی میرے ابا جنھیں بچے بھائی بہن سرکار کہتے تھے۔

ہو چکی ہے اتنے بڑے خاندان کا ان پر بار ہے شادی کا بوجھ میں نہیں ڈالنے دوں گا۔ میں خود غائب ہو جاؤں گا۔"

"اب پیغام منظور کر لیا گیا ظفر حسین نے رقعے بھی چھپوا لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" ابا نے سُنا تو کہا۔

"میں شادی نہیں کروں گا میں نواب فیض کے ساتھ شکار پر نیپال چلا جاؤں گا۔"

"ہم تمھیں جیل میں سڑوادیں گے۔" ابّا بولے۔

"وہ کیسے ؟"

"چوری کا الزام لگا کر۔"

"آپ جھوٹ بولیں گے ؟"

"نہیں جھوٹ تمہاری اماں بولیں گی ہم ان کی رپورٹ پولیس تک پہنچادیں گے اُن کی بات رکھنے کے لیے ہم اپنا سارا رسوخ لگادیں گے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اماں جھوٹ بولیں گی ؟"

"جھوٹ کا عذاب وہ بھگتیں گی۔"

"الزام کیا لگائیں گے ؟"

"زیور چوری کر کے بھاگے ہو۔"

"سرکار آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" ننھے بھائی ہنس دیے۔

"ہم بھی بیٹیوں کے باپ ہیں، ہم ظفر کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مگر اتنے بڑے خاندان کو برات میں لے جانا کہاں کی عقلمندی ہے ؟"

"کون سا خاندان ؟" ابا چونکے۔

"آپ کو پتہ نہیں اماں نے آگرے کے پورے خاندان کو برات میں چلنے کی دعوت دی ہے۔ بچّوں سے خط لکھوائے ہیں۔"

"یہ ان کی زیادتی ہے۔"

"ان کو منع لکھ دیا جائے۔"

"نہیں بلاوا دے کر ہم ایسا نہیں کر سکتے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔"

"سرکار یہ تو اندھیر ہے۔"

"ہم تمہاری اماں کی اندھیر رہنے کے عادی ہوچکے ہیں" ابا مسکرائے۔ انھیں اماں کی ان بچکانہ غیر ذمہ داریوں پر پیار بھی آتا تھا اور غصہ بھی مگر پیار ہمیشہ غصہ پر غالب آجاتا تھا۔

"ہم نے دانستہ انھیں کبھی دکھ نہیں پہنچایا۔"

دونوں بھائی مسکرانے لگے۔ اماں بڑی پیاری تھیں۔ انھیں جو چاہتا بیوقوف بنا کر ٹھگ لیتا اور وہ جیسے جان بوجھ کر ٹھگ جاتیں۔ ٹھگنے والے سے گھڑی بھر کو بھی بددل نہ ہوتیں۔ ان کے اس بھولپن پر سب کو پیار آجاتا اور بات بھلا دی جاتی۔

دلھن کے لیے نہایت رازداری سے بے حد بھاری جوڑا بنا اور جتنا زیور دلھن بھابی یعنی عظیم بھائی کی دلھن کے لیے بنا تھا اتنا ہی اُن کا بنا۔ اماں نے اپنے منہ بولے چاچا جی گرجا دیال سے قرض لے کر خوب کپڑے لتے بنائے۔ ابا کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ آخر وہ خود ہی زور دینے لگے کہ ہلکا سا ایک جوڑا تو ضرور بناؤ اور دو چار زیور، مگر اماں یہی کہتی رہیں۔

"ظفر میری لاج رکھ لیں گے۔ میں ان سے چڑھاوا لوں گی آخر وہ ننھے کے ماموں ہیں، مترو (چھوٹے ماموں فرحت حسین عثمانی) بھی بھات دے گا مجھے ہاتھوں میں دس بارہ تولے کے کڑے دیگا۔ وہی میں چڑھا دوں گی۔"

اماں اس بھولپن سے جھوٹ بولیں کہ ابا نہایت دکھی ہوگئے اور زبردستی اماں کو روپے دیے۔ چاچا جی کے قرضہ کا تو ہمیں کسی کو پتہ نہیں تھا، ہم اپنے کپڑوں کا ذکر ابا کے سامنے ہرگز نہیں کرتے تھے یہ اماں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر ابا کو پتہ چل گیا تو سارے کپڑے چولھے میں جھونک دیں گی اور کسی کو شادی میں نہیں لے جائیں گی۔

اِدھر ننھے بھائی اور منے بھائی نے نہایت خفیہ طور پر اماں کے پلان کی کاٹ شروع کردی۔ ہم لوگوں نے آگرہ سے آنے والے مہمانوں کی فہرست لی کہ ان کے ٹکٹوں کا انتظام کریں گے اور ڈبہ ریزرو کرالیں گے تو کچھ کفایت ہوگی۔ اماں خوش ہوگئیں اور ان دونوں نے سب مہمانوں کو پوسٹ کارڈ ڈال دیے کہ دولھا کو ٹائیفائڈ ہوگیا ہے اس لیے فی الحال شادی ملتوی ہوگئی ہے نئی تاریخ مقرر ہوتے ہی اطلاع دی جائے گی۔

شمیم چنو اور میرے ماموں زاد بھائی یعنی دلھن کے سگے بھائی اور جسیم بھائی کو شادی میں نہیں جانے دیا گیا کیونکہ ان کے امتحان بھی قریب تھے ابا بھی نہیں گئے کیونکہ گھر میں کسی کو تو بچوں پر نگاہ رکھنی تھی، باقی ہم سب روانہ ہوگئے۔ جب بھی ہم لوگ کہیں آتے جاتے تیسرے درجہ کے دو ڈبے ریزرو ہوجایا

کرتے تھے اُس میں کیمرہ دھان بھر کے جاتی اور ابّا فرسٹ کلاس میں جاتے تھے۔ امّاں چاہتی تھیں کہ علی گڑھ سے ہی دونوں ڈبے ریزرو کر لیے جائیں تاکہ آگرے کے مہمانوں کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے لیکن یعنی ننھے منے نے اماں سے روپے لے لیے مگر ایک ہی ڈبہ ریزرو کروایا خود مردانہ میں ٹھنس ٹھنسا کر کام چلالیا۔

آگرہ پہ امّاں پریشان!

"ہے ہے کوئی نہیں آیا؟"

"ہاں اماں کوئی نہیں آیا، کئی بار پلیٹ فارم کے چکر لگائے کوئی نہیں دکھائی دیا۔"

"مگر کیوں؟ رقعوں کے تو جواب آ گئے تھے کہ سب آ رہے ہیں۔" بڑی معصومیت سے اماں نے پوچھا۔

کہاتے ہیں منے بھائی نے کچھ ننھے بھائی کے کان میں کہا اور دونوں سرپٹ بھاگے اور ڈبوں میں گم ہوگئے۔

بھینس والے بڑے ابّا پار والے پلیٹ فارم پر کھڑے چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی سامان نہ تھا وہ شادی ٹلنے کے پوسٹ کارڈ سے کچھ مطمئن نہیں تھے کچھ دل میں شبہ تھا کہ ان سے چال چلی گئی ہے۔ برات کو دیکھ کر وہ جلدی سے واپس لوٹ گئے اماں نے انھیں نہیں دیکھا اور پورے وقت خاندان کے ان ذلیل لوگوں پر لعنت بھیجتی رہیں جو شاید دینے لینے سے جان بچانے کی وجہ سے غوطہ دے گئے تھے۔

"شاید طبیعت خراب ہوگئی ہوگی اس لیے نہ آسکے۔" منے بھائی بھولی صورت بنا کر اماں کو تسلّی دینے لگے۔

"اُے ہے سارے کنبے کو ہیضہ ہوگیا، طاعون سمیٹ لے گیا۔" اماں رو پڑیں۔ "میں نے کتنا لیا دیا اور آج میرے اپنے مجھے دغا دے گئے۔ ایسی بے مروتی کی مجھے اپنوں سے امید نہ تھی قسم خدا کی اب کسی کی صورت بھی دیکھ جاؤں تو سوّر ہی کھاؤں۔"

ہم لوگ بالکل فکرمند نہیں تھے کیونکہ نہایت بزرگ بڈھے بڈھیاں شادی میں بلائی گئی تھیں جو بات بات پر ٹھنے دیتیں دوپٹہ سر پہ ڈھکنے کو کہتیں۔

"اے ہے شریف بیٹیاں یوں اکڑ کر مردوں کی طرح نہیں بیٹھتیں۔" اُف آگ لگ جاتی تھی ان کی جلی کٹی باتیں سُن کر۔ بڑی بہنیں تو طرح دے جاتیں، چپکے چپکے بڑبڑاتیں، لیکن میں کمبخت بے انتہا

منہ زور تھی، میں تڑتڑ جواب دینے لگتی۔ اماں مارنے کی دھمکیاں دیتیں، جوتی وغیرہ بھی پھینک مارتیں مگر میں ہمیشہ اماں سے دور ہی بیٹھتی تھی اور وار خالی دے جاتی، جوتی کسی بے خبر معصوم کی چاند پر پڑتی۔ اماں کا نشانہ بے حد خراب تھا۔

"اماں اِن بڑھیوں بڈھوں کی خوب پرستش کرتی تھیں اور ہم لوگوں کی اس بدتمیزی کی بدولت انھیں شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ابا سے شکایت کرتیں وہ ہمیں ڈانٹتے ایسے کہ اماں بھی سمجھ جاتیں کہ دراصل وہ ہمیں شہ دے رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں میں خوب سمجھتی ہوں تمہیں نے ان نامرادوں کو شتر بے مہار بنایا ہے۔"

"تم کہو تو ہم ان کی مرمت کردیں۔" ابا دھمکی دیتے اور اماں سہم جاتیں اور خود ہی ہماری صفائی کرنے پر تل جاتیں کیونکہ وہ جانتی تھیں ابا نے بچپن سے پہلوانی سیکھی تھی، ہلکے سے بھی ہاتھ لگا دیتے تو کچومر نکل جاتا اور جب وہ کسی بات پر غصہ ہو کر کسی کو مارنا شروع کرتے تھے تو اُف میں بیان نہیں کر سکتی کہ کتنی بے رحمی سے مارتے تھے۔ لڑکیوں پر انھوں نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا صرف خاکسار کی ایک بار باریک بینت سے تواضع کی تھی، مگر منے بھائی نے پہلے ہی بینت کے بعد دوڑ کر مجھے اپنے جسم کی آڑ میں لے لیا تھا۔ وہ بخار میں جل رہے تھے اور دو چار بینت ہی پڑے تھے کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، میں ڈیڑھ عدد بینت کھا کر سرپٹ بھاگی اور ابا عظیم بھائی کی حالت دیکھ کر ڈر گئے اور مجھے بھول گئے۔ اس لیے جب کوئی بھیانک شرارت کسی سے سرزد ہو جاتی تو اماں چھپا جاتیں، یا اگر سامنے ہوتے تو اس سے پہلے کہ ابا کو طیش آئے وہ خود مارنے لگتیں۔ ابا کی مار کے آگے اماں کی مار پھولوں کی پھوار لگتی تھی۔

اس سفر میں سب سے بڑا المیہ میری جان پر بیت رہا تھا۔ مجھے پہلی بار برقع اوڑھنا پڑا تھا اور بتا نہیں سکتی کہ احساس ذلت نے مجھے کئی بار ریل کی پٹڑی پر کٹ جانے کی صلاح دی۔ میں سخت کوفت میں مبتلا تھی۔ عظیم بھائی ان دنوں "قرآن و پردہ"، "حدیث و پردہ" لکھ کر کافی ہنگامے کھڑے کر چکے تھے۔ پردے کی مخالفت اور موافقت میں زور شور کی بحثیں چل رہی تھیں۔ بیگم عطیہ فیضی، زہرہ فیضی، بیگم ہمایوں مرزا اور چند منچلی بیبیوں نے بمبئی میں کانفرنس کے اجلاس میں جہاں عورتوں کا آنا قطعی منع تھا ہلہ بول کر ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ حالاں کہ وہ برقعے پہنے ہوئے تھیں مگر پھر بھی مسلمانوں نے سخت ہتک محسوس کی تھی۔ اور اگر یہ خواتین بارسوخ تعلیم یافتہ اور دولت مند طبقے سے نہ ہوتیں تو ان کی مٹی پلید کر دی گئی ہوتی۔ اِن خواتین نے نہ جانے کتنے کچے ذہنوں سے پردے کا تصور

جلا کر راکھ کر دیا ہوگا۔ عظیم بھائی پردے کے سخت مخالف تھے۔ اپنی بیوی کو وہ برقع اوڑھنے سے منع کرتے تھے مگر سارا گھران کی بیوی کی طرف ہوجاتا اور وہ چت ہوجاتے۔

ایک دن انھوں نے اپنے دوست خواجہ محمد اسحاق کو اپنے کمرے میں لاکر بیوی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بھابی جان آداب!" اسحاق بھائی نے نیچی نظروں سے شرماتے ہوئے کہا۔ دلھن بھابی چیخ مار کر سرپٹ بھاگیں اور اماں سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ عظیم بھائی کی طلبی ابا کے دربار میں ہوئی کیوں کہ اماں اڑ گئیں کہ اگر اس نامراد آوارہ مزاج کی خبر نہ لی گئی تو وہ بھوک ہڑتال کر دیں گی۔

"کیوں بھئی کیا قصہ ہے؟" ابا نے عظیم بھائی کی طرف نظر ڈالے بغیر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں سرکار" عظیم بھائی کھانستے ہوئے بولے۔ گزشتہ رات انھیں دمہ کا دورہ پڑچکا تھا۔

"تم نے پھر سویٹر نہیں پہنا بے وقوف۔"

"سرکار بھی اُتارا ہے بہت میلا ہوگیا تھا۔"

"لو دیکھو لاڈلے کو پھر سر چڑھا رہے ہیں۔"

ابا خاموش اخبار پڑھتے رہے۔

"چولھے میں ڈالو موئے اخبار کو۔" اماں نے اخبار ہاتھ مار کر گرا دیا۔

"افوہ، بھئی بتاؤ نا یہ کیا بیہودگی مچا رہے ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں سرکار۔"

"کچھ بھی نہیں کے بچے۔"

"اماں میں کچھ بھی نہیں کا بچہ نہیں، آپ دونوں کا . . ."

"دیکھ رہے ہو، اماں روہانسی ہوگئیں۔" اس سے پوچھو دلھن کو اسحاق کے سامنے کیوں کیا؟"

"اماں آپ بھی تو اسحاق کے سامنے آتی ہیں۔"

"اے لو اور سنو، اے وہ میرے سامنے کا بچہ ہے۔ مگر دلھن . . ."

"میرے بھائی کی طرح ہے۔ آپ کی دلھن کا دیور ہے۔"

"بس بک بک نہ کر، میں کہتی ہوں کچھ کہتے کیوں نہیں؟" اماں پھر ابا پر حملہ آور ہوئیں۔
"کیوں بھئی تم نے پردہ کیوں تڑوایا؟"
"کس کا؟"
"دلھن کا۔"
"دلھن میری بیوی ہے اور مجھے حق حاصل ہے چاہے پردہ رکھواؤں یا تڑواؤں۔"
"ہمارے گھر میں یہ نہیں ہوگا سمجھے؟" اماں براہ راست لنگر سنبھال کر میدان میں آگئیں۔
ابا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو میں کل ہی اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ ایک کمرہ خالی ہے ان کے پاس ہم میاں بیوی اور دونوں بچے۔"

"نزہت نہیں جائے گی۔" اماں نے اپنی پوتی نزہت کو ذرا سی تھی تب سے پالا تھا۔ اور وہ دادی کے ساتھ سوتی تھی، کبھی بھولے سے بھی ماں باپ کی طرف نہیں جاتی تھی، وہ دادی کو اماں ماں کو دادی کی نقل میں دلھن اور باپ کو بھائی صاحب کہتی تھی۔ اسے معلوم بھی نہیں تھا وہ دادی کی نہیں دلھن کی بیٹی ہے۔ ذرا بیماری مسکین بچی تھی ہر دم اماں اور ابا سے لپٹی رہتی تھی۔

"میں جاؤں گا تو بچے بھی جائیں گے۔"

"ارے جا مر کھپے بڑا آیا بچوں کا سگا، پالا ہم نے اور حق تو جتانے بیٹھ گیا۔ سب جانتے تھے دلھن چھوڑیا سے بچے نہیں سنبھلے۔" چھوٹی بیٹی مدحت کو منجھلی باجی اپنے ساتھ دے جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں، شادی میں شرکت کر کے لڑکی کو دے لیں گی۔ دلھن بھابی پورے دنوں سے تھیں ایسی حالت میں الگ مکان میں کیسے گذر ہوگی۔ عظیم بھائی ایل ایل بی کر رہے تھے اور ساتھ میں تالوں کے کارخانہ میں پینتالیس روپیہ ماہوار پر کلرکی بھی کر رہے تھے اور پھر ان کی بیماری۔

اماں رونے لگیں، ابا بے چین ہو گئے۔

"نہیں دلھن کا پردہ نہیں ٹوٹے گا۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ وہ تمہارے ساتھ نہ رہے۔ اسے الگ کمرہ دے دیا جائے گا۔"

"اگر وہ میرا حکم نہ مانے گی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔"
"کیا بک رہے ہو گدھے۔" ابا غرائے۔
"تو میں کیا کر بیٹھیں کونے کر...."

"تو نکل جا یہاں سے دلھن اور بچے نہیں جائیں گے۔" اماں نے فیصلہ کیا۔

"بس کوئی نہیں جائے گا۔ کل ہی دمہ کا دورہ پڑا اور قمیص پہنے گھوم رہا ہے۔"

اماں اپنی ہار پر بھناتی ایک دم اٹھ کر دندناتی چل دیں۔

اس کے بعد سُنا دلھن کے میکے بھی اڑتی اڑتی خبر پہنچی۔ دلھن بھابی باجی کے جیٹھ کی بیٹی تھیں اور وہی انھیں بھاوج بنا کر لائی تھیں۔ انھوں نے فوراً اس خبر کو جھٹلا دیا کہ کوئی پردہ نہیں ٹوٹا ہے۔ سب لوگوں کی اُڑائی باتیں ہیں۔"

کیوں کہ دلھن بھابی کے بھائیوں نے کہا تھا اگر ہماری بہن بے پردہ کی گئی اور اُسے سر بازار نچایا گیا تو وہ بہن اور بہنوئی کی گردنیں اُڑا دیں گے۔ عظیم بھائی اس ہنگامے سے کچھ دب گئے۔ مجھے تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں غصہ اور لاچاری سے بے حال دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ سب برقع کی وجہ سے ہوا، کیونکہ جب میں نے برقع اوڑھا تو میرے بدذات بھائیوں نے خوب قہقہے لگائے اور میں ان سے بھڑ گئی تو اماں نے انھیں کچھ نہ کہا میرے ہی دھول جڑ دی۔ بڑی ہتھ چھٹ تھیں میری اماں۔

انھوں نے میری کھڑکی کے پاس آکر چپکے چپکے مجھے سمجھانا شروع کیا اور میں سمجھ گئی جودھپور کا اسٹیشن آنے لگا تو نوکروں کو بُلا کر بستر بندھوائے جانے لگے۔ سب بستر ایک ہاتھی نما پلندے میں۔ جمع کرکے اوپر سے رسّی کا جال باندھ دیا گیا۔ اس طرح بڑی کفایت ہو جاتی ہے دس بستروں کے دو بنا دیے گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا لحاف توشک بھی تھے اگر الگ الگ بستر ہوتے تو قلیوں کو بہت پیسے بھرنا پڑتے۔

اب اسٹیشن آیا اور سب برقعے پہننے لگے تو میرے برقعے کی کیپ غائب، نیچے کا کوٹ سا رہ گیا تھا جو میں نے نہایت فرماں برداری سے پہن لیا تھا اور بڑی تندہی سے اوپر کا حصہ ڈھونڈ رہی تھی جب نہ ملا تو اور سب بھی میری مدد کرنے لگے۔

"شاید بڑے بستر میں بھولے سے بندھ گیا۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"کمینی کمبخت، چاروں طرف سے دھموکے پڑنے لگے۔" تو نے جان بوجھ کر ٹھونسا ہوگا۔

میں نے وہ گھونسے لڈوؤں کی طرح نگل لیے۔ مجھے معلوم تھا آدھ گھنٹہ میں رسّی کا جال بندھا ہوا بستر کھولنے کا سوال ہی نہیں اُٹھ سکتا۔ مجھے ایک چادر اُڑھا دی گئی اور میں ایک جانباز فاتح کی طرح پلیٹ فارم پر اُتر گئی۔ عظیم بھائی سے آنکھیں ملیں وہ اتنی زور سے ہنسے کہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

میں نے بھی اپنی ہنسی مصنوعی کھانسی میں گھونٹ دی۔ چادر بار بار پھسل جاتی اور میرے اوپر گھونسوں اور چٹکیوں کی بوچھار ہونے لگتی۔

مگر فتح کا نشہ جس نے چکھا ہے وہی وہ لمحے جی سکتا ہے جو میں اس دن پلیٹ فارم پر کھلے مُنہ جی رہی تھی۔ جلد ہی لوگوں کو محسوس ہونے لگا کہ اس ہٹ دھرمی کی چنگاری کو عظیم بھائی نے ہوا دی ہے بلکہ انھوں نے ہی ماچس لگائی تھی کیونکہ وہ پیغام جو بنا تار برقی میری ان کی نگاہوں کے درمیان چل رہا تھا جلد ہی واضح ہوگیا۔

اسٹیشن پر ماموں مع دوستوں اور رشتہ داروں کے ہمارے سواگت کو موجود تھے۔ ہمارے تایا ابراہیم بیگ چغتائی، اُف بھول ہوئی، میرزا لگانا بھول گئی۔ بارہا بڑے ابا ہمیں اسی لفظ میرزا اور چغتائی کی عظمت اور شان پر مدلّل لکچر دے چکے تھے۔ ہمیں کسی حالت میں بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم چنگیز اعظم کی اولاد میں سے ہیں اور چغتائی خان چنگیز کا بیٹا تھا۔ اور میرزا، یہاں دو نکتے بڑی اہمیت رکھتے ہیں خالی مرزا سے بات نہیں بنتی، یہ لفظ میرزاوہ خطاب تھا جو میرے جدا مجد نے کشتوں کے پشتے لگا کر اور خون کی ندیاں بہا کر حاصل کیا تھا۔ گائے بکری کا ذکر نہیں یہاں انسانی کھوپڑیوں کے میناروں اور گھوڑوں کے سُموں کا ذکر خیر ہے جو انسان کے خون میں ڈوبے تھے۔

یقیناً یہ میرے ننہال کے شیخوں کا پھیکا پتلا پانی خون ہے جو فخر سے کھول اٹھنے کے بجائے کم ہمت اور ڈرپوک چوہے کی رطوبت کی طرح میری آنکھوں میں چھلک آتا ہے۔

میری بڑی مصیبت تھی۔ ننہال کی طرف سے میرا ناطہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا تھا اور ددھیال کی طرف سے انسانی کھوپڑیوں کے میناروں اور خون کے ندیوں سے۔ یہ کیا گھپلا کر دیا تھا میرے ابا نے شیخوں میں شادی کر کے۔ ہاں تو ہمارے بڑے ابا اور ہماری اماں کے ماموں ظہور نانا پہلے سے جودھپور پہنچ گئے تھے وہ ماموں کے بلاوے پر گئے تھے اس لیے یہاں سے بھیجے ہوئے پوسٹ کارڈوں کے پھندے میں نہیں پھنسے تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر عظیم بھائی اور نسیم بھائی پر اوس پڑگئی۔ یہ بزرگ خاندان کے بس کیا بتائیں کیا مانے جاتے تھے۔ اماں اور ابا دونوں ان سے بے انتہا مرعوب تھے اور وہ رعب ورثے میں ہمیں تھمانے پر مصر تھے۔

ان دونوں بزرگوں کے پرنور چہرے اور لباس سے ان کی آبائی شان نمایاں تھی۔ ظہور نانا نہایت سفید براق کپڑوں اور سفید مقدس داڑھی کی وجہ سے کوئی پیر مُرشد لگتے تھے۔ میں نے کبھی انھیں

ململجے شکن دار کپڑوں میں نہیں دیکھا سفید شرعی ٹخنوں سے اونچا پاجامہ سفید انگرکھا اور حکیموں جیسی ٹوپی، دور ہی سے ان میں سے بھینی بھینی کافور کی سی خوشبو آتی تھی، انھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں ہم کمبختوں کو قبرستان یاد آجاتے تھے، کہ قبرستان ہی آخری منزل ہے انسان کی پرسکون سرسبز پیڑوں کی چھاؤں میں بسے خاموش قبرستان!

بڑے ابّا اکثر کچھ اَن جانے قسم کے امراض میں بتلا رہتے تھے اِس لیے بہت کم، اکثر ہفتوں نہیں نہا پاتے تھے جس دن ان کے نہلانے کو حجّام آتا تھا، اور گرمی سردی ہر موسم میں بڑے تیلے میں پانی گرم ہوتا تھا تو وہ بے انتہا فکرمند بلکہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ بار بار سب کو یاد دلاتے تھے۔

"آج مجھے غسل کرنا ہے" جیسے لام پر جانا ہو۔

غسل کے بعد وہ اتنے خوبصورت اور گورے نکلتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ بڑے ابا تو بالکل انگریز ہیں۔ پھر چند ہفتوں بعد وہ پھر بھورے پڑ جاتے تھے، مغلوں کے بارے میں ان کے خیالات بہت کچھ ہٹلر کے جرمن قوم کی برتری کے فلسفے سے ملتے تھے۔ مغل سے برتر، بہادر، انصاف پسند، عالم، منکسرالمزاج، دریا دل وغیرہ وغیرہ ــــ اور کوئی قوم دنیا کے پردے پر نہیں۔ اور بڑے ابا نہایت ہی مکمل اور کھرے مغل تھے کیوں کہ شہنشاہ تیمور کی طرح ان کے پیر میں بھی پیدائشی لنگ تھا۔

بڑے ابّا جس دن نہا کر سیاہ چوگوشیا ٹوپی اور نسواری رنگ کا چوغہ پہنتے تھے تو بالکل بہادر شاہ لگتے تھے۔ سنتے ہیں جوانی میں وہ اتنے حسین اور طرحدار تھے کہ لوگ انھیں گذرتا دیکھکر ٹھٹک جہاں کے تہاں کھڑے رہ جاتے تھے۔

چار بجے بری جانا تھی، پچیس تیس خوان مع زرنگار خوان پوشوں کے ماموں نے درباری توشہ خانہ سے نکلوا کر بھیج دیے۔ اماں نے پانچ من میوہ، مصری ان تھالوں میں سجوائی، بادام، پستوں، کشمشوں اور ثابت کھوپرے کے تھال۔ ایک بری کا جوڑا، ایک سہاگ کا جوڑا، زیور اماں نے آپا کی حفاظت میں دے دیا۔

بری باجے گاجے سے گئی۔

ہم لوگ بھی پہنچے۔ اماں دلھن کی اکلوتی سگی پھوپھی بھی تو تھیں، لہٰذا دونوں ماموؤں نے انھیں سجات دیا، بہنوں کو دوپٹے، بہوئیوں کو صافے، جو بہنوں نے پھاڑ کر آخر میں دوپٹے بنا ڈالے اور کمینوں!

کے جوڑے، اماں ابا کو جوڑا، اماں کو سونے کی چوڑیاں۔

"اور بری میں بھی تو میرا حصہ ہے۔" اماں نے کہا۔

ایک تھالی میں دس بارہ بادام چھوارے ایک ناریل اور تھوڑے سے پستے اور کشمش ممانی جان نے لاکر رکھ دی۔

"اوئی۔ بس میں اکلوتی پھوپھی اور یہ موا جھنکتا میرا حصہ، میں تو پورا استعمال لوں گی۔" اماں اڑ گئیں۔

ممانی جان ماموں کی دوسری بیوی تھیں، پہلی بیوی شوکت آپا یعنی دلھن کی ماں تو انھیں ذرا سا چھوڑ کر مرگئی تھیں۔

"آپا دودو دانے شگن کے سب ہی کو بانٹنے ہوتے۔"

"ماشاء اللہ پانچ من بری لائی ہوں، دو دو دانے کی بھی اچھی کہی۔"

"پانچ من؟"

"ہاں ہاں، تمہارے رجو میاں ہی لائے اور میں نے اپنے ہاتھوں سے بیس تھال بھرے۔"

"ایک من شکر، ایک من لڈو اور تین من میوہ۔ مزدورنیوں کی گردنیں ٹوٹی جارہی تھیں۔"

"آپا کمرے میں چل کے دیکھ لو بری۔"

کمروں میں تھالوں پر سے خوان پوش اٹھائے تو دس بارہ ناریل لڑھک رہے تھے دو چار سیر سوکھا میوہ اور بیس پچیس لڈو۔

"ہے ہے لوگو یہ کیا اندھیر ہے۔ پوری پانچ من بری لائی اور . . . " خوب کائیں کائیں ہوئی اماں نے جان لیا کہ ممانی جان نے ساری بری اپنے میکے گلاب ساگر پار کردی، بڑی تلخیاں پیدا ہوئیں۔ ممانی جان بے انتہا روزے نماز کی پابند صبح کئی گھنٹے تلاوت قرآن اور آٹھ وقت کی نماز پڑھتی تھیں، نہایت نازک بدن حسین، بے انتہا لمبے سیاہ بال، صورت کچھ حضرت مریم سے ملتی جلتی، کونے میں بیٹھی خاموش آنسو بہارہی تھیں۔ اماں نے سارے سمدھیانے کو بے نقط سنائیں۔ نہ جانے اتنی سیدھی سادھی اماں اپنے سے زیادہ بھولی عورت کو دیکھتیں تو ان کی رگ بھڑک اٹھتی اور بے حد غضبناک ہوجاتیں۔ ماموں انھیں بے انتہا چاہتے تھے، جان چھڑکتے تھے، انھیں جب پتہ چلا کہ بیگم نے بری میکہ پار کردی تو تلوا لیں سونت لیں۔ جب سمدھنیں رخصت ہوگئیں تو انھوں نے ان کی خبر لی۔ ان کی میکہ والیاں پہلے ہی سٹک لی تھیں۔ انھوں نے اپنی بیوی اور سسرال کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ممانی جا[illegible] لالٹین جلائے رات بھر

تلاوت قرآن کرتی رہیں۔ ماموں زہر اگلتے رہے اور وہ غٹاغٹ پیتی رہیں۔ چور ڈاکو نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا، اُف نہ کی۔

"ڈھٹائی کی انتہا ہے۔ نمازوں اور تلاوتوں سے گناہوں کی سیاہی دھونے سے کیا فائدہ، تم نے میری بہن کا دل دُکھایا، میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

اور وہ نیچے جاکر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اب دوسرے دن برات چڑھی۔ ماموں نے اپنا پورا رسوخ استعمال کر کے مہاراجہ کے خاص ہاتھی اور کوتل گھوڑے، چاندی سونے کے زیور سے جھم جھماتے سب سفید ایک قد کے عربی گھوڑے، اور دس سیر سونے کا جھومر اور بیس سیر کی پازیبیں پہنے زردوزی کام سے مرصع جھول پہنے ہاتھی، تخت رواں، یعنی ایک تخت پر ایک حسین اپسرا رقص کرتی ہوئی، قدم قدم پر برات رک جاتی، تخت زمین پر رکھ دیا جاتا اور رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔

دولھا کے گھوڑے کا تو جواب ہی نہیں تھا، بس جیسے سونے کا ڈلہ دونوں طرف دو مورچھل بردار پیچھے چھتر بردار۔

مگر دولھا دولتیاں جھاڑ رہا تھا۔ کوئی کم خواب کی اچکن فٹ نہ بیٹھی، پہن کر سینہ پھلاتے کندھے جھٹکتے اور ٹیڑھے میڑھے پر سے اچکن پھٹ جاتی۔ اتفاق سے کئی اچکنیں بھجوادی تھیں ماموں نے توشہ خانہ سے، اور کوئی فٹ نہ بیٹھی۔ آخر میں یونی ورسٹی کے یونیفارم کی اپنی کالی اچکن پہن کر دولھا بنے۔ بنارسی پیلے کا صافہ بندھتا ہی نہیں، بار بار پھسل کر گردن میں۔ خیر ایک سوتی گلابی صافہ باندھ لیا۔ سہرے پر تو بری طرح بدکے اور ہار کی طرح گلے میں ڈال لیا۔

اِدھر عظیم بھائی کی بڑی مصیبت، دولھا کے اچکنیں تنگ اور ان کے اتنی ڈھیلی کہ دو آدمی سما جائیں۔ خیر انھوں نے دو سوئیٹر پہن کے ایک اچکن جگمگاتی ہوئی ڈانٹ لی اور بڑی کوششوں سے دولھا کا رد کیا واسلہ بٹنوں سے چپکا کر پہن لیا۔ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر دوسروں کی ہنسی کا راز سمجھ کر خود بھی ہنسے۔

بارات کو سارے شہر میں گشت لگا کر دلہن کے دروازے پہنچنا تھا۔ نسیم بھائی نہایت مشاق تھے چار قدم چلے تھے کہ گھوڑا بدکنے لگا۔ جلوسوں کا عادی مسکین گھوڑا شیر غراں بن کر الف ہو گیا اور کبھی آگے بڑھتا کبھی دولتیاں جھاڑتا۔ ساتھ میں سات قسم کے بینڈ تھے وہ باری باری اپنا فن دکھا رہے تھے مگر گھوڑا برات کا پیرایہ دیے رہا تھا۔ مدعو یعنی ہم لوگوں کو گھوڑے کے بگڑنے کی اطلاع مل

رہی تھی، ہم سب سے پیچھے موٹروں میں تھے۔

"یہ ننھے بدمعاشی کر رہا ہے" بڑی آپا بڑبڑائیں۔

"اے نہیں ایسا بھی کیا، کوئی دیوانہ ہے کہ برات کو لوٹ دے گا" اماں نے کہا۔

"ارے یہ سب منے فساد کی جڑ ہے اس نے سکھا دیا ہوگا دیکھو سب پریشان ہیں منے کھانس رہا ہے" یعنی ہنسنے کے ساتھ انھیں ہمیشہ کھانسی آجاتی تھی۔

اور پھر اندھیر ہوگیا۔ دولھا گرتے گرتے سنبھلا اور گھوڑا تیر کی طرح بارات چھوڑ یہ جا وہ جا۔ مورچھل والے ہکا بکا، چھتر بردار مجسم حیرت۔

خیر بغیر دولھا کے بارات اپنی چیونٹی کی چال چلتی رہی دور سے زیادہ پتہ بھی نہیں چل رہا تھا کہ مورچھل اور چھتر خلا میں تنے ہوئے ہیں دولھا نہیں ہے۔ ادھر ماموں شہر کے رؤسا اور چھٹ بھیّوں یعنی چھوٹے موٹے راجاؤں کے ساتھ جگمگاتے گیٹ پر ہار پھول لیے منتظر کھڑے تھے کہ دولھا حیران پریشان یکایک گھوڑے پر سوار عین دروازے کے سامنے ساکت ہو گیا۔ دولھا جست مار کر اترا اور ہانپتا کانپتا سیڑھیوں پر لڑکھڑاتے قدموں سے چڑھنے لگا۔

"ماموں ماموں، بس اللہ نے بچا لیا ورنہ یہ شیطان کا بچہ آج میرا کچومر نکال دیتا۔ نہ پوچھیے راستے بھر کیا ناکوں چنے چبوائے ہیں"

"بارات!" سواگت کرنے والوں نے پوچھا۔

"آ رہی ہے پیچھے" دولھا نے سیڑھیوں کا سہارا لے کر فرضی پسینہ پونچھا۔

ماموں ایسے ناسمجھ نہ تھے وہ ننھے بھائی کی سواری کے کرتب بارہا دیکھ چکے تھے۔ ایک دم اچھی خاصی چال چلتے چلتے وہ ایسا گھوڑے کو اچھالتے کداتے کہ چک میں سے دیکھتے ہوئے اماں چیخیں مارنے لگتی تھیں۔

"ارے بیگم ننھے کرتب دکھا رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہے اس پر گھوڑا سوار نہیں"

مگر اماں کہتیں خدا کے لیے روکو، میرا دم نکلا جاتا ہے۔

"پانچ روپے" ننھے بھائی گھوڑا روکنے کی قیمت لگاتے۔

"چل سور ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دوں گی"

اور کبھی دو کبھی تین پر سودا ہو جاتا اور ننھے بھائی چک کے پاس آتے۔

"لاؤ اماں"

"پہلے نیچے اُتر۔"

"نہیں پہلے روپے دو نہیں تو اندر چڑھا لاؤں گا گھوڑا۔"

"اے ہے کمینے رکتے، سؤر۔" اماں گالیاں دیتیں اور روپیہ چک سے باہر پھینک دیتیں اور ننھے بھائی ایک بار گھوڑے کو اچھالتے ایسے اترتے جیسے گھوڑے نے پٹخ دیا۔ اماں چیخ مارتیں وہ لپک کر روپے بین کر بھاگ جاتے۔

"ہاں ہاں وہ مجھے دہلاتے، ڈراتے تم بنو، اس کی پیٹھ ٹھونکو۔" اماں ابا کو مسکراتا دیکھ کر کہتیں، اور ابا چور سے رہ جاتے۔

نکاح کے وقت ظاہر ہے ظہور نانا اور بڑے ابا کھنکار کر قاضی کے قریب کھسک آتے ننھے بھائی نے دونوں کو بڑے پیار سے دیکھا۔

"ارے آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں، حدیث میں لکھا ہے داڑھی والے نکاح میں گواہ یا وکیل نہیں بن سکتے۔"

دونوں بزرگ سکتہ میں رہ گئے۔ ابھی چند منٹ پہلے بڑی عالمانہ بحث ہو رہی تھی کہ آج کل کے کلین شیو نوجوان کی نماز واجب ہوتی ہے یا مکروہ!

فیصلہ ہوا تھا کہ مکروہ ضرور ہوتی ہوگی۔

لہٰذا دولہا اڑ گیا کہ گواہ داڑھی کے ساتھ تو نہیں بن سکتا۔ اگر..."

نہ پوچھیے کیا حالت ہوئی، نکاح تو ہونا ہی تھا، چھوٹے ماموں اور عظیم بھائی گواہ اور وکیل بنے۔ خیر سے نکاح ہوا۔

اماں بے بسی سے روتی بسورتی دلھن کو لے کر آگئیں۔ علی گڑھ پہنچے تو بم پھٹا۔ نسیم اور عظیم نے چند صندوق ابا کے سامنے رکھ دیے۔

"ان میں کیا ہے، ہم جہیز نہیں دیکھنا چاہتے، یہ جاہلانہ رسم ہے۔ باپ ماں نے جو کچھ بیٹی داماد کو دیا اس سے ہمیں کیا واسطہ۔"

"یہ جہیز نہیں ہے سرکار۔"

"پھر کیا ہے؟"

"مالِ غنیمت!" یہ کہہ کر صندوق کھولے جو پستہ بادام، مصری کے کوزوں اور شکر کے تھیلوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"یہ پانچ من کی بَری امّاں نے چڑھائی تھی۔ جب مزدورنیاں لے کر نیچے اُتریں تب ہمیں پتہ چلا۔ ہم نے سب نکال کر ذرا ذرا سا ملا کر آدھا من مال چھوڑ دیا۔"

امّاں اس وقت باورچی خانہ میں تھیں۔ انھوں نے ابّا کی آنکھوں میں جگمگاتے جگنو نہیں دیکھے۔

"بیگم نے دیکھ لیا تو۔"

"نہیں ہم اسے آپ کے پچھلے کمرے میں چھپا کر تالا ڈال دیں گے۔ صندوق بند کر دیے گئے۔"

"ہوں، تمہارے ولیمہ میں کام آجائے گا یہ میوہ اور شکر۔"

"مگر گاجر کا حلوہ بنے پہلے تھوڑا۔"

اور جب ننھے بھائی نے کہا۔

"اماں یہ میوہ اور شکر میرے دوست فیّاض نے بھیجا ہے کہ گاجر کا حلوہ جیسا آپ بناتی ہیں ویسا کوئی باورچی بھی نہیں بناتا۔"

حلوہ بنا، نواب صاحب کو بھی بھیجا گیا۔ دوستوں نے اڑایا۔ کافی دن بعد اماں کو حقیقت معلوم ہوئی تو سر پیٹ لیا۔

"ہائے میرے پروردگار میں نے اپنی فرشتہ صفت بھاوج پر دوش لگایا، یا خدا میرا قصور بخش دے۔ ارے لوگو! میں کیا کروں، اِس سے تو میں کوکھ ہی بانجھ ہوتی۔ ایسی اولاد سے تو ۔ ۔ ۔ ۔"

ننھے بھائی نے ہاتھ جوڑ کر سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

"لو اماں جی بھر کے مارلو۔"

مگر اماں نے رکھائی سے اپنے پیر سمیٹ لیے اور منہ موڑ لیا۔

ننھے بھائی کا منہ اُتر گیا۔

"منّے! اماں سچ مچ خفا ہو گئیں۔" اماں مار لیتیں تو بوجھ اتر جاتا۔ منے بھی فکرمند ہو گئے۔

شادی ننھے بھائی نے اس شرط پر کی تھی کہ ایل ایل بی تک سارا تعلیم کا بوجھ سرکار کی طرف اور روٹی کپڑے کے علاوہ تیس روپیہ میاں بیوی کا جیب خرچ۔

"بس اب چھ مہینے جیب خرچ نہیں ملے گا ننھے۔"

"کیوں؟"

"اس بدمعاشی کی سزا میں۔"

"اسے ہوش میں، پڑھنے والا لڑکا . . . اور پھر نئی دلھن - میرے جیتے تو یہ ناانصافی نہ ہوگی۔"
ماں بھی عجیب گورکھ دھندہ ہوتی ہے۔ ابا سوچنے لگے۔ نہ اس کی نفرت کا بھروسہ نہ محبت کا۔

دوسرا باب بھیج رہی ہوں، میں ذہنی یادداشت اور خاندان کے بزرگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں کو جنھوں نے مجھے متاثر کیا اور ہر ایک طبقے کی الجھنوں نئے سوالوں اور ان کے حل کے مسائل۔ ایک عجیب الجھی ہوئی سی چیز ہے۔ جو چیز جب بھی تیار ہو جائے گی بھیجتی رہوں گی، اسے مختلف عنوانوں سے چھپنے دیجیے تسلسل بعد میں ایڈٹ کرتے وقت قائم ہو جائے گا۔"
(عصمت چغتائی)

# تصادم

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جتنا مشکل چڑھنا ہے اس سے زیادہ مشکل اُترنا ہے۔ آگرہ کے اسٹیشن پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اوپر سے سودے والے اُلا بلا آنکھوں کے سامنے نچا رہے تھے جھانجھ بجاتی گڑیاں، ڈگر ڈگر تار کی گردن کے چھلوں پر ہلتا بُڈھا، گجریاں، پاپڑ، تِل کے لڈو، تاج محل کھریا کے بنے، اور اناپ شناپ۔ پھر پیچھے سے باہر نکلنے والے ڈھکیلتے ہیں اور سامنے سے بڑے گٹھر، گنوں کے بنڈل، اُسے کیا کہا جائے جو بہت سے ٹیڑھے میڑھے گتے معہ پتوں کے رسی سے باندھ کر ریل کے ڈبے میں مسافر داخل ہونے سے پہلے ٹھونستا ہے خود دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ایک لمبے سے بانس میں یا شاید دو بانسوں میں صراحیوں کی ٹکٹکی، پھر مہکتی عورتیں پگڑ باندھے مرد اور چوتے ہوئے بچے۔ یا اللہ!

اوپر سے شوکت آپا۔ پورے دن، زچگی کے ارادے سے آگرے اپنی نانی کے ہاں جا رہی تھیں۔ میری بھی شامت آئی۔ بی۔ اے کے بعد سوچا ذرا چار دن کے لیے آگرہ ہو آؤں۔ شوکت آپا بڑی لاڈلی صورت بنا کر مصر ہو رہی تھیں۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اتنے زور شور سے اصرار کیوں ہو رہا تھا نعیم ان کا ڈھائی برس کا لحیم شحیم بچہ، ڈیل ڈول میں ددھیال پر گیا تھا۔ اسے اٹھانا بس جیسے تڑپتے لاتیں چلاتے بم کے گولے کو اٹھانا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ وہ نہیں پھٹے گا مگر اٹھانے والا ضرور ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔ ان محترم کی عادت تھی کہ اپنے وزن کی جانچ پڑتال سے قطعی نابلد، سوتے ہوئے انسان پر اچانک دھم سے کودنے کے بے انتہا شوقین۔ اس کے علاوہ گھونسے چلانے اور کاٹنے سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ خیر مجھے کاٹنے کی عادت انھیں چھوڑنا پڑی کیوں کہ میں نے جسم کے مختلف حصوں پر نیل گنتے

کے بعد سیلف ڈیفنس میں ان کے منہ میں کونین کے پاؤڈر کی ایک چٹکی جھونک دی بس اس کے بعد انھوں نے آج تک مجھے کاٹنے کی پھر کبھی کوشش نہیں کی۔

خیر صاحب صحیح سلامت اتر ہی لیے میرے پاس تو بس ایک اٹیچی تھی مگر شوکت آپا کئی ماہ کا پروگرام بنا کر آئی تھیں۔

"مجھے مائی تھان اتار دینا۔" تانگہ کھسکا تو وہ بولیں۔

"اتار دینا کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"بس اتار دینا مطلب اتار دینا۔"

"اور میں کہاں اتروں گی؟"

"میں کیا جانوں؟"

"پنجہ شاہی نہیں چلو گی؟"

"اے میں کوئی دیوانی ہوں جو اس وقت جاؤں گی۔ صبح جا کے گھر صاف کرنا ہے۔ کباڑ بھرا ہوا ہے کمروں میں۔ اور منوں خاک الگ، میں تو دو تین دن بعد جاؤں گی۔"

تو میں جاؤں اس کباڑ خانے میں؟

"نہ جاؤ۔"

"تو پھر؟"

"پھر کیا؟"

"شوکت آپا میں بھی پھر کل ہی پنجہ شاہی جاؤں گی یا دو تین دن بعد۔"

"آج کہاں رہو گی؟"

"تمہارے ساتھ!"

"دیوانی ہوئی ہو؟"

"کیوں؟"

"میں تو اماں کے ہاں جا رہی ہوں۔" اماں وہ اپنی نانی کو کہتی تھیں جو بدقسمتی سے میری اکلوتی پھوپھی بادشاہی خانم عرف پھوپھو بی تھیں جنہیں بجائے زبر لگانے کے لوگ زیر لگا کر پکارتے تھے۔ (ان کی پیٹھ پیچھے) انھیں میں نے اکثر رحمٰن بھائی کے کوٹھے کی کھڑکی سے جو ہمارے صحن میں کھلتی تھی نہایت بلند و بالا آواز میں میرے پورے خاندان کو کوستے اور گالیاں دیتے ہی دیکھا تھا۔ ان

کی میرے ابا سے بے حد مغلانہ قسم کی جنگ میری پیدائش سے بہت پہلے سے چھڑی ہوئی تھی۔
بڑی باقاعدگی سے پھوپھی اماں رحمٰن بھائی کے ہاں کھڑکی میں بیٹھ جاتیں اور گولہ باری شروع ہوجاتی۔ اماں اور ابا مع سمجھدار افراد کے فوراً خندقوں میں یعنی برآمدے کی آڑ میں چھپ جاتے۔ ہم چند چھوٹے بچے کھڑکی کے نیچے کھڑے منہ اٹھائے حیرت سے انھیں دیکھا کرتے۔ نہ وہ کبھی ہمارے ہاں آئیں اور نہ کبھی ہم گئے۔ صرف ابا میاں عید بقرعید کو پابندی سے مائی بہن سے عید ملنے جاتے تھے، ساتھ صرف جوان لڑکوں کو لے جاتے تھے جو عید کی نماز پڑھنے ساتھ جاتے تھے۔
یہ عجیب لڑائی تھی جیسے عام جنگ میں کرسمس پر جنگ بندی لاگو ہوجاتی ہے۔ اسی طرح عید کے دن بھی اعلان صلح ہوجاتا اور ابا ضرور جاتے۔ پھوپھی اماں اندر پردے میں ہوجاتیں، ابا صحن میں بیٹھ جاتے اور دونوں طرف سے جلے کٹے جملوں اور طعنوں کا تبادلہ ہونے لگتا۔ پندرہ بیس منٹ تک دھواں دھار گولہ باری ہوتی رہتی۔ پھوپھی اماں کوستیں اور روتیں ابا میاں چٹکیاں بھرتے اور قہقہے لگاتے۔
بچپن میں تفصیل سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا تھا کہ ابا جاتے کیوں ہیں؟ کیوں کہ اماں کہتی تھیں پھوپھی اماں کی گالیاں کوسنے ہمارے خاندان کو بے طرح راس آتے ہیں۔ ان کے کوسنے کی ہی برکت تھی کہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ایک بچہ تک نہ مرا، ادھر پھوپھی کے تیرہ چودہ کچے پکے بچوں میں بس حشمت خانم جنھیں سب خانم صاحب کہتے تھے زندہ تھیں، ان کی بڑی بہن مسرت خانم یعنی میرے بڑے ماموں ظفر حسین کی بیوی کا انتقال جب ہی ہوگیا تھا جب شوکت آپا سال دو سال کی ہوں گی۔
"ہے نامراد میت پیٹا ظفر حسین میری بچی کو کھا گیا" پھوپھی اماں رحمٰن بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر دہرانا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔
"ظفر ماموں مسرت ممانی کو کیوں کھا گئے؟" میں نے باری باری سب بزرگوں سے پوچھا۔ مگر ہمارے ہاں بزرگ بچوں کے سوال کا جواب کب دیتے تھے۔
"اے بس غارت ہو، جان نہ کھاؤ" ساتھ میں اگر ہاتھ لگ گئے تو ایک آدھ دھوکہ۔
اور میں جو عجیب اور بھیانک خواب دیکھ کر راتوں کو چیخنے چلانے کے مرض میں بچپن سے مبتلا رہی ہوں بری طرح سہم جاتی تھی۔

بڑے ماموں بے حد جامہ زیب گورے چٹے اور وجیہہ تھے۔ سونے کے رنگ کے بہت گھنے اور گھنگریالے بال، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، ہموار موتیوں جیسے دانت، ہم سب کیلئے مٹھائیاں اور کھلونے لاتے تھے بیحد لاڈ کرتے تھے۔ وہ خود جودھپور میں رہتے تھے ان کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے مظہر حسین رہتے تھے، ان سے چھوٹے اظہر حسین جو شوکت آپا سے دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے۔ ہمارے ہاں بچپن سے رہتے تھے اور شوکت آپا بھی چھوٹی تھیں تو ہمارے ہاں ہی رہتی تھیں۔ سال میں ایک دو بار ماموں اور مظہر بھائی آیا کرتے تھے اور ان کی آمد پر گھر میں خوب رونق رہتی، دعوتیں ہوتیں۔ اماں انھیں بے انتہا چاہتی تھیں، چھوٹے ماموں فرحت حسین سے بھی زیادہ۔

ٹھیک ہی کہتے ہوں گے سب کہ میں کچھ دیوانی سی تھی۔ جب ماموں قہقہہ مار کر ہنستے اور ان کے سفید دانت چمک اٹھتے تو میرا تخیل مجھے لے اڑتا۔ میرا چھوٹا بھائی چنو بھی میرا ہم خیال تھا ہم دونوں اکیلے میں ماموں کے تیز دانتوں پر تبصرہ کرتے۔ کیسے ممانی کو کھایا ہوگا، پہلے انگلیاں چبائی ہونگی۔ ہڈیاں تھوکتے گئے ہوں گے۔ کیا انسان کی ہڈیوں میں گودا ہوتا ہے؟ چنو بڑا ظالم تھا۔ کافی چھوٹا تھا جب ہی دوپہر کو ڈلیا کی پھٹکی لگا کر چڑیا پکڑتا، اس کی گردن مروڑ کر توڑتے وقت اللہ اکبر ضرور کہتا کیونکہ ابا میاں کہتے تھے شکار پر گولی چلاتے وقت اللہ اکبر کہہ لینا چاہیے تاکہ ہرن ذبح کرنے سے پہلے دم توڑ دے تب بھی حلال رہے۔ اللہ اکبر کی برکت جیسے چھری ہیں ویسے گولی میں شکار کو تو مرنے سے غرض۔ چڑیا کو نارنگی کی طرح چھیل کر کچی چبا جاتا تھا۔ میں نہایت پھُس پھُسی تھی چونکہ میں لڑکی تھی اس لیے مجھے ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔

چنو بڑی تفصیل سے ماموں کے دانتوں کی کارگذاریوں پر تبصرہ کرتا اور مجھے اُبکائیاں آنے لگتیں۔ نہ جانے کب مجھے معلوم ہوا کہ وہ دق میں مری تھیں ماموں نے کھایا نہیں تھا انھیں۔ پھوپھی اماں شاعرانہ تشبیہیں استعمال کرنے کی عادی تھیں۔

راستے بھر میں اور شوکت آپا لڑتے رہے وہ کہتی تھیں اگر میں نے پھوپھی اماں کے گھر میں قدم رکھا تو قیامت آجائے گی۔ میں مغل بچی قیامت دیکھنے سے بھلا کیونکر باز آسکتی تھی۔

"اور جو انھوں نے نکال دیا"

"کیسے نکالیں گی۔ دھکے دے کر؟ میں تمہاری طرح شیخانی نہیں، بیگم میں بھی مغلانی ہوں"

"تم اماں پر ہاتھ اٹھاؤ گی؟" شوکت آپا رو پڑیں۔ مجھے ترس آگیا۔

"نہیں نہیں، تم ڈرو نہیں۔ میں نے کبھی پھوپھی اماں کو پاس سے نہیں دیکھا۔ دور سے ابا میاں جیسی لگتی ہیں اور اب تو انھیں دیکھے پندرہ سولہ برس ہو گئے۔ کچھ دھندلی سی یاد ہیں۔ اگر وہ مجھے دھکے بھی دیں گی تو صورت تو دیکھ لوں گی۔ بس پھر میں واپس اسٹیشن چلی جاؤں گی اور پہلی گاڑی سے علی گڑھ۔"

"تم جانو! بھئی اماں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہیں خفا ہو کر نکال دیا تو؟"

"تو تم بھی واپس چلی چلنا۔"

شوکت آپا کی زچگی میں کچھ پھندا پڑ رہا تھا۔ ڈر تھا کہ بچہ ضائع نہ ہو جائے اسی لیے تو وہ اماں کے پاس آئی تھیں۔ اگر انھوں نے نکال دیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ پھر ہم حکیموں والی گلی میں مشرف خالہ یا رفاقت خالہ کے ہاں چلے جائیں گے۔

"ہے ہے پھر تو اماں ساری عمر میری صورت نہیں دیکھیں گی۔ شوکت آپا کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی بڑی ہیں اس لیے آنسوؤں کے شرارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ اتنے میں گھر آ گیا۔ شوکت آپا میری خوشامد کرتی رہیں مگر میں تانگہ سے اتر کر اندر داخل ہو گئی۔"

وہ سامنے برآمدے میں کھڑی شاید طوطے کو امرود کی پھانک سلاخوں میں سے دے رہی تھیں۔ آہٹ سن کر انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"کون شوکت؟ آ گئی بچی۔" انھوں نے بے توجہی سے کہا۔

"شوکت آپا تانگہ میں بیٹھی رو رہی ہیں۔ میں... میں۔"

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ امرود کی پھانک ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شیر اور بکری ایک دوسرے کو بڑی نزاکت سے نظروں میں تول رہے تھے۔ شیر کون اور بکری کون؟ یہ اس وقت فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑھتی گئی۔ اماں تو کہتی ہیں میں سوکھا روتی ہوں۔ جب بچپن میں پٹتی تھی تو صرف گلا پھاڑتی تھی آنسو ایک نہیں نکلتا تھا۔ چلی گوہار سے اکثر حملہ آور بوکھلا جاتا ہے اور مار کم پڑتی ہے۔ چوٹ پڑنے سے پہلے ہی چلانے لگو تو دو چار تھپڑ مارنے پر ہی مارنے والا سمجھتا ہے بہت مار لیا اور آنسو ضائع کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مگر میری آنکھوں میں دھند چھا گئی۔

اور جب شوکت آپا نے ڈرتے ڈرتے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو ڈاکٹر کی پیشین گوئی پوری ہوتے ہوتے بچی۔

دو احمق عورتیں ایک دوسرے کے گلے سے لگی بھوں بھوں رو رہی تھیں۔

خانم صاحب بوکھلائی ہوئی کمرے سے نکلیں اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں میں نے اپنے گال پر سے پھوپھی اماں کے آنسو اور رال پونچھ کر انھیں سلام کیا۔

"جیتی رہو۔" انھوں نے بانہیں پھیلا دیں۔

شوکت آپا کچھ چور سی کھڑی تھیں۔ نعیم آتے ہی مرغیوں کے پیچھے بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔

"بالکل باپ پہ گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ننہال پہ نہ گئی۔ موٹے حبشی بردوں کا میل ہے تمہاری ننہال میں۔" انھوں نے ڈنک سنبھالنے شروع کیے۔

"توبہ ہے اماں، بس شروع ہوگئیں۔" خانم صاحب تنک کر بولیں۔

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں، ردوں کا میل نہ ہوتا تو پھیلے دہانے، چپٹی ناکیں اور گھونگھریالے بال کہاں سے آتے۔ میرا بچہ! ۔ مغل ہے۔"

"ارے ہاں! کبھی غور ہی نہ کیا۔" میں بولی "سچ تو ہے، ہمارے ننہالی بزرگوں میں ضرور کسی نہ کسی نے بردہ لڑکی سے شادی کی ہوگی۔

پھوپھی اماں کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے مگر مجھے ہنستا دیکھ کر بولیں۔

"مگر ڈھٹائی ننہال سے پائی ہے۔"

"توبہ کیجیے پھوپھی اماں وہ موئے پتلی دال کے کھانے والے عثمانی ہم چنگیزیوں کی کیا برابری کریں گے۔ کتنے سو سال حکومت کی ہے ہم نے اس ملک پر، ہماری ڈھٹائی کے تو جھنڈے گڑے ہیں۔ سارے ملک میں۔"

"ہاں بھئی کسی پشتی سے نہ ہوسکی حکومت۔" پھوپھی اتنا دار پر وار کرنے کی عادی تھیں کہ دم نہ لینے پائے غنیم۔ "بس مجاور ہی رہ گئے۔"

ذرا سی تفصیل طلب ہے یہ بات، نہ جانے کدھر سے ہماری ننہال کا کچھ حضرت سلیم چشتی سے ڈورا ملتا تھا۔ ضرور کچھ گھپلا ہوگا۔ یا شاید پھوپھی اماں نے یہ رشتہ طعنہ دینے کے لیے گڑھا تھا وہ کہتی تھیں حضرت سلیم چشتی جن کا ہماری نانی سے سلسلہ ملتا تھا، مجاور تھے۔

"مگر بڑے زوردار مجاور تھے۔ اکبر نے بیٹے کی خاطر ان کے قدموں پر سر جھکایا۔" اور پھوپھی اماں تلملا گئیں۔

"اژدہا خاک میں مل گیا۔ سنبو یہ میری جان کو چھوڑ گیا۔ ارے تیری اماں نے یہ زہر گھولا ہے میرے خلاف۔ شوکت نکل اسی وقت۔"

"کیوں اماں؟" شوکت آپا رو پڑیں۔

"کیوں لائی اِس کلموہی کو؟"

"میں نے بہت منع کیا۔"

"ہاں پھوپھی اماں، ان بے چاری نے بہت منع کیا مگر میں زبردستی آگئی۔"

"کیوں؟" پھوپھی اماں غرائیں۔

"اماں" خانم صاحب بولیں۔

"تو چپ رہ، ہاں بول کیوں آئی؟"

"آپ کو دیکھنے۔ کھڑکی میں سے صاف نہیں دیکھا تھا۔ پھر بہت سال ہو گئے تھے۔ پاس سے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"تو پاس سے دیکھنے آئی ہے؟"

"ہاں!" میں نے مری آواز میں کہا۔

"کیوں؟ کیا میرے لیے کوئی بڈھا ڈھونڈا ہے، میرا بیاہ رچائے گی؟"

مجھے ایک دم ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ پھوپھی اماں کچھ جھینپ گئیں۔ میں ہنسی سے بے قابو ہو کر پاس والے پلنگ پر گر گئی۔

"ارے ارے، کیا کرتی ہو، یہ اماں کا پلنگ ہے۔ اس پر تو نعیم کو بھی نہیں چڑھنے دیتیں۔"

میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ!" پھوپھی اماں نے ڈانٹا۔ میں جلدی سے واپس بیٹھ گئی۔ وہ شوکت آپا کی طرف مڑ کر بولیں۔

"ہوں تو یہ یہاں نہیں بیٹھے گی؟ تیرے باوا کا ہے یہ پلنگ۔"

"اے اماں اللہ کا واسطہ" خانم صاحب بولیں۔

"تم چپ رہو حشمت خانم، ہاں تو بول یہ یہاں کیوں نہیں بیٹھے گی"

"تمہارا ہے یہ پلنگ، تم کسی کو نہیں بیٹھنے دیتیں، اس لیے مجھے بھی تو منع کرتی ہو۔"

"تو میرے پلنگ پر بیٹھنے کے قابل ہے؟"

"میں نے کب کہا؟" شوکت آپا منہ پھلاکر چوکی پر ڈھہ گئیں۔ پھوپھی اماں میرے پاس بیٹھ گئیں۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"ارے ناشکری پھوپھی بھتیجی ایک ذات اور نانی تین پانی۔ یہ میرے بھائی کی اولاد ہے سمجھی اور تو؟" شوکت آپا رونے لگیں۔ پھوپھی اماں نے نعیم کو پاس بلاکر گود میں بٹھالیا۔ اور یہ میرے بھائی کا پوتا ہے۔ شیر تھا میرا بھیا شیر۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ کسی نے چھوٹے کو مارا (چھوٹے چچا مستقیم بیگ چغتائی) وہ آیا روتا، بھائی نے دو جھاپڑ لگائے۔ روتے ہیں مرد؟ اور بس اسی دن دونوں مل کر اکھاڑے میں اترنے لگے۔ پورے تین مہینے کس کس کے ڈنڈ بیٹھک لگائی۔ بھر بھر کٹورے گھی پیتے تھے دونوں۔ میں اپنے ہاتھ سے مکھن تایا کرتی تھی۔ لے چوتھے مہینے نکلے دونوں گلی میں۔ نادر پہلوان کے پاس سے گذرے تو مار دیا کندھا۔ وہ لگا اکڑنے کہ اندھے دیکھ کے نہیں چلتا۔ بس جی وہیں لنگوڑے کا پلیتن کر دیا۔ ہم مغل ہیں لڑکی یہ نہ بھول جانا کہ ہم نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔"

میں نے اپنی ہنسی جمائی میں چھپالی۔ جی چاہا کہہ دوں اور وہ جو بدؤوں کا میل ہے مجھ میں اور تم تو کہتی ہو میری ماں نے کوچوانوں اور گراسکٹوں سے آشنائی کر کے کالے پیلے سپنولیے جنے ہیں۔ تمہارا شیر بھائی تو نامرد تھا۔ پچھلی بار رحمٰن بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر تم نے خود میرا شجرہ گنایا تھا۔ مگر اس وقت مجھے پھوپھی اماں پر بہت پیار آرہا تھا۔ وہ اپنی صراحی اپنا کٹورا، اپنی رکابی، پلنگ چادر، لحاف، تکیہ، کسی کو چھونے نہیں دیتی تھیں۔ خانم صاحب کو کبھی منع نہیں کیا مگر جب شوکت آپا کو منع کیا تو ان کے آنسو پونچھنے کے لیے انھوں نے بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔

خانم صاحب کو میں نے سب سے پہلے دھنکوٹ کے اسکول میں دیکھا تھا۔ آگرہ کا سب سے سڑل اسکول تھا۔ وہاں میں ٹاٹ پر میلی گندی بچیوں کے ساتھ دن بھر کشتم پچھاڑ کیا کرتی تھی۔ ہم نو دس لڑکیاں ایک بڑی سی ڈولی میں بھر کے جایا کرتی تھیں۔ ڈولی اتنی بھر جاتی تھی کہ غبارہ بن جاتی تھی بس ڈنڈا پکڑ کر پٹی پر بیر جما کر لٹک جاتے تھے تین اِدھر تین اُدھر اور تین کبھی چار بیچ میں۔ بیچ والیوں کی موت ہوتی تھی کبھی کسی کی بالی کھنچ کر خون بہنے لگتا، کبھی نتھنی کھنچ جاتی۔ بھائیوں سے جنگ بازی میں بالیاں تو میں نے اتار کے کھودیں تنکے ڈال لیے تھے، اور چوٹی میں کرتے میں بیٹھ پر اندر ڈال لیتی۔ دوپٹہ سے بھی پھانسی لگ جانے کا اندیشہ رہتا تھا لہٰذا اتار کر بستے میں ٹھونس لیتی تھی۔

پتہ نہیں وہ وہاں کیوں آئی تھیں؟ میں نے زندگی میں اتنی حسین عورت نہیں دیکھی۔ وہ

اس وقت شاید چوبیس پچیس برس کی ہوں گی۔ پانچ فٹ چھ انچ کا قد، اس پر اونچی ایڑی، نازک کمر، لمبے بال، نیلا ریشم کا گھیردار غرارہ، سفید لمبی آستینوں کی قمیص اور سفید بیل لگا نازک سے کپڑے کا دوپٹہ۔ میں انھیں دیکھتی رہ گئی۔ میں سستی چھینٹ کا اونٹنگا پاجامہ اور ڈوریے کا میلا کرتا اور موٹی ململ کا گندہ سا دوپٹہ پہنے ٹاٹ پر بیٹھی تختی پر الف، ب، لکھ رہی تھی۔

"تو یہ ہیں ہماری ماموں زاد بہن !" انھوں نے آسمان سے نیچے موری میں جیسے دیکھتے ہوئے کہا اور میرا جی چاہا میں چیونٹی بن کر ٹاٹ کے نیچے رینگ جاؤں۔

وہ چلی گئی تھیں اور میری تختی پر آنسو اور ناک ٹپکنے سے اب پھیل کر پنجہ شاہی کا نقشہ بن گیا تھا جس پر استانی نے اتنی زور سے چپت ماری تھی کہ میرا سر تختی سے جا ٹکرایا تھا۔ اور میں نے اپنی عزیز از جان سہیلی بکو کو کھسوٹ ڈالا تھا کہ وہ مجھے چمکار رہی تھی۔

خانم صاحب پندرہ سولہ برس بعد بھی حسین تھیں، مگر جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا، چہرہ کچھ سوجا ہوا سا الگ رہا تھا، ہاتھی دانت جیسی شفاف جلد کچھ بھوری اور کجلائی سی ہو گئی تھی، پھر بھی وہ بہت حسین تھیں مہارانی سی لگنے لگی تھیں مسکراہٹ اب بھی قیامت تھی۔

رات کو تخت پر دسترخوان لگا۔ یاد نہیں کیا کھایا، مجھ پر کچھ نشہ سا طاری تھا۔ پھوپھی اماں نے مجھے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلائے۔ اپنی رکابی میں ساتھ کھلایا۔ اپنے کٹورے سے پانی پلایا اور بغیر کھنگالے خود بھی پیا۔ شوکت آپا سناٹے میں بیٹھی دیکھ رہی تھیں اور شاید تھوڑی کیا کافی جل بھی رہی تھیں۔ مگر پھوپھی اماں بڑی زبردست پالیٹیشین تھیں۔ وہ مار کے چمکار لینے کی عادی تھیں۔ انھوں نے ایک صندوق بھر سامان شوکت آپا کو دیا ان کے اور نعیم کے کپڑے پاؤڈر اور صابن کے ڈبے، شوکت آپا خوش ہو گئیں۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر اپنے کمرے میں جا کر سو گئیں۔

یہ طے ہوا کہ پھوپھی اماں، خانم صاحب اور میں اندر چوکے پر سوئیں گے۔ چار تخت ملا کر ان پر موٹی سی توشک اور چاندنی بچھی تھی، لحاف دوہی تھے، پھوپھی اماں کا بہت بڑا تھا انھوں نے مجھے اپنے ساتھ سُلا لیا، سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی، دو انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں۔

"پھوپھی اماں ! میں نے ہوش سنبھالا تو آپ کی اور ابا کی لڑائی کے بارے میں سوالات دل میں اُبھرے، پوچھا تو کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بس کہتے ہیں آپ مغرور ہیں۔"

"صاف کہو خر دماغ ہوں، بورائی کُتیا ہوں، مجھے لگی لپٹی نہیں بھاتی۔"

"مگر پھوپھی اماں ذرا سوچیے میں آپ سے کیوں بدظن ہوں گی۔"

"تمہارے اماں باوا کا بھرا ہوا زہر۔ سچ بتاؤ تم نے میرے اور میری بیٹی کے بارے میں اپنے خاندان بھر سے کوئی اچھا بول سنا ہے؟"

"نہیں، مگر کیوں؟"

"تمہاری اماں اپنے میکے والوں کو پالتی ہیں۔"

"میری اماں کے میکے والے اور سسرال والے الگ نہیں۔ انھوں نے بڑے ابا اور ان کے بچوں کو پالا۔ اپنی نند کے تین بچے پالے۔ اور تو اور غیروں کے بچے پالے پچا میاں کی کتنی خاطر کرتی ہیں۔ سارا کنبہ ان کی تعریف کرتا ہے سوائے آپ کے اور کسی سے ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنا۔ ابا کی اور ان کی جیسی نبھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ بھی وہ کیا جو مشکل سے کوئی کرے گا۔"

اماں کے بچپن کی ایک سہیلی تھیں، ان سے بڑی اور سمجھدار۔ اماں نے زندگی کے حقائق ان کے ہی ذریعہ سنے اور جانے۔ وہ بہت غریب تھیں ان کے میاں چپراسی تھے اور جب میں نے انھیں دیکھا تو کافی بوڑھے ہو چکے تھے بیوی سے عمر میں بہت بڑے تھے اور نوکری ختم ہونے کے بعد مسجد میں پڑے رہتے تھے وہیں کسی گھر سے کھانا مل جاتا تھا کوئی اللہ کا بندہ کپڑے بنوا دیتا تھا۔ بڑی بیٹی رقیہ آپا سہارنپور میں ایک بہت بڑے زمیندار سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ خوبصورت اور کم عمر تھیں۔ ان کی پہلی بیوی سے لڑکا نہیں تھا کسی غریب اچھے خاندان کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے تھے مختصر سے مہر پر ان سے بیاہ کر لیا تھا مگر ان سے بھی ایک بیٹی ہوئی۔ مجھ سے کچھ بڑی تھی اور میری بڑی دوست تھی چھوٹی بی پیار میں کہتے تھے۔ یاد نہیں کیا نام تھا، اچھی خوبصورت ذہین لڑکی تھی۔

اچانک باپ کا انتقال ہو گیا۔ دادا نے جب چھوٹی بی پانچ برس کی تھی تب اس کی شادی اپنے دوسرے بیٹے کے لڑکے سے کر دی جو دو سال کا تھا۔ یہ سب اس لیے کہ جائیداد باہر نہ جائے۔ رقیہ آپا لڑکی کو لے کر میکے چلی آئیں اور کوشش کرنے لگیں کہ طلاق ہو جائے تاکہ چھوٹی بی کے باپ کی جائیداد کا حصہ وہ لے سکیں۔ دو بیویوں میں بٹنے کے بعد بھی کافی حصہ ملتا۔ مگر خلع جو اسلام میں جائز ہے اور کوئی بھی عورت معقول وجہ پر خلع لے سکتی ہے مگر چھوٹی بی خلع نہ لے سکی۔ یہ کہ لڑکا تین سال چھوٹا تھا کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ بڑے مقدمے چلے مگر کامیابی نہ ملی اور چھوٹی بی کو آخر جس لڑکے سے نکاح ہوا تھا اس کے پاس جانا پڑا۔

دوسری لڑکی بہت خوبصورت تھی احمدی بیگم اس کی ایک چھوٹے سے زمیندار سے شادی ہو گئی۔

وہ چوتھے بچے کے جاپے میں مرگئی۔

تیسری لڑکی کی شادی ایک معمر آدمی سے ہوئی جو چھتاری کے نواب صاحب کے ہاں منیجر تھے۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی اور وہ لڑھک گئے نواب صاحب نے انھیں کافی روپیہ دیا اور وہ بھی بیٹی کو لے کر گھر آگئیں۔ آتے ہی انھوں نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ اڑایا، خوب دعوتیں کیں، سارے خاندان کو بانٹا۔ اور کنگال ہوگئیں۔ ادھر اُدھر رہتی پھرتی تھیں۔ چوتھی لڑکی کی بھی ایک کافی بڈھے امیر آدمی سے شادی ہوئی جس کے لڑکے اس سے بہت بڑے بڑے تھے۔ بڈھے کو ایک نرس کی ضرورت تھی بے حد بیمار تھا۔ دو چار سال بعد مرگیا اور کچھ چھوڑ بھی نہیں گیا کیوں کہ لڑکوں نے شادی اسی شرط پر کی تھی کہ جائیداد پہلے بانٹ دو، مرنے کے بعد وہ سوتیلی ماں کو بس بے تنخواہ کے نوکر کی طرح رکھتے رہے۔

چوتھے نمبر پر ایک بیٹا تھا وہ بالکل باپ کی طرح نکما۔ کچھ پڑھایا لکھایا نہیں نہ ہی اسے آئی عقل۔ لاڈلا بیٹا تھا۔ اسکول میں لڑکے ستاتے تھے تو اماں نے گھر بٹھالیا۔

ہماری اماں کا جو گھر تھا اس میں دو بھائیوں کا حصہ تھا۔ کرایہ کچھ نہیں تھا، اماں نے بھائیوں سے کہا یہ گھر مجھے دے دو، وہ گھر انھوں نے اپنی سہیلی کو دے دیا۔ وہ لڑکا شادی کے بعد بھی کچھ نہ کرپایا اور تین چار بچے پیدا کرواکے پلنگ پر لیٹ گیا۔

اماں نے ساری عمر اپنی سہیلی کو نبھایا۔ وہ سال میں دو دفعہ آتی تھیں۔ ایک دفعہ جڑاول بنوانے اور ایک دفعہ گرمی کے جوڑے بنوانے۔ بیٹیوں کی شادی میں پورے پورے جہیز بنوائے۔

یہ سب مجھے پھوپھی اماں نے بتایا۔ اماں کہتی تھیں سب جھوٹ، ابا کو بھی نہیں پتہ تھا اور جب پتہ چلا تو اماں صاف مکر گئیں۔

"مگر پھوپھی اماں یہ باتیں سن کر تو میرے دل میں اپنی ماں کی اور عزت بڑھ گئی وہ بڑی دل والی تھیں"۔

"ہاں ہاں تو تو میاں کی تریح کرے گی"۔ وہ بھنائیں اور لحاف سمیٹ کر الگ لیٹ گئیں۔

"پھوپھی اماں اگر میں مرگئی تو کفن دفن لحاف سے زیادہ مہنگا پڑے گا"۔

ایک دم لحاف میرے اوپر پھینک کر خود منھ موڑ کر لیٹ گئیں۔ میں نے لحاف ڈھانکنا چاہا ان پر تو بھڑک پڑیں۔ خانم صاحب نے بہت مشکل سے راضی کیا کہ میں ان کے لحاف میں آجاؤں تو ایک دم من گئیں۔

"نیند آرہی ہے پھوپھی اماں"؟ میں نے پوچھا۔

"مرگئی پھوپھی اماں ؟"

"خدا کے لیے بات کچھ ہو رہی تھی اور آپ خالہ بی کا رونا لے کر بیٹھ گئیں۔ بتائیے آپ کی ابا میاں کی لڑائی کس بات پر ہوئی ؟"

"بڑا لمبا قصہ ہے۔"

"بتائیے تو . . . ."

"میں بتاؤں ؟" خانم صاحب بولیں "یہ تین بھائیوں کی لاڈلی بہن بڑی تنک مزاج تھیں۔ لڑکیاں جب لڑکوں کے برابر یا ان سے بہتر لاڈ پیار سے پالی جائیں تو وہ اچھی بیویاں نہیں ثابت ہوتیں۔"

"کیوں آپا ؟"

"اب تمہیں کیسے بتاؤں ؟"

حشمت خانم ہمارے خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنھوں نے مڈل پاس کیا اور لکھنؤ میں استانی کی نوکری کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری بڑی آپا کی شادی ہوگئی تھی لیکن منجھلی اور سنجھلی ابھی چھوٹی تھیں اور نہ جانے کیا سوجھی کہ ابا میاں نے دونوں کو کرامت حسین بورڈنگ میں داخل کرادیا۔ میں چوں کہ منجھلی بہن سے بہت مانوس تھی مجھے بھی بھیجا گیا۔ مجھے کچھ نہیں یاد۔ بس اتنا یاد ہے کہ باجی غائب ہو جاتی تھی اور میں ایک نوکرانی کے پاس گلا پھاڑ پھاڑ کر باجی باجی پکارا کرتی تھی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہمیں واپس بلا لیا گیا۔ میں نے بڑے ہو کر پوچھا تو کوئی تسلی بخش جواب نہ پایا۔ بس بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ سارا خاندان بائیکاٹ پر تل گیا کہ تم لڑکیوں کو کرسٹان بنا رہے ہو ان کی شادیاں نہ ہو سکیں گی سب کو ساری عمر پاپنا۔ اماں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ابا نے ہتھیار ڈال دیے ان کے تمام ملنے والوں کی یہی رائے تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دلوانا انھیں پیشہ کرانے سے بھی زیادہ ذلیل حرکت ہے۔

میں خوش قسمت تھی کہ دیر سے پیدا ہوئی اور مجھے تعلیم پانے کا موقع ملا۔ وہ بھی کیا کیا جتن کرنے کے بعد۔ میرا قلم بہک رہا ہے اور بار بار پٹری سے اتر جاتا ہے۔ بات اس وقت میرے ابا میاں اور پھوپھی اماں کی لڑائی کی ہو رہی تھی اور میں کہاں پہنچ گئی۔

"بات دراصل یہ تھی کہ اماں کچھ پڑھی لکھی بھی تھیں یعنی ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔" حشمت جہاں نے چپکے سے کہا۔

"صاف بات کیوں نہیں بتاتی۔ میرے اوپر تو جھی الزام رکھ دے بس۔" پھوپھی اماں غرائیں

مگر حشمت جہاں نے سُنی اَن سُنی کردی۔

"امّاں کی کم عمری ہی میں ماں گذر گئیں۔ ہمارے نانا اور تمہارے دادا مرزا کریم بیگ چغتائی کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے ہماری نانی سے شادی کی۔"

"مجھے معلوم ہے پہلی بیوی سے سب سے بڑے ہمارے تایا مرزا نعیم بیگ چغتائی اور پھوپھی امراؤ خانم تھیں۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا صرف ان کے بارے میں سنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ان کی شادی رشتہ ہی میں عمدہ خانم سے ہوئی تھی۔"

"ان کے بیٹے مرزا ولی اللہ بیگ، وہ لمبے بانس سے ولو چچا، ہم انہیں چچا کیوں کہتے تھے وہ تو ہمارے تایا زاد بھائی تھے خیر، وہ افیون کھاتے تھے، اور میٹھے پر جان دیتے تھے۔ ننھے بھائی انھیں بہت ستایا کرتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے شہد کھائیں گے وہ کہتے ہاں، تو ننھے بھائی کہتے منہ کھولیے، وہ منہ کھولتے تو ننھے بھائی اُن کے منہ میں نیبو نچوڑ دیا کرتے تھے۔ اُفوہ کتنا غل مچاتے تھے، چیخ چیخ کر روتے تھے، ہائے سارا نشہ کاٹ ڈالا مردود نے۔"

ولو چچا کی شادی نہیں ہوئی تھی، وہ کسی مصرف کے نہیں تھے بس تیرے میرے ہاں پڑے رہتے تھے۔ نہایت میلے نوکرتک ستاتے تھے۔

"اور پتہ ہے تایا نعیم بیگ گوالیار کے گورنر تھے ایک زمانہ میں۔"

مگر وہ تو سُنا ہے ہمارے ہاں رہا کرتے تھے، بیوی آگرے میں رہتی تھیں۔ لڑکا کبھی اِدھر کبھی اُدھر، عربی فارسی کا مصرف ختم ہو گیا تھا، بڑے بڑے عالم بھوکے مر رہے تھے۔ ولو چچا سُنا ہے فارسی کا دیوان لیے پھرتے تھے۔

"ہاں ذہین تھے سنا ہے۔ مگر باپ کے تباہ ہونے کے بعد ان کی بھی مٹی خراب ہو گئی۔ اور جانتی ہو کس نے تباہ کیا؟"

"نہیں تو، ان کا تو کبھی ذکر ہوتا ہے تو یہی کہ بس رہتے تھے۔"

"تمہارے دادا نے۔"

"دادا یعنی خود باپ نے؟"

"ہاں! وہ رنگین مزاج تھے بس شراب کباب اور رنڈی بازی۔ ایک دن جلسہ جما ہوا تھا بارہ دری میں، چراغاں سے باغ جگمگا رہا تھا۔ اور رنڈیوں کے طائفے محل کو گلزار بنائے ہوئے تھے کہ کسی نے نانا جان کو جا کے خبر کر دی۔ وہ گرجتے برستے آئے، پٹے پکڑ کے چوکے سے گھسیٹا اور جوتے کاری

شروع کردی۔ نانا جان کی لوگوں پر بڑی دہشت تھی بھگدڑ مچ گئی۔ نانا جان کا بڑا رسوخ تھا فوراً معطل کر دیا کہ یہ ناہنجار نکما اور عیاش ہے اس عہدے کے قابل نہیں۔"

"کمال ہے یعنی حد کردی۔ اُفوہ۔"

"زمین جائیداد کچھ جمع نہیں کیا تھا، کچھ سال زیور برتن بیچ کے گذر کی جب فاقوں کی نوبت آئی اور محلہ والوں کے رحم و کرم پر بسر ہونے لگی تو کچھ انتظام کیا گیا۔"

"مگر دادا جان نے تو بہت جائیداد چھوڑی تھی۔"

"انھیں عاق کر دیا تھا نا۔ انھیں کوڑی کا حق نہیں دیا تھا ایسی تھڑی تھڑی ہوئی کہ بیچارے منہ چھپا کے پڑ گئے۔"

"کوئی اور نوکری کیوں نہ ڈھونڈی کسی ریاست میں چلے جاتے۔"

"اول تو اتنی بدنامی کے بعد کہاں دوسری نوکری ملتی پھر نوکری تو نانا جان کے رسوخ سے ملی تھی، دوسرے عیاشی اور نشہ بازی نے انھیں بالکل مست کر دیا تھا۔"

"مگر دادا جان نے بھی حد کردی۔"

"اس زمانہ کے لوگ ایسے ہی گھن چکر چلایا کرتے تھے مغل تھوڑے سے پاگل تو ہوتے ہیں، پھر انگریز نے احساس کمتری اس شدت سے پیدا کر دیا تھا، انگریزی نہ جانے وہ نکما۔ حالانکہ ان دنوں زیادہ تر کارروائی فارسی میں یا اُردو میں ہوتی تھی۔ ارے ہاں پتہ ہے میں نے ہندی بھی پڑھنی شروع کردی ہے۔"

"ہندی؟" میں چونک پڑی، ہندی کا تو اس وقت کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ جب کسی کے ہاں کتھا ہوتی تھی تب ہندی کے بھورے کاغذ کی پستک لے کے پنڈت جی آتے تھے اور پاٹھ ہوتا تھا۔ چاچی بھی ہندی کی پستک سے پاٹھ کرتی تھی مگر چاچا جی تو اردو فارسی بہت اعلیٰ درجہ کی جانتے تھے۔

"امّاں کو پتہ چل گیا تو بہت بگڑیں۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں میں نے کہا میں دیو مالا پڑھنا چاہتی ہوں، بس پھر تو بپھر گئیں۔ ہاں بس میں خوب جانتی ہوں تو ہندو ہونے والی ہے۔"

"کیوں؟"

"طلاق لینے کے لیے" پھوپھی اماں بنی پڑی تھیں، سوئی نہیں تھیں۔
"کیا ہندو ہو جائے تو طلاق مل جائے گی"
"یا عیسائی ہو جاؤ، طلاق مل جائے گی"
"پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ حشمت جہاں، اگر ایمان نہ رہے تو ۔۔۔۔ لعنت، پھٹکار" پھوپھی اماں اور گرم ہوئیں۔
"مگر طلاق تو مل جائے گی"
"مذہب کا خون کر کے؟"
"مگر زندگی کا خون ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ ہندو ہو جایئے دل میں مسلمان رہیئے اصل بات تو دل کی ہے"
"بس دیوانوں جیسی باتیں نہ کرو۔ ہے نہ بدو کا خون ہوئے"
"دیکھئے پھوپھی اماں بدوؤں کو کچھ نہ کہیئے گا۔ میرے دل میں کالے انسانوں کے لیے بہت گہری جگہ ہے۔ آپ نے پال رابسن کا "اولڈ مین روز" سُنا ہے کبھی؟"
"کون ہے اللہ مارا؟" میں نے ان سے نہیں حشمت آپا سے پوچھا تھا مگر وہ ٹپک پڑیں۔
"امریکہ کا عظیم موسیقار"
"کوئی اللہ والا ہے"
"بے حد اللہ والا، توبہ کیجئے، توبہ"
"اچھا بابا توبہ۔ اب سو جاؤ"
"آج تو میں جاگی ہوں، یہ اتنا بڑا المیہ کیسے ہوا۔ حشمت جہاں جیسی بے مثال حور اس لنگور یعنی لیاقت کے پلّے کیوں باندھ دی گئی۔ نہ پڑھا نہ لکھا، ارے دولت بھی تو نہیں کہ دولت کے لالچ میں کر دی اور کم بخت کی صورت نہ شکل، چپراسی ہے"
"صرف چپراسی ہوتا تو بھی کوئی بات ہوتی۔ میں بھی نوکری کرتی ہوں چھوٹا بڑا کیا۔ تنخواہ کا فرق ہے مگر آدمی تو ہوتا"
"تو پھر یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا تھا" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"ارے میرے ہاتھ بندھ گئے تھے" پھوپھی اماں کراہیں۔
"کس نے باندھے ہاتھ، اور آپ کیوں تیار ہو گئیں"

"میں اس وقت پورے سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی تھی بس قرآن ختم کیا تھا۔ تھوڑی فارسی ہاں اُردو اچھی آتی تھی۔"

"تو پھر پھوپھی اماں ....."

"دیکھ تو نے مجھے اور جلایا تو دیوار سے سر پھوڑ لوں گی۔" پھوپھی اماں بڑبڑائیں۔ اری بنّو، مت پوچھ کلیجے کے کھرنڈ اکھڑ جائیں گے۔" اور پھوپھی اماں پھر ہچکی ہچکی رونے لگیں۔

"نا اماں نا۔" خانم صاحب نے ماں کو بچّے کی طرح تھپکنا شروع کیا۔ میں بیچ میں لیٹی تھی، خانم صاحب کا ہاتھ میرے اوپر سے گذر کر ماں کو چھو رہا تھا۔ ان کی بند آنکھوں سے گنگا جمنا چھلک رہی تھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

ایک دم نیند لوٹ پڑی جیسے کسی نے دوا نے بیہوشی چھڑک دی اور ہم سو گئے۔ جذباتی تصادم نے ہم تینوں کو شل کر ڈالا تھا۔

# ادھوری عورت

دھنی ہوئی سمل کی روئی کے لچیم شحیم گالے میرے نتھنوں میں گھس رہے تھے، دھند کے مرغولے امنڈ رہے تھے۔ ایک میلا سا ہیولا کہرے کی چادر میں لپٹا کوئی سفید سفید چیز سل پر پیس رہا تھا۔ شاید کھیر کے چاول ہوں گے۔ دور کہیں عورتوں کے بین کرنے کی آواز گونج رہی تھی۔ میرا دم نکل رہا تھا اب سانس واپس سینے میں نہیں آئے گی۔ میں مر رہی ہوں۔

بچپن سے مجھے ڈراؤنے خواب ستایا کرتے ہیں۔ میں جینے پر تلی ہوئی ہوں۔ میں سانس کو واپس پھیپھڑوں میں کھینچنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور آج تک اس پر قائم ہوں۔ میرے سینے پر دھرا پہاڑ بڑھتا جاتا ہے۔ روئی میرے پھیپھڑوں میں گھس کر پھول رہی ہے۔ میں جاگ چکی ہوں مگر سانس ابھی تک نہیں آئی۔ میں بھاگ رہی ہوں، دور بلندیوں کی طرف! تازہ ہوا کو دونوں مٹھیوں میں دبوچنے کے لیے۔ ہوا کو میرے چنگل میں آنا ہی ہوگا۔ اور میں مر جاؤں گی!

اور میں نہیں مرتی۔ ایک دم میں عذاب کے شکنجے سے چھوٹ جاتی ہوں۔ ہوا کو میرے پھیپھڑوں نے دبوچ لیا، کراہتی ہوئی میں لحاف دور پھینک کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہوں۔

میں کہاں ہوں؟ مجھے کون اٹھا لایا، یہ اجنبی کمرہ، میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"خدا کی مار نا شدنی، دھول اڑائے جا رہی ہے" پھوپھی بادشاہی گرج رہی ہیں۔

اوہ میں مائی تھان اپنی پھوپھی کے ہاں ہوں۔

مہترانی بانس کے تنکوں کی جھاڑو وں سے بیری اور امرود کے جھڑے ہوئے خشک پتوں کو سمیٹ رہی ہے۔ میری کڑوی کسیلی پھپھونکار رہی ہیں۔ سر سر سر جھاڑو میں معصوم سا نغمہ ہے۔ جیسے غلماں سنتور کے

تاروں کو آسمانی انگلیوں سے چھیڑ رہے ہیں۔

جب مجھے یہ ڈراؤنا خواب نظر آتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے میں مر کر زندہ ہوئی ہوں۔ کون جانے چند لمحوں کی موت ہو بھی جاتی ہو مگر عالم نزع بیت جانے کے بعد میں خود کو پہلے سے زیادہ چاق و چوبند پاتی ہوں۔ میرا دماغ دور دور وسعتوں کو ناپنے لگتا ہے، مانگ انگ میں زندگی کی طلسماتی لہر دوڑ جاتی ہے، عمر کے چند سال گھٹ جاتے ہیں۔ اُس طوفان سے میں نئی شکتی کھینچ لائی ہوں۔ بیوجہ ہنسی آنے لگتی ہے۔ دل میں لڈو سے پھوٹنے لگتے ہیں نتھنوں میں گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک بھر جاتی ہے۔

میں باہر نکلی تو پھوپھی اماں چوکی پر بیٹھی ایک صندوقچہ کھولے الٹ پلٹ میں مشغول تھیں۔ صحن میں دھوپ اتر آئی تھی۔ میں نے سلام کیا تو چونک کر اجنبیوں کی طرح خونخوار آنکھوں سے گھورنے لگیں جیسے پوچھتی ہیں یہ بلا کہاں سے آ ٹپکی۔

میں ان کی گولہ بار آنکھوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتی۔ میں جان گئی ہوں، وہ کاغذ کا شیر ہیں۔ جبروت تن و توش کے باوجود ننھی سی بچّی ہیں جنھیں میرے سادیت پسند ابا خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں۔

"جیتی رہو۔" وہ جبراً بڑبڑاتی ہیں۔ "شوکت اے شوکت۔"

"جی اماں۔"

"لے بس بہت ہوا۔ کوڑا کرکٹ سمیٹو اور دفان ہو۔"

"اماں۔" شوکت آپا روہانسی ہو جاتی ہیں۔

"ہاں شوکت آپا، تم جا کے گھر درصفا کر دو میں کل شام تک آؤں گی۔"

"دیوانی ہوئی ہو۔" شوکت آپا لرزیں۔

"ہاں تم جاؤ، کوڑا کرکٹ گھورے پر چھوڑ جاؤ۔"

پھوپھی اماں کی آنکھوں میں بھس ہوتے تو میں کبھی کی نیلی لاش بن چکی ہوتی۔ صرف ڈھٹائی سے میں نے بڑے بڑے میدان مارے ہیں۔ میں نے بُرے بُرے زہریلے ناگ کھلائے ہیں صرف سُنی اَن سُنی کر کے۔ پھنکارتی بسلاتی پھپھو مجھے بھولی سی گڑیا لگ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کون سا ہتھیار استعمال کریں۔

"نہیں، بس غارت ہو میری نظروں کے سامنے سے۔ میرے گھر میں سپنولیوں کی گنجائش نہیں۔

رات کو کتنے پیار سے مجھے چھاتی سے لگانے والی نرم گرم ہیپتو بچھو کا ڈنک بنی ہوئی تھیں مگر مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔

"آپ کے گھر میں نہیں میں تو حشمت آپا کی مہمان ہوں۔" اور میں نل کی طرف چل دی جہاں خانم صاحب ہودی کی منڈیر پر اکڑوں بیٹھی کوئلے سے دانت مانجھ رہی تھیں، انھوں نے ایک کوئلے کا ٹکڑا دیا اور میں چبانے لگی۔

"تم تو ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہو، میم صاحب جو ٹھہریں۔"

"ہاں مگر کالے منجن سے بھی مانجھتی ہوں دانت بہت صاف ہو جاتے ہیں۔ ابا میاں اکثر بچوں کو پکڑ کر ان کے دانت ایسے دیکھتے تھے جیسے گھوڑا خریدتے وقت دیکھتے ہیں۔ ذرا بھی ہلتا دانت ہو فوراً گھٹنوں میں داب کر توڑ دیتے تھے۔ کبھی خود بھی منجن کا ڈبہ لے کر سارے بچوں کے دانت مانجھنے لگتے تھے بڑے بھائیوں تک کو معاف نہیں کرتے تھے۔ دانت مانجھنے کے بعد کالی انگلی سے مونچھیں بنا دیا کرتے تھے۔ خود انھوں نے پائریا کی وجہ سے سارے دانت تیس بتیس برس کی عمر میں ایک دن میں اکھڑوا دیے تھے۔ اماں کو بھی پائریا تھا مگر وہ بے انتہا پان کھاتی تھیں اور اچھے دانت تڑوانے پر قطعی تیار نہیں ہوئیں۔

"اماں کی بات کا بُرا مت ماننا۔" خانم صاحب بولیں۔

"بُرا ماننا۔ اُف آپ کو معلوم نہیں میں کتنی سخت جان ہوں کئی برس سے ڈانٹ پھٹکار نہیں سنی، چھٹیوں میں جاتی ہوں تو اماں بڑی خاطر کرتی ہیں ایسا لگتا ہے بڑھاپا آرہا ہے کوئی ٹانگ نہیں لیتا۔ ارے اب تو آپا بھی محبت سے بات کرتی ہیں۔ بڑے ہو کر پڑھ لکھ جانے کے بعد یہی تو مصیبت ہے سب خیال رکھنے لگتے ہیں اور مار کھائے تو برسوں ہو گئے۔"

"پیٹھ کھجلاتی ہے؟"

"اکثر، آپ کو کبھی مار پڑی۔"

"توبہ کرو، کبھی پھول کی چھڑی نہ چھوائی کسی نے، مگر..."

"مگر؟"

"کیا کرو گی سن کر؟"

"چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔"

"اس چراغ میں نہ تیل ہے نہ باتی۔"

"مگر لو مجھ تک پہنچ گئی۔ آپ نے راستے کے پتھروں کو ٹھوکروں سے مسمار کیا۔ سانپ بچھوؤں کے

جنگل پار کیے، آگ کے دریا آنسوؤں سے سینچے، آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے، وہ بچپن میں جو جھلک دیکھی تھی اتنی ہی شفاف دل پر نقش ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا آگرہ آنا ہی نہیں ہوا۔ سچ پوچھیے تو اپنی دوڑ بھاگ میں آپ یاد ہی نہیں آئیں قسمت میں ملنا تھا سو مل لیے۔"

"تمہیں پڑھنے کا موقع کیسے ملا، میں نے مڈل کے بعد ٹریننگ لی اور نوکری کی تو سارے خاندان نے میرا ناطقہ بند کر دیا۔ گھر میں آگ لگانے تک کی دھمکیاں ملیں۔ ابّا تو برسوں سے زیادہ وقت باہر گذارتے ہیں کبھی راتوں کو بھی غائب رہتے ہیں۔ ہم دو ماں بیٹیاں ڈھنڈار مکان میں کیسے جیتی ہیں یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ اور پھر میں تو زیادہ تر لکھنؤ ہی رہتی تھی اماں پر جو گذری ہے وہ کون جانے "

" مگر اتنا بڑا خاندان ہے۔"

"خاندان؟ کس کا خاندان۔ تمہاری امّاں نے سب کو ہماری طرف سے بدظن کر دیا۔"

"ارے میری اتنی معصوم سی اماں اپنا نام تک تو لکھ نہیں پاتیں، ہاں رسالے پڑھ لیتی ہیں۔"

"امّاں کے یہ کڑوے بول سننے کی تاب نہیں؟"

"قسم خدا کی یہ بات نہیں۔ میں نے اپنی ماں سے بغاوت کی، ابّا تو ہوش کی بات سن کر قائل ہو جاتے تھے مگر امّاں نے تو مجھے چودہ پندرہ برس کی عمر تک مارا ہے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں مجھے والدین نے شوق سے پڑھایا ہے؟"

"شوکت بتاتی ہیں کہ تم بڑی بدزبان اور خودسر ہو۔"

"وہ سچ کہتی ہیں، کبھی موقع ملا تو بتاؤں گی کہ میں نے کیسے کیسے دنگل لڑے ہیں اور آج میں نے جب بی۔ اے کر لیا تو خاندان میں میری مثالیں دی جاتی ہیں جیسے میں نے بڑا تیر مارا۔ اب تو میری اماں کو بھی میرے وجود سے شرم نہیں آتی۔ بس یہی دکھ ہے کہ میرے بجائے شمیم میرے بڑے بھائی نے بی۔ اے کیا ہوتا تو ماموں انھیں جودھپور میں بڑی اچھی نوکری دلوا دیتے۔ چار بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد وہ بور ہو گئے، کتابیں پھینک دیں اور میونسپلٹی میں کلرک ہو گئے۔ مجھے اماں سے کوئی شکایت نہیں، میری جیت ہوئی، ہارے ہوئے پر غصہ نہیں پیار آتا ہے۔ انھوں نے اپنی عقل اور تجربہ کے مطابق میری زندگی سنوارنے کے ہزار جتن کیے مگر میں ازلی ثابت ہوئی۔ جو کبھی میری مخالفت کرتے تھے اب خجل ہیں مگر یہ ذرا زیادتی ہے کہ میری اماں نے سارے خاندان کو بھڑکا کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔"

"بُرا مانو تو میری بلا سے۔" خانم صاحب نے تولیے سے منہ پونچھ کر کہا۔ "تمہاری اماں جاہل ہوں گی مگر احمق نہیں تھیں۔ ذہانت کہو، ہوشیاری کہو، سیاست دانی کہو، انھوں نے روپیہ کے بل پر سارے

خاندان کو سمیٹ لیا۔ سسرال میاں تھا ہی ایک اور پھر تمہاری نانی ایک چلتی پرزہ تھیں تمہاری ماں کا ہاتھ کھلا تھا۔ کپڑا کسی کو بھا جائے تو اتار کے دے دیں۔ سارے کنبے کو ماہانہ بندھوا دیا تھا جب آگرہ آتیں تو وہ لالے تلے سے خرچ کرتیں۔ خاندان میں زیادہ تر بے مال اور مفلس تھے سب مکھیوں کی طرح چمٹ گئے۔"

"پھوپھی اماں نے انھیں توڑ دیا ہوتا۔"

"اماں تو پہ نہیں آتے ان سے میاں تو سنبھلے ہی نہیں۔ بی بی تم نہیں جانتی اماں کتنی ادھوری عورت ہیں۔ بچپن میں ماں مر گئیں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ بڑے لاڈ ہوتے تھے۔ سوتیلی ماں کا ڈر کے مارے دم نکلتا تھا سوتیلی بیٹی سے لرزتی تھیں۔ لڑکی کو ماں ہی رکھ رکھاؤ سکھاتی ہے میاں کو مٹھی میں رکھنا، سسرال والوں کا پتہ نس ہوشیاری سے کاٹنا کہ الزام ان کے ہی سر جائے۔ اپنے بھائیوں کی قدم قدم پر ترجیح کرنا۔ سنا ہے اگر تمہارے ماموں خالی ہاتھ آجائیں تو تمہاری اماں چپکے سے مٹھائی منگا کر کہہ دیتی ہیں میرا بھائی لایا ہے بہنوئی کے لیے تحفہ بہن کے لیے جوڑا سب خود بنا کر دنیا سے کہتی ہیں دیکھو میرے بھائی کتنے دریا دل ہیں۔" اور مجھے یاد آیا ماموں آتے تھے تو روپے بھی بانٹا کرتے تھے، بچوں سے اماں سب چھین لیتی تھیں۔

بھئی واہ میری اماں اتنی بڑی پالیٹیشین ہیں، مجھے بڑا فخر ہوا۔

"اور پھر میٹھی زبان۔ ادھر ہماری اماں کی زبان میں ڈنک ہے میں اکیلی اولاد ہوں، کبھی میری جان کو آجاتی ہیں تو جی چاہتا ہے جا کے جمنا میں چھلانگ لگادوں۔ تاج محل کی برجی سے کئی بار کودنے کا قصد کیا۔ مگر ادھوری ماں کی پالی بیٹی کچھ کم ادھوری نہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں آپ لوگ مغرور ہیں۔"

"بزدل اور ڈرپوک انسان غرور کی ٹٹی کی آڑ لیتے ہیں۔ اماں میکے میں دھونس جمانے کی عادی سسرال میں بھی سب پر چھا گئیں میاں بھی پھُس پھُسے نکلے۔"

"اُن سے سب ڈرتے ہیں اور اس پر وہ بڑی نازاں ہیں۔"

"نہیں وہ چھُپ چھُپ کر روتی ہیں۔ ایسے کہ میں نے بھی آج تک ان کے آنسو نہیں دیکھے وہ اپنے زخم چھپاتی ہیں اور جلی کٹی سنا کر جی کی بھڑاس نکالتی ہیں۔"

"پتہ نہیں پھوپھا میاں سے کبھی محبت کی تھی کہ نہیں۔"

"دس بارہ سال تو سنا ہے میاں دیوانے تھے۔ اسی عرصہ میں چودہ کچے پکے بچے پیدا ہوئے۔ بس

ہم دو بہنیں اللہ سے بچے، تو ان کا یوں نصیب پھوٹا میاں عام مردوں کی طرح اِدھر اُدھر منہ مارنے لگے، اماں عام عورت ہوتیں تو ہائے توبہ کرتیں آنسو بہاتیں بھائیوں کو پکاتیں، مگر اماں کو کسی نے عورت کے ہتھیاروں سے مسلح تو کیا نہیں تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق غم کا اظہار غصہ سے کیا، جب مہترانی سے قصہ پتا اور انھیں معلوم ہوا تو باقاعدہ چوڑیاں توڑیں اور اس دن سے سفید دوپٹہ اوڑھنے لگیں :

"اور پھوپھا میاں کو مرنے والا کہنے لگیں۔ بیچارے بڑے سیدھے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے ابھی اونٹ پہاڑ تلے نہیں آیا۔"

"یہ اونٹ کترا کر نکل جانے میں یقین رکھتا ہے۔"

"کسی پر دل نہیں آیا۔"

"درجنوں پر، مگر رو پیٹ کر صبر آ گیا۔"

"برا نہ ماننا تم کیسے ادھوری رہ گئیں، تمہاری سب بہنیں تو بڑی مثالی بیویاں ہیں، مگر مجھے ڈر ہے کہ تم مثالی بیوی بڑی مشکل سے بن سکو گی۔ اللہ رحم کرے اس بے چارے پر کیسے جھیلے گا تم جیسی بے پٹری کی دندنانے والی ریل کو!"

"میں بڑی سخت جان ہوں، بہرائچ میں ملیریا کی وبا پھیلی سارا گھر روز جوڑی بھوگتا تھا مجھے ایک دن بھی بخار نہیں آیا، شاید زہریلے مچھر میرے زہر سے مرگئے۔ بچپن میں مجھے بیمار پڑنے کا بڑا ارمان تھا۔ اس زمانے میں ہر رومینٹک کہانی کا ہیرو ڈاکٹر ہوا کرتا تھا۔ بس میں بھی سوچا کرتی تھی اللہ کوئی مرض دے اپنی رحمت کا صدقہ لے کر ڈاکٹر آئے اور مجھ پر عاشق ہو جائے، پھر چاہے میں مر بھی جاؤں، صرف اسی امید میں کہ شاید وہ ڈاکٹر بھی میرے غم میں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرے اور پھر ایک دن میری تربت پر پچھاڑ کھا کر گرے اور دم توڑ دے، پھر میری تربت شق ہو اور حلۂ بہشتی پہنے اپنے سنہرے بال لہراتی نیلی آنکھوں سے آنسو چھلکاتی برآمد ہوں اور ہم دونوں جنت میں ٹہلتے پھریں۔ دودھ اور شہد میرے لیے مضر ہو گا کیوں کہ موٹا کرتا ہے۔ ہاں بھنے ہوئے پرند اور تازہ پھل صحت کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ ڈائننگ میں بھی۔"

اچھا بکواس بند، اماں بار بار پہلو بدل رہی ہیں کوئی دم میں آتش فشاں پھٹے گا اور لاوا چھلکنے لگے گا۔

میں نے پھوپھی اماں کے پاس جا کر کہا۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو مجھے کھا لو۔"

"ارے یہ تو پتہ ہی نہیں تھا کہ آپ کو بھی کھایا جاسکتا ہے۔خوب"۔میں نے جھک کران کے گال پہ پیار کیا۔

"ام ام ..... ڈیلیشس بالکل آئس کریم۔آپ بھی چکھیے"۔میں نے خانم صاحب کو بھی مدعو کیا۔

"ارے تیری اماں ڈکار گئی میرے پورے خاندان کو، اب یہ ہڈیاں رہ گئیں ہیں سو تو چھوڑ دے۔" پھوپھی اماں جب جلی کٹی پر اتر آتی تھیں تو عجیب لے میں بولنے لگتی تھیں جیسے مجلس میں نوحہ خوانی سے پہلے ایک لہراتی ہوئی آواز میں بیان پڑھا جاتا ہے۔میں نے بالکل ان کے لہجہ کی نقل میں اسی لے سے کہا۔

"ارے رحیم بیگ کی اکلوتی بیٹی اور تین جغادری بھائیوں کی لڑاکا بہن اور مجھ معصوم بھتیجی کی واحد پھوپھی، چاہے ناشتہ نہیں تو غم نہیں، مجھے ہمیشہ ڈائٹنگ کی ضرورت رہتی ہے۔پانی تو پینے دے گی کہ دریائے فرات پر بھی شمر کی فوج کی ناکہ بندی ہے"۔میں نے شوکت آپا کی صراحی سے ان کے بیٹے کے گلاس میں پانی انڈیلا۔

"یہ پانی تو میرے بھائی کا ہے اس پر تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا"۔

"خبردار جو تو نے نہار منہ پانی پیا"۔پھوپھی اماں گرجیں، میرے ہاتھ سے گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔شوکت آپا بتا رہی تھیں کہ ایک دن پھوپھا گرم پانی کی پتیلی غسل خانہ میں لے جا رہے تھے پھوپھی اماں اتنی زور سے دھاڑیں کہ ہاتھ سے پتیلی اچھل کر پھوپھی اماں پہ گری، پوری پنڈلی ابل گئی مگر وہ کہتی ہیں کہ مرنے والے نے جان بوجھ کر میرے اوپر کھولتا پانی ڈالا۔اگر اس وقت کڑکڑاتے جاڑے میں بھی بدحواس ہو کر ان پر ٹھنڈا پانی ڈال دیتی تو مزہ آجاتا۔

پھوپھی اماں نے ڈھیر سارا ناشتہ منگایا جو تیار رکھا تھا۔

"لونگو، ذرا بھی شرم نہیں۔میں نے تو اس لیے دے دیا کہ خانم صاحب بھی منہ پھلا کے بیٹھ جائے گی"۔

میں ناشتہ کرنے لگی۔

"اری تجھے ذرا بھی شرم نہیں، کچھ تو تکلف کیا ہوتا"۔

"ہم مغل تکلف کے عادی ہوتے تو ہندوستان فتح کر کے حکومت نہ کرپاتے۔تیسرے تکلف نہیں کرتے اور پھر مجھ میں دور سے دو چار بوندیں حضرت سلیم چشتی کے خون مبارک کی بھی پائی جاتی ہیں۔اس لیے کھائے لے رہی ہوں کہ برکت سے آپ کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے"۔

پھوپھی اماں بھونچکی سی مجھے تکنے لگیں۔ حشمت آپا نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اماں تو بھیگی بلی بنی رہتی ہیں، یہ کترنی سی زبان کہاں سے ملی؟"

"ہمارا کوچوان بڑا باتونی تھا۔" پھوپھی کہا کرتی تھیں، ارے نصرت خانم بدچلن ہے میرا بھائی تو نامرد ہے، یہ کالے پیلے بچے کوچوان اور گراسکٹوں کے ہیں۔ پھوپھی فوراً سمجھ گئیں۔

"نہ جانے کس اللہ کے بندے کا نصیبا پھوڑے گی۔"

"کاش آپ کا کوئی بیٹا ہوتا صفا اڑا لے جاتی۔"

"اری تجھے ذرا بھی شرم نہیں۔"

"جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔"

"اے غارت ہو۔"

"آپ کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی ماں کی کوکھ سے جنمی۔ آپ اماں کو بہت کوستی تھیں جیسے آپ کا ایک کوسنا تو لگا۔ اور پھر کوچوان۔"

"خبردار! جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ نصرت خانم میری دشمن سہی مگر میرے سگے پھوپھی زاد بھائی کی بیٹی ہے۔ اور میرا بھائی شیر تھا شیر، بڑے بڑے سورماؤں کی اس کے سامنے پھونک سرکتی تھی۔ ارے ایک دن فتو پہلوان نے مستقیم کو سربازار دھول جمادی، بس میرے شیر نے . . ."

"اماں یہ قصہ تو سنا چکی ہو۔" خانم صاحب نے لقمہ دیا۔

"ارے بس تو چپ رہ۔ بڑی مغلانی بنتی ہے۔ تولہ بھر کا خصم تو سنبھلا نہیں۔"

ایک دم خانم صاحب کا چہرہ سفید پھر ہلکا نیلا پڑ گیا۔ جیسے ذہن کا سارا زہر اچھل کر چہرے پر پھیل گیا۔ میں لرز پڑی۔

"ارے تو اپنے اتنے حسین نوجوان برسر روزگار چاروں کھونٹ کیت شوہر کی کون سی کم مٹی پلید کی، انسان سے بجر بٹو بنا دیا۔ سنتے ہیں پولیس میں ان کے کارناموں کی دھوم تھی۔" میں نے بات میں گل پھندنے لگانے شروع کیے۔ "آپ نے انھیں مرگھلا چوہا بنا دیا۔ انھیں دھمکاتی ہیں۔" جب پھوپھا میاں سے لڑائی ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ کہتی تھیں۔

"ارے اتھائی گیرے اوقات میں رہ کوئی نگوڑی ناٹھی نہیں تین بھائیوں کی آنکھ کا تارہ لاڈلی بہن ہوں، انھیں بھنک بھی پڑ گئی تو بس دین دنیا سے جائے گا۔ بڑا اللہ والا ہے وہ تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ جو بیس گھنٹے عبادت کرتا ہے چاہے تو عرش کے کنگورے ہلا دے اور منجھلا (یعنی میرے ابا) مجسٹریٹ ہے ساری

عمر کو چکی پسوا دے گا اور تیسرا ہے چھٹا ہوا دس نمبری بدمعاش تین قتل کر چکا ہے۔ آ و دیکھے گا نہ تاؤ آنتیں نکال کر ہتھیلی پہ دھر دے گا۔"

"کیا نام وہ" پھوپھا کا تکیہ کلام کیا نام تھا۔ وہ پھوپھی اماں کی گولہ باری سے بہت نروس ہوتے تھے۔ انھوں نے اس قسم کی مارتے خاں عورت خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ ساری عمر بھلی بیویوں سے واسطہ پڑا تھا۔

"کیا نام وہ ... گھر میں سے جو ہیں وہ سنزن ہیں" وہ انھیں پاگل سمجھ کے بہت ڈرتے تھے۔ پھوپھی اماں کے بہت سے بچے مرے تو ان کا ضرور غم سے دماغ الٹ گیا ہوگا۔

"مگر ویسے تو ہوش و حواس میں ہیں" لوگ ان سے کہتے۔

"کیا نام وہ۔ دیوانہ بکار خویش ہوشیار" وہ دیمھے سے فیصلہ کرتے۔ ان سے لوگ زیادہ خوش نہیں تھے۔ جورو کے غلام خواہ سیلف ڈیفنس میں بھی ہوں مردانگی کے نام پہ سیاہ داغ ہے۔

اور بڑے ابا سے تو ان کی بالکل کٹی ہو چکی تھی۔ بڑے ابا مصطفےٰ کمال پاشا کے پرستاروں میں سے تھے۔ کسی زمانے میں جب انھوں نے ترکی میں انقلاب برپا کیا تھا انھیں پوجنے لگے تھے اور ہر سانس میں خدا کے بعد انھیں کا نام لیتے تھے۔ کچھ اتاترک کے بارے میں پھوپھا میاں کو حیرت انگیز بات سُنا رہے تھے۔

"کیا نام وہ کون مصطفےٰ کمال پاشا" انھوں نے سہم کر پوچھا۔

"تم اتاترک کو نہیں جانتے" بڑے ابا چت ہو گئے۔

"کیا نام نہیں تو"

"تو میں تمھیں نہیں جانتا" بڑے ابا منہ پھیر کر چل دیے اور پھر ان کی صورت نہیں دیکھی پھوپھا میاں بھونچکے رہ گئے۔ شاید بچوں کی موت سے پھوپھی اماں نازک کیس بن گئی ہوں گی مگر جراثیم پورے خاندان میں ورثہ کے طور پر پٹے ہوں گے۔ ویسے اصیل مغل کی پہچان یہی ہے کہ محور سے دماغ تھوڑا بہت ضرور کھسکا ہوا ہو۔

"پھوپھی اماں رات کو آپ نے ٹال دیا۔ بتایئے نا، خانم صاحب کی شادی ایک چپراسی سے کیوں کردی جب کہ ان کے قدموں میں بڑے بڑے رشتہ پڑے ہونا چاہیے تھے۔"

پھوپھی اماں نے لمبی سانس بھری۔

"کیوں کھنڈا کھیرتی ہے لہو بہنے لگے گا۔ تجھے معلوم ہوگا کہ مسرت جہاں کی شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی۔ لاکھ منع کیا مگر وہ تو دیوانی ہوگئی تھی۔ عمر ہی کیا تھی مشکل سے سولہواں لگا ہوگا۔ ارے خانم صاحب تو اس کے سامنے تمہاری ہے۔ جب پیدا ہوئی تھی تو میں بیٹھی گھنٹوں تکا کروں تھی جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اللہ نے کرشمہ میرے آنچل میں ڈال دیا تھا۔ کیا بس ککڑی کھیرے کی طرح بڑھی۔ حشمت سے بارہ تیرہ سال بڑی تھی۔ بیچ میں تین جاتے رہے۔ اماں خانم ہماری پھوپھی کی اب تب ہوری تھی، سارا خاندان جمع تھا تمہاری اماں اور ماموں بھی دونوں آن دھمکے پھر خدا جانے کیا ہوا بڑھیا ایک دن اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی کہ قاضی کو بلواؤ۔ ہے ہے بڑھیا کا چتیا پگھل گیا، اب ملک الموت سے دو بول کا وقت آرہا ہے اور یہ قاضی بلوارہی ہے۔ پتہ چلا کہ رات کو ظفر حسین، خدا کرے اس کی قبر میں کیڑے پڑیں۔ ڈھائی گھڑی کی آئے اور مسرت جہاں بڑھیا کے سرہانے بیٹھی تھی کہ ہم سب تھک کر سو رہے تھے۔ بڑھیا کسی طرح مرنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔"

"وہ تو ماموں کی شادی کے بیس سال بعد مریں۔"

"اور کیا، مگر گانٹھ رہی تھی میری بچی کو پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا تھا۔ بس نکاح ہوگیا۔ میں نے مسرت جہاں سے کہہ دیا تیرا کالا منہ غارت ہو۔ تمہاری اماں گھی کے چراغ جلانے لگیں اور بھائی بھاوج کو لے کے چل دیں۔ میرے سینے پر کودوں دلنے کے لیے بڑی دھوم سے ولیمہ کیا۔ تو یہاں سے میرے گھر پر عذاب نازل ہونا شروع ہوا۔"

میں سوچ رہی تھی بڑے ماموں کتنے پیارے ہیں، ہم سب پر جان چھڑکتے ہیں۔ بارہ برس انھوں نے بیوی کی موت کا سوگ منایا۔ وہ تین بچے چھوڑ کر جاپے میں زہرباد پھیل جانے سے فرش ہوگئیں معمولی بخار دق میں بدل گیا، اور پھول کی طرح مرجھا گئیں۔

"اس وقت میں پندرہ برس کی بھی نہیں تھی۔" خانم صاحب بولیں۔

"ہاں! مگر ظفر کی نظر میں تو کھوٹ تھا۔"

"شاید آپا کو وہم ہوگیا تھا ظفر بھائی مجھے ہنسی میں چھیڑا کرتے تھے۔ وہ ان کی بیماری سے بہت خائف تھے اور پاس نہیں بیٹھتے تھے۔ آپا کا خون کھولتا تھا۔"

"حشمت جہاں کے باپ کا خون جوش مار رہا ہے میرا دودھ تو تو نے زہر جان کر اگل دیا۔ ظفر کی نظر بری تھی، اس کے دل میں کھوٹ تھی تو دیوانی کیا جانتی ہوگی۔"

خانم صاحب چپ ہوگئیں۔

"میری بچی کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ ظفر حسین نے حشمت جہاں کو مانگ لیا۔ میری نامراد بچی! اس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر وعدہ لیا تھا کہ حشمت کو ظفر سے بیاہا گیا تو وہ قبر پھاڑ کر نکل آئے گی۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ حشمت جہاں کو زہر دے دوں گی پر ظفر حسین کو ہرگز نہ بیاہوں گی۔"

"تو آپ نے زہر دے دیا۔" میں نے منہ ہی منہ دہرایا۔

"ہاں اپنی جان کے ٹکڑے کو، زندگی کی آس کو، اندھیری رات کی آخری کرن کو، میں نے پیروں تلے مسل ڈالا، خاک میں ملا دیا، پھول کو اژدہے کے منہ میں جھونک دیا، بھسم کر دیا اور اس آنچ میں ساری عمر سلگتی رہی ہوں، جھلستی رہی ہوں۔ ایک الاؤ ہے جو میرے دل و دماغ میں بھڑک رہا ہے۔ زہر ہے جو میری نس نس میں رچ گیا ہے۔" پھوپھی اماں بین کے انداز میں کہہ رہی تھیں آگے پیچھے جھول رہی تھیں جیسے وظیفہ پڑھ رہی ہوں۔

"کوئی اور نہ ملا؟" میں نے لقمہ دیا۔

"جو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ پر تیار ہو جاتا۔ ارے میرا کوئی نہ تھا، تمہارے پھوپھا رات گئے آتے اور صبح دم نکل کھڑے ہوتے۔ میں نے جھک مار کر ان کی منتیں کیں، مگر کیا نام، کیا نام کرتے رہے۔ اور پھر یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ حشمت جہاں ننھے (نسیم بیگ میرے بڑے بھائی جو اس وقت شوکت سے شادی کر چکے تھے) کی ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ جب ظفر اور مسرت کا قصہ نہیں ہوا تھا میرے بھائی اور بھاوج مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ سارا کنبہ ایک تھا۔ کیا خوشیاں منائی گئی تھیں، اللہ یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

"پھر منگنی توڑ دی؟"

"سنتی جاؤ! ظفر حسین نے کہا۔ حشمت کی شادی ہوگی تو مجھ سے ورنہ میں دولہا کو گولی مار دوں گا۔ بات چھپی تھوڑی رہتی ہے۔ جب میں نے بے حیا بن کر بھائی کو لکھا کہ اپنی امانت سنبھالو کہ میری چھاتی کا بوجھ کم ہو، آگرہ اور پھر یہ محلہ مائی تھان، خدا غارت کرے اس پہ بجلی ٹوٹے، ظفر حسین کی دھمکی گلی گلی مشہور ہو گئی۔" میں نے لکھا۔

"جانتی ہوں اماں نے کیا لکھا ہوگا۔ حکم شاہی نازل کیا ہوگا۔"

"ارے تو میں نصیبوں جلی بیٹی کی ماں کس منہ سے کہتی کہ میری بیٹی پر ایک غنڈہ دانت لگائے بیٹھا ہے جو تمہارا چہیتا سالا ہے۔ پہلے تو بھائی نے کہا ابھی لڑکا پڑھ رہا ہے سترہ اٹھارہ برس کا بے قابو

لڑکا اس کی شادی کرنا غلطی ہے تم اپنی بیٹی کی بے شک پال نہیں ڈال سکتیں پڑھائی سے جان چراتا ہے تم بیٹی کی شادی جہاں چاہو کردو۔ میں نے کہا تم نکاح تو کر لو مگر اتنے میں ظفر کو پتہ چل گیا اس نے بہن کو لکھا کہ نسیم میرا پیارا بھانجا ہے مگر میں اس کو گولی مار کر خودکشی کر لوں گا۔"

"اُف ماموں تو پورے ... توبہ۔" میں نے منہ میں آئے لفظ چبا ڈالے۔

"میرے تو حواس گم! میری نامرادی کی، ہائے وہ قبر میں بھی تڑپتی رہے گی۔ ان دنوں میں رات رات بھر جاگ کر ٹہلا کرتی تھی، ایک میں اور ایک بیٹی، ظفر حسین نے دھمکی دی تھی کہ حشمت جہاں کو اٹھوا لے گا۔ میں رات بھر جلیے پیر کی بلی کی طرح گھر میں چکر لگایا کرتی، ذرا سا کھٹکا ہوتا تو دل دھائیں دھائیں کرنے لگتا۔ نیند آتی مگر منہ پر پانی ڈال کر ٹہلنے لگتی۔ یا اللہ ان راتوں میں میں نے کتنے میل کے چکر لگائے ہوں گے۔ کبھی اتنے زور سے نیند آجاتی کہ کھڑے کھڑے آنکھیں بند ہو جاتیں اور میں سو جاتی پھر جب ہوش آتا تب میں ڈھیر ہو جاتی۔ کبھی جی چاہتا حشمت جہاں کا گلا گھونٹ دوں اور پل بھر کے لیے سو جاؤں، پھر اس کے سوگ میں نیند سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ بھائی کی طرف سے ٹکا سا جواب ملا تو کئی دن حواس گم رہے۔ تمہاری نانی زندہ تھیں اور بیٹی کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ چھوٹا بھائی فرحت حسین بھی تمہاری ماں کے ساتھ بیاہ کے دن سے رہتا تھا۔ تمہاری نانی بیوہ ہونے کے بعد سے بیٹی کے پاس ہی رہتی تھیں۔ انھوں نے تمہاری ماں کے دل میں بھائیوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ انھیں دونوں بھائی اولاد سے زیادہ پیارے تھے۔ پھر بھی میں نے فرحت کو بلایا تھا دو ایک بار وہ آیا تھا تو حشمت جہاں پر جس انداز سے اس کی نگاہیں پڑی تھیں ان کا سہارا لے کر میں نے چپکے سے فرحت کو بلایا اور بے حیا بن کر کہا حشمت سے بیاہ کر لو۔ وہ سر سے پیر تک کانپنے لگا اور زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ میں نے کہا کیا بات ہے میاں! کہنے لگا میری ایسی قسمت کہاں جو اُن جیسی لڑکی ملے۔ میں مجبور ہوں بھائی صاحب من موجی ہیں۔ وہ کہتے ہیں حشمت سے جو شادی کرے گا اسے گولی مار کر خود پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔ میری ماں دو بیٹوں کی موت پر کیسے زندہ رہیں گی۔ میں نے ماں کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا، اتنا بڑا غم بڑھاپے میں کیسے دے سکتا ہوں۔ فرحت کی چند ماہ بعد تمہاری اماں نے شادی کر دی۔"

"یا خدا قہاری اور جباری تو نے بندوں کو کیوں سونپ دی۔"

"میں نے پھر کوشش کی اور اسحاق حسین کو بڑی ترکیبوں سے بلایا۔ اسحاق سات آٹھ جماعتیں پڑھ کر آوارہ گردی میں پڑ گئے تھے۔ میں نے بے حیا بن کر شادی کی درخواست کی مگر اسحاق کی سٹی گم ہو گئی وہ میرے بھائی کے ٹکڑوں پہ پلا تھا، بھائی کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا ظفر کی دھمکیاں زور باندھ رہی تھیں۔

میں نیم پاگل ہو چکی تھی گرمی گھٹن میں دِن میں حشمت جہاں کو کال کوٹھری میں بند کر کے بڑا سا تالا لگا دیتی اور دروازے کے سامنے پلنگ بچھا کر سو جاتی حشمت مچھروں والی کال کوٹھری میں گرمی میں ابلتی رات رات بھر رو کر بتاتی۔ اللہ ظفر حسین، خدا تجھے سمجھے۔ کتّے کی موت مرو۔"

ظفر حسین جو شوکت آپا کے باپ اور میرے بڑے ماموں تھے۔ ہمیں اُن سے گھن آ رہی تھی۔ انھوں نے بارہ برس سوگ منا کر دوسری شادی کر لی تھی نئی ممانی بڑی معصوم اور اللہ والی تھیں ہر وقت تلاوتِ قرآن اور نفلیں پڑھا کرتی تھیں کتنی محبت کرتے تھے ماموں، اور میرا تو خاص طور پر بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ برسوں بیتی ہوئی ان کی زیادتی ایک لطیفہ بن چکی تھی۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہماری پیدائش سے پہلے ماموں نے کیا گل کھلائے تھے۔

"اب میرے لیے بس ایک راستہ رہ گیا تھا یاقوت تمہارے پھوپھا کا سگا بھانجا کہیں چپراسی تھا نام کو مگر خدا جانے کیا دھندہ کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں گو ا یاریں عورتوں کی دلالی کرتا تھا۔ باپ بچپن میں مر گئے، ماں نے نہ جانے کیا دکھ جھیل کر بیٹے کو پالا تھا۔ ہڈی میں کھوٹ نہ تھا بس میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے بلا کر چٹ نکاح کر دیا۔"

"اور ایک رات کے بعد"

"میں نے اُسے نکال دیا۔ وہ موا درندہ تھا میری کچی کلی کے دل میں اس کی دہشت بیٹھ گئی۔ میں پکڑ نہ لیتی تو کلائی کی رگ کاٹ ڈالتی۔ تب تم فیصلہ کر دو بی کہ میں کہاں بھول کی تھی۔"

مجھے زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میری پھوپھی کتنی دکھی ہیں۔ انھیں کسی نے دنیاداری نہیں سکھائی، زنانہ سیاسی ہتھکنڈے نہیں سکھلائے۔

میری ماں ایک بھرپور عورت تھیں،

اور پھوپھی اماں ادھوری عورت تھیں۔

رات کو میں اور خانم صاحب سر جوڑ کر باتیں کرتے رہے۔

"آپ طلاق کیوں نہیں لیتیں"

"ہندوستان کے علما نے خلع کو مسلم لا میں شامل نہیں کیا۔"

"وہ کیسے؟"

"جب انگریز حکومت جم گئی تو قانون سازی کے وقت ہر فرقہ کے رہنماؤں سے رائے لی گئی۔ ہمارے عالموں نے خلع یعنی عورت کو طلاق لینے کے حق کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی کسی نے حق

طلاق کی مانگ نہیں کی۔ روشن خیال والدین حق طلاق الگ سے لکھوانے کے حق میں تھے مگر شادی کے موقع پر حق طلاق پر لوگ ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ خود میرے بھائی جسیم نے عین شادی کے دن کہہ دیا، حق طلاق کو وہ منحوس سمجھتے ہیں بیٹی والے مجبور ہو گئے۔ خواجہ عبدالمجید جو خواجہ فیملی کے روشن خیال بزرگ تھے حق طلاق پر زور دیتے تھے۔ وہ خود نکاح پڑھاتے تھے اور اگر لڑکے حق طلاق پر تیار نہیں ہوتے تھے تو وہ نکاح نہیں پڑھاتے تھے کم از کم علی گڑھ میں تو انھوں نے حق طلاق کے لیے بڑی جدّوجہد کی اور بہت سے خاندانوں میں حق طلاق پر اصرار ہونے لگا۔

دوسری رات رہنے کی ضرورت نہ پڑی اور ننھے بھائی آکر ہمیں پنجہ شاہی لے گئے۔ پہلے تو میں نے اُن سے ہی اُلجھنے کی کوشش کی کہ وہ وکیل ہیں۔ خانم صاحب کی طلاق کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

"یہ علت ہے۔" وہ حسب عادت ٹال گئے، میں بکتی رہی اور وہ بالکل بے توجہ گھٹنا ہلاتے رہے، مسکراتے رہے۔

"میں گھوڑی والا گھر بیچنا چاہتی ہوں۔ اُس کے کاغذات آپ کے پاس ہیں۔" میں نے عاجز آکر بات پلٹی۔

"ہاں ہیں، مگر کیوں بیچنا چاہتی ہو۔"

"ٹیچر ٹریننگ کا کورس کرنے انگلینڈ جاؤں گی۔"

"کیا کرو گی ٹریننگ کر کے؟"

"نوکری کروں گی۔"

"کیوں؟"

"ارے، آپ کیوں وکالت کرتے ہیں؟"

"غلطی کرتے ہیں ہم تو۔"

"تو ہم بھی غلطی کریں گے۔"

"زبردستی ہے کچھ، ہم نہیں کرنے دیں گے تمہیں غلطی تم ہماری پیاری بہن ہو۔" ننھے بھائی جی جلانے میں ماہر تھے ان سے بحث کرنا ناممکن تھا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"وہ گھر ہم نے تو بیچ بھی دیا۔"

"کیسے؟ میرے دستخطوں کے بغیر؟"

"تمہارے دستخط ہم نے خود کر دیے۔"

"یہ تو بے ایمانی ہوئی۔"
"قطعی بے ایمانی ہوئی۔"
"کیوں کی آپ نے بے ایمانی۔"
"ہماری مرضی۔"
"آپ پر مقدمہ چل سکتا ہے۔"
"ضرور چل سکتا ہے۔ مگر ہم نے تو سب پیسے بھی خرچ کر دیے۔"
"کاہے میں خرچ کر دیے؟"
"کچھ کھا ڈالے کچھ شوکت کو دے دیے۔ یہ بچہ وچہ دینے والی ہیں، اور سونے کے کڑے بنوائے ہیں۔"
"دکھاؤ شوکت اپنے کڑے، پتہ ہے ہم نے خود بنائے ہیں، آٹھ تولے کے کڑے۔"
وہ اس سادگی سے بولے کہ کوشش کے باوجود مجھے غصہ نہ آسکا۔
"آپ مقدّمہ ہار جائیں گے تو؟"
"تو کیا؟"
"جیل جائیں گے۔"
"اور کیا۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ غصہ بھی آرہا تھا ہنسی بھی آرہی تھی۔ ننھے بھائی بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔
"ولایت جانا چاہتی ہو؟"
"ہاں۔"
"تو چلی جاؤ۔"
"مکان تو آپ نے مار لیا، اب کیسے چلی جاؤں۔"
"تیرنا آتا ہے؟"
"کچھ یوں ہی سا۔ علی گڑھ میں سوئمنگ پول میں دو چار دن چھپ چھپ کیا تھا۔"
"ایسا کرو ہمارے ساتھ روز جمنا میں تیرنے چلو، ایک ہفتہ میں فرّاٹے بھرنے لگو گی۔"
"اونہہ تیرنا سیکھنے سے اور ولایت جانے سے کیا تعلق؟"

"ارے بھئی مزے سے تیرتی چلی جاؤ۔"

"اور سامان، ننھے میاں آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں" شوکت آپا بولیں۔

"سامان کی کیا ضرورت ہے؟"

"لو بھئی سامان کی ہی ضرورت نہیں۔ آپ تو بے سمجھے بوجھے بات کہہ دیتے ہیں" شوکت آپا چڑھ گئیں "سردی میں ٹھٹھر کے مر نہ جائیں گی سوئیٹر، گرم کوٹ، کپڑے۔"

"ارے کچھ مشکل نہیں۔ موم جامے کے تھیلے میں سب ٹھونس کے ایک رسی سے کمر میں باندھ لینا۔"

"اور مچھلیاں، یہ بڑی بڑی دہیل مچھلی، ہاتھی کو بھی ہڑپ کر لے، کیا باتیں کرتے ہیں۔ ننھے میاں۔"

"ارے ایک لمبا سا بانس لے کے پانی پر پھٹکارے چلو مچھلی پاس نہیں پھٹکے گی۔"

"پھ پھوپھو" نعیم ان کے صاحبزادے ہکلائے "ہہ ہہ ہم بھی چلیں گے ولایت۔"

"ہاں بھئی تم بھی چلے جانا، مگر گدھے پہلے تیرنا سیکھو۔"

مجھے معلوم ہو گیا کہ میری کھنچائی ہو رہی ہے۔ ننھے بھائی نے کبھی مجھ سے سنجیدگی سے بات نہیں کی۔ میں نے جل کر ناپک بدل دیا اور خانم صاحب کے ساتھ جو ظلم ہوا اُس کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اتنا بڑا خاندان اور ایک لڑکی پر کیا بیت گئی کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔"

"ارے شوکت!" ننھے بھائی ایک دم چونک پڑے "نعیم بہت سر کھجا رہا ہے۔ دیکھو اگر ایک بھی جوں پڑ گئی تو ہم اس کا سر منڈا دیں گے۔" ننھے بھائی نے ایک دم پٹری بدلی۔

"ارے واہ بے کار میں سر منڈا دیں گے۔ منڈا کر تو دیکھیے۔"

"زیادہ گڑبڑ کرو گی تو ہم اپنا بھی سر منڈا دیں گے۔"

"ہوش میں رہنا، خواہ مخواہ منڈا دیں گے۔"

"تو اس کے سر میں ابھی کنگھی کرو۔"

"اب اس وقت نہ جانے کنگھی کہاں پڑی ہو گی۔ کل ڈھونڈوں گی۔"

"ابھی ڈھونڈو ورنہ ہم ابھی سر منڈاتے ہیں۔"

"بہن تم ڈھونڈ دو۔ میرا تو سر چکرا رہا ہے۔"

جی چاہا کہہ دوں میرا خود ننھے بھائی نے جو چک پھیریاں دی ہیں ان سے سر چکرا رہا ہے مگر

ننھے بھائی سے الجھنا بے کار ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے معصوم بے معنی جواب دیتے، گھما کر کہیں کی بات کہیں لے جانے میں ماہر، گھنٹوں بے معنی بحث کر لیجیے۔ جلی کٹی سنائیے قطعی جو نوٹس لیں۔ ننھے بھائی سے کبھی کوئی نہیں جیت سکتا۔ وہ کسی بات کا جواب سنجیدگی سے نہیں دیتے تھے عجیب مٹی کے بنے تھے مگر جودھپور جا کر میں نے بڑا ہنگامہ مچانے کی کوشش کی۔ اور تو اور ایک دفعہ بڑے ماموں سے پوچھ لیا۔

"بڑے ماموں آپ حشمت آپا سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

بڑے ماموں نے مجھے غور سے دیکھا جیسے میرے سر پہ سینگ نکل آئے ہوں۔ اماں سناٹے میں رہ گئیں۔

"ارے جبھی دل آ گیا ہو گیا" شمیم نے بڑی سنجیدگی سے لقمہ دیا۔ ماموں نے جیسے سنا ہی نہیں اس گھی کے پیپے کا ذکر چھیڑ دیا جو وہ سوائی مادھوپور سے اماں کے کہنے پر منگوا رہے تھے۔

"پیسے دوں؟" اماں بولیں۔

ذرا سوچیے آپ کوئی شاندار بھاشن تیار کر کے سبھا میں جائیں اور سامعین کبڈی کھیلنے لگیں تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔

"نہیں آپا بعد میں لے لیں گے۔"

"کیوں بڑے ماموں دل آ گیا تھا نا؟" شمیم نے بات بڑھانے کی کوشش کی۔ وہ قطعی بات کو مضحکہ خیز رنگ دینے کی کوشش پر تلا ہوا تھا۔

"کھانا تو اچھا ہوتا ہے مائی تھان کا" ماموں نے بڑی خوش مزاجی سے پوچھا۔

"ہاں!"

"اور گاجر کا حلوہ ناشتہ پہ کھایا ہو گا"

"مزیدار تھا مگر خانم صاحب کی زندگی . . ."

"یہ تم نہیں گاجر کا حلوہ بول رہا ہے" ماموں نے نہایت خوش مزاجی سے کہا اور ابا کی مزاج پرسی کے لیے باغیچہ کی طرف مڑ گئے۔

"یہ بھی کوئی طریقہ ہے بڑوں سے بات کرنے کا؟" اماں بڑبڑائیں۔

"مگر خانم صاحب کی زندگی . . ."!

"اے بس بڑبڑ نہ کرو۔ بی اے کیا پاس کر لیا دھونس جمانے لگیں"

"لیکن میں . . ."

"اے دلہن، ہانڈی جل کے خاک ہو گئی"۔ اماں نے ایک دم پٹری بدلی۔

"مگر آپ نے بڑے ماموں کا ساتھ دیا"

"ہاں دیا"

"کیوں؟ جب کہ ...."

"ہماری مرضی، کیا تمہاری دھونس ہے؟ بیگم جب کما کے کھلانے لگو تب جوتیاں مارنا"

"افوہ مگر"

"تم نے میری کبھی سُنی، جو دل میں آیا کیا"

"میں نے ...."

"تو پھر ہمارے مُچلکے کیوں لینے بیٹھ گئیں۔ حواسوں میں رہو، آئندہ کبھی ظفر کے مُنہ لگیں تو اچھا نہ ہوگا ... اے دلہن، گوشت گل گیا ہو تو گھیاں ڈال دو"

"لعنت ہے بھئی یہ الو کی پٹھی گھیاں روز پک جاتی ہیں" شمیم روہانسے ہو گئے۔

"اے واہ یار، اروی گوشت اس پر گرم مصالحہ چھڑکا ہوا اور نیبو، کیا کہنے ہیں، پر گرم گرم روٹیاں بھی ہوں" مجیب بولے۔ بڑی آپا کے بڑے بیٹے۔ ہمارے بھانجے جو چنّو میرے چھوٹے بھائی سے چند ماہ چھوٹے تھے۔

"یار تو نرا لیچر ہے۔ گھیا کھا کر اور چیکو ہو جائے گا اور جمو کی جان کو لاگو ہو جائے گا" جمو یعنی جمیلہ چھوٹے ماموں فرحت حسین کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ انھیں جمیلہ سے کافی عرصہ سے لگاؤ تھا جو خطرناک عشق کی طرف بڑھ رہا تھا، ممانی جان اِس چکّر کے سخت خلاف تھیں۔

میرا دل خواہ مخواہ بیٹھا جا رہا ہے۔ کیسے بے حس ہیں ہم لوگ۔ خانم صاحب کے لیے جو ٹیس میرے دل میں اٹھ رہی تھی کسی کو ان سے دلچسپی نہیں تھی۔

عظیم بھائی کا خط آیا تھا کہ جاورہ فوراً آجاؤ۔ وہ ریاست جاورہ میں چیف جج ہو گئے تھے اور بڑے زور شور سے براجے تھے۔ میں ویسے بھی ہمیشہ چھٹیاں ان کے ہاں گزارا کرتی تھی۔

میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور جاورہ پہنچ گئی۔ میں نے تار دے دیا تھا۔ اسٹیشن پر پانچوں بچے مع دلہن بھابی کے اور جاورے میں اماں کے میکے کے رشتہ دار موجود تھے مجھے بغیر برقع کے دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ چچا سرفراز تو مڑ کر ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔

عظیم بھائی خاندان سے بچھڑ کر بڑے اکیلے ہو گئے تھے۔ انھوں نے ننھے بھائی کو بلانے کی انتھک

کوشش کے بعد انھیں ریاست کے ریونیو سکریٹری کے عہدے پر چپکا ہی دیا۔ نواب صاحب ان کو بہت مانتے تھے اور بس ننھے بھائی دو چار دن میں آنے ہی والے تھے۔

ننھے بھائی کی صحت بہت اچھی ہو رہی تھی۔ رات میں دو چار بار ہی کھانستے تھے۔ ایک وسیع بنگلہ ملا ہوا تھا۔ کافی بڑا باغ تھا۔ دلہن بھابی بہت خوش تھیں میری بڑی خاطر کرتی تھیں بچے بھی مجھ سے ہمیشہ چپٹنے کے عادی تھے۔ ان کے چھ بچے تھے نمبر دو بیٹی مدحت کو انھوں نے بڑی بہن کو گود دے دیا تھا باجی کے جیٹھ کی بیٹی تھیں، وہی انھیں بیاہ کر لائی تھیں باجی کے اولاد نہیں تھی انھوں نے انا کے اچانک چلے جانے کے بعد مجھے سنبھالا تھا۔

جاورہ میں میری آمد کی دھوم مچ گئی۔ بی اے اور وہ بھی مسلمان لڑکی قطعی معجزہ تھا۔ وہاں تو دو چار ہی گریجویٹ تھے اور ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی صرف ہیڈ ماسٹر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی تھے۔

نواب صاحب میری آمد سے بہت خوش تھے اور بڑی تیزی سے مجھے جاورہ میں کھپانے کے جتن ہونے لگے۔

# پھر علی گڑھ چھوٹا

ننھے بھائی نے ہمیشہ آزاد بچھڑے کی سی زندگی گذاری تھی۔ بے حد آوارہ، خودسر اور آرام طلب تھے منے بھائی کے سوا سب کو دھمکانا رعب جمانا اور ٹھکائی بھی کرنا۔ منے بھائی ہمیشہ کے بیمار تھے وہ انھیں بالکل اپاہج اور لاچار سمجھ کر ان پر رحم بھی کھاتے تھے اور بے حد محبت بھی کرتے تھے جبکہ منے بھائی کو ان کی آزادروی، اچھی صحت اور جامہ زیبی پر رشک آتا تھا۔ منے بھائی پر کوئی کپڑا نہ سجتا اور ننھے بھائی کا جسم اتنا سڈول قد اونچا کہ بنیان اور نیکر ہی میں بڑے بانکے لگتے تھے اور اپنی کوگی لمبی دار ٹانگیں کھولتے منے بھائی کو خوف آتا تھا۔

اتنا سب کو معلوم تھا کہ ایک کے پاس اگر حسین جسم ہے تو دوسرے کے پاس بے حد تیز اور زندہ دماغ۔ منے بھائی جب بھی ننھے بھائی کو گھوڑے پر سرپٹ دوڑتے باڑیں پھلانگتے دیکھتے تو ان کا منہ ذرا سا ہو جاتا تھا اور وہ ننھے بھائی کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالتے۔ مگر وہ ساتھ ساتھ انھیں سب بھائی بہنوں سے زیادہ چاہتے بھی تھے۔ جب دمہ کا دورہ پڑتا یا درد گردہ سے مچھلی کی طرح تڑپتے تو ماں باپ کے بجائے ہمیشہ ننھے بھائی کو پکارتے۔

ننھے بھائی کبھی ان کی اس حرکت کا برا نہیں مانتے۔ ایسی عجیب نظروں سے مسکرا کر دیکھتے کہ منے بھائی پانی ہو جاتے، جیسے کہہ رہے ہوں۔

"تم ادھورے انسان ہو، قابل رحم ہو۔"

عجیب محبت اور نفرت کا کھیل تھا۔

ننھے بھائی جھگڑے بھی تھے، خوش مزاج بھی تھے۔ ان سے لوگ ڈرتے بھی تھے اور پسند بھی

کرتے تھے۔ ایک ماں کے دو بیٹے قطعی کسی بات میں نہیں ملتے تھے صورت ناک نقشہ، عادت سب الگ۔ منے بھائی کو دکھ تھا کہ لوگ ان پر رحم کھاتے ہیں ان کی فکر کرتے ہیں اور ننھے بھائی سے مرعوب ہیں۔ جب انھوں نے باوجود بیماری کے بڑی آسانی سے بی اے کرلیا تو ایک دن قریب قریب اسی آسانی سے سیکنڈ ڈویژن میں ننھے بھائی نے ایف اے، پھر بی اے کرلیا۔ اور مزہ یہ ہے کہ انھیں کسی نے پڑھتے نہیں پکڑا، نہ جانے کہاں جاکر پڑھتے تھے۔

بچپن میں کوئی پوچھتا کس سے شادی کرے گی تو میں فوراً کہتی ننھے بھائی سے اور جب نو دس برس کی شوکت آپا نے اعلان کیا کہ وہ ننھے بھائی سے شادی کریں گی تو میں نے انھیں خوب کھسوٹا اور ننھے بھائی سے شکایت کردی۔ انھوں نے شوکت آپا کی چٹیا پلنگ کے پائے سے باندھ دی اور شوکت آپا سے بولے۔

"بتا! اب کرے گی شادی؟" شوکت آپا نے فوراً توبہ کی اور جان بخشی ہوئی ان کی۔ یہ بات سب کے ذہن سے اتر گئی مگر شوکت آپا نہیں بھولیں۔

اور ایک دن انھوں نے خاندان کے سب سے زیادہ سجیلے اور وجیہہ نوجوان کو پا ہی لیا۔ کبھی دل میں شبہ لرزا اٹھتا ہے، شوکت آپا کو ننھے بھائی سے نہیں غیرارادی طور پر ان کی شخصیت اور رعب سے عشق تھا۔ وہ "ولی عہد" سے شادی کرکے پورے خاندان میں ایک مقام حاصل کرنا چاہتی تھیں بڑے پیارے پیارے خواب دیکھا کرتی تھیں ایک دن کہنے لگیں۔

"ننھے میاں وکالت کرکے لندن جائیں گے بڑا عہدہ پائیں گے اور انھیں سر کا خطاب ملے گا اور ہم لیڈی نسیم کہلائیں گے۔"

غریب کا سارے گھر نے اتنا مذاق بنایا کہ رودیں۔ ننھے بھائی نے خود انھیں بہت چڑایا اور جب وہ انھیں لیڈی نسیم کہہ کر پکارتے تو شوکت آپا دھاروں دھار روتیں۔

شوکت آپا نے بڑے ذہنی دکھ جھیلے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ رل گئی تھیں۔ ماموں جودھپور میں یار دوستوں کے جگھٹے میں دو چھوٹے بچوں یعنی جگنو اور شوکت آپا کی دیکھ بھال نہیں کرسکتے تھے اس لیے وہ اپنی پھوپھی یعنی ہماری اماں کے ہاں رہتی تھیں۔ اماں کو اپنے ہی بچوں سے لاڈ کرنے کی فرصت نہ تھی صورت سے اکتا چکی تھیں وہ کسی کے بچہ کو خاک پیار دیتیں۔ جگنو نے عجیب طبیعت پائی تھی چھوٹی سی عمر سے ہی نہایت سنجیدہ اور سیدھے تھے خود کبھی شرارت نہیں کرتے تھے اور نہ کبھی کسی کی شکایت کرتے تھے گھر میں وہی ایک بچے تھے جن پر نہ کبھی ڈانٹ پڑتی نہ مار۔ ماں کو موت نے باپ کو حالات نے چھین

لیا تو وہ عمر سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے۔ مجھ جیسی بد لڑکی کو بھائی چھیڑتے مارتے ستاتے۔ جگنو نے کبھی نہ مارا نہ ستایا۔ سارا گھر انھیں پیار کرتا تھا نوکر جو ہم بچوں کی حرکتوں سے نالاں تھے جگنو پر سب مہربان تھے۔ نہایت خاموش طبع ہونے کے باوجود ذہین اور کھیل کود میں اپنی عمر سے زیادہ تیز تھے۔ کبھی کوئی بچپنے کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔

شوکت آپا اپنی نانی یعنی ہماری خاندانی دشمن بچھو پھوپھی پر جان چھڑکتی تھیں یہ ایک قسم کی غداری سمجھی جاتی تھی جگنو کبھی ان کا نام بھی نہ لیتے تھے نہ برا نہ اچھا بس خاموشی اختیار کر لیتے۔ معصوم شوکت آپا خدا جانے ان کے ننھے سے ذہن پر کیا بیتتی ہوگی وہ ضد کر کے نانی کے پاس جائیں وہ اچھے موڈ میں ہوتیں تو لاڈ کرتیں اور ایک دم یاد آجاتا کہ یہ اسی ناہنجار ظفر حسین کی بیٹی ہے جس نے ان کی لاڈلی مسرت جہاں کو تکلیف دے دے کر مارا تو ان پر بے پناہ غصہ سوار ہو جاتا اور وہ شوکت آپا کو واپس پھوپھی کے ہاں پھنکوا دیتیں۔

تب انھیں سب چھیڑتے طعنے دیتے۔

انسان کن کن طریقوں سے دوسرے انسان کا خون بہاتا ہے بزرگوں کے جھگڑوں میں معصوم بچوں پر کیا کچھ گزر جاتی ہے۔ نفرتوں کے بیچ میں پلنے والا بچہ دل و دماغ پر کیسے کیسے زخم سہتا ہے یہ زخم ہمیشہ کسی نہ کسی ٹھیس پر رسنے لگتے ہیں۔

نفرت کا ایک طوفان سہتے شوکت آپا جوان ہوئیں اور اپنی دانست میں انھوں نے رحم زماں کی پناہ پائی اور اپنی سلطنت کی بنیادیں مستحکم کرنا شروع کیں کاش اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی بڑے بھائی جگنو کی بردباری سوجھ بوجھ اور صبر بھی انھیں دیا ہوتا۔ کسی رشتے دار کے ٹکڑوں پر رہنا اور جواب میں عزت اور محبت مانگنا، دھونس جما کر مانگنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ جگنو تو نوکروں تک میں ہردلعزیز تھے کبھی کسی پر حکم نہیں چلاتے اور ان سے بڑے تمیز سے باتیں کرتے۔ نوکر شوقیہ ان کا کام کرنے پر مُصر ہوتے۔ سب پیسوں کی ضد کرتے جگنو بے تعلق کسی کام میں خاموش جٹے رہتے۔ اماں جگنو بھائی کو دیکھتیں تو ان کا جی بھر آتا۔

"ارے تو نے نہیں مانگے پیسے جگنو!"

"اماں ابھی ہیں پیسے ہمارے پاس۔" جگنو پھوپھی کو اماں کہتے تھے۔

اور اماں انھیں ڈانٹ کر پیسے دیتیں۔ پھل مٹھائی کتنا بھی جی للچائے کبھی جھپٹا مار کر نہیں چھینی۔ اس لیے اماں سب سے پہلے جگنو کا حصہ نکالتیں اور شوکت آپا کو ہمیشہ بھول جاتیں۔

شوکت آپا کی آئیڈیل پھوپھی تھیں جنھیں خود میں نے بہت دیر میں پایا۔ انھیں بے ماں کی بچی پر پیار آتا تو کلیجے سے لگاتیں، پھر پرانے زخم تازہ ہونے لگتے تو دھتکار دیتیں۔

عورت ہمیشہ سے ننھے بھائی کی کمزوری رہی تھی بہت ہی کمسنی میں وہ اس کے وجود سے واقف ہو گئے تھے اور پھر شوکت آپا نوخیز کلی، سولہ سترہ کا سن، بالکل لٹو ہو گئے۔ صبح اٹھتے ناشتہ کمرے ہی میں منگا لیتے، سیدھے کالج جاتے وہاں سے سیدھے کمرے میں، چٹخنی چڑھ جاتی۔ رات کا کھانا بھی کمرے میں منگا لیتے، پھر چٹخنی چڑھ جاتی۔

وہ بھائی جو ہم سب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتے تھے بالکل ہی غائب ہو گئے۔ گھر میں آتے ہی ہلچل مچا دیتے، اسے چھیڑنا، اُسے ستانا، بچوں کو اچھالنا، گدگدانا۔ ابا سے شکار کے بارے میں مباحثہ، پھر اماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ مگر شادی کے بعد وہ شوکت آپا کے ہو کر رہ گئے۔

سارا گھر ننھے بھائی اور شوکت آپا سے دل ہی دل میں کھنچنے لگا گو منہ سے کسی نے کچھ نہ کہا۔

ادھر منے بھائی اور دلھن بھابی پرانے بیاہے تین بچوں کے والدین اتنی چٹخنیاں نہیں چڑھتی تھیں اور ننھے بھائی کو مشغول پا کر ان لوگوں نے زیادہ وقت مجمع کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔ منے بھائی بڑے جابکدستی سے ننھے بھائی کی غیر حاضری پر تاسف کرتے۔ دلھن بھابی بھی زیادہ وقت اماں کے پاس گزارنے لگیں۔

ہم سب کو عادت تھی کہ جیسے ہی ننھے بھائی گھر میں داخل ہوتے سب انھیں گھیر لیتے۔ کچھ نہ کچھ ان کی جیبوں سے نکل ہی آتا۔ خاص طور پر اگر کالج میں کوئی پارٹی ہوتی تو جیبیں سوکھے میوے ٹافیوں سے بھری ہوتیں۔ ہم ان پر ٹوٹ پڑتے اور لوٹ کر رکھ دیتے۔

اب شوکت آپا ٹافیوں کے کاغذ دکھا کر کہہ دیتیں "سب ختم ہو گئیں۔" ویسے بھی دلھن بھابی غیر ہوتے ہوئے بہت قریب لگتی تھیں، ہم سب کے ساتھ تاش پچیسی کھیلتیں۔ شوکت آپا کو ان کھیلوں سے دلچسپی ہی نہیں تھی، مجبوراً ننھے بھائی نے بھی کھیلنا چھوڑ دیا۔ آج سمجھ میں آتا ہے کہ بہو سے ساس نندیں کیوں جلنے لگتی ہیں۔

شکر خدا کا کہ ہمیں نہ بھائیوں کی کمی تھی نہ بھاوج بھتیجیوں کی، بس ایک دم ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے ننھے بھائی اور شوکت آپا گھر میں رہتے ہی نہیں۔

ایک اور واقعہ ہوا جس سے دل میں بڑی تلخی پیدا ہوئی۔ کوئی خط میرے نام آیا وہ ننھے

"تم کیا کرلو گے ہمارا ؟"

"بولو شوکت ہم کیا کریں ان پاجیوں کا ؟ یہ تو نہیں مانتے ۔" ننھے بھائی اپنی پرانی معصومیت سے بولے ۔

"میں کیا جانوں ۔" شوکت آپا کی حالت غیر تھی پاؤں بھاری تھا وہ اٹھ کر نے بھاگیں ۔

"چڑیل کتنا اتراتی ہے ۔" شمیم بڑبڑائے ۔

"مگر ننھے بھائی مسمّی شوکت، یعنی درحقیقت رشتہ کی رو سے ان کا مطالبہ قطعی جائز ہے کیوں سرکار ؟"

"دلیل پیش کی جائے ۔" ابّا نے مجسٹریٹی شان سے کہا ۔

"مائی لارڈ مسماۃ شوکت، بڑے بیٹے کی بیاہتا ہے مستقبل کی پٹ رانی، ولی عہد کی زوجہ انھیں واجب آداب وصول کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے ۔" پھر وہ ہم سے بولے ۔

"تم سب ہماری بیوی کو دلھن بھابی کہتے ہو۔ پھر بے چاری شوکت یعنی بھابی جان کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں ؟"

منے بھائی ہمیشہ آگ پر تیل چھڑکنے کی تاک میں رہتے تھے جب کوئی مُچیٹا ہوتا تو ایسے ایسے جملے تراشتے واقعات کو گھما پھرا کر ایسا الجھاتے کہ سب اس کی لپیٹ میں آجاتے۔ خوب جملے تیکھے نشتایاں چھوٹتیں، بچوں کی زبان پر دھار رکھ جاتی اور ہم سب کا چلوؤں خون بڑھنے لگتا ۔

"ننھے بھائی اب کیا کرو گے ۔"

"اب شوکت قے کر کے واپس آئیں تو رائے دیں گی کہ کیا کیا جائے ۔"

"ہاآں تو تو بڑا جورو کا غلام ہے کہ شوکت کے اشاروں پر ناچتا ہے ۔"

"بے شک ہم نہایت تابعدار جورو کے غلام ہیں۔ سرکار خود جورو کے غلام ہیں ؟"

"اے ہوش میں آ ۔ ۔ ۔ کلموہے ۔"

"ارے، یقین نہ آئے تو پھوپھو پھپھی سے پوچھ لو ۔"

"ہر صلح پسند انسان جورو کا غلام ہے ۔" منے بھائی نے کہا ۔

"آئے ہائے بڑے جورو کے غلام ہیں، ذرا سا کھانا بگڑ جائے تو ری تپیلی موری میں لوٹ دیں ۔" دلھن بھابی بولیں ۔

"بے چارے جورو کے غلام ہی تو تپیلی موری میں لوٹتے ہیں۔ جورو کو نہیں لوٹ پاتے ۔"

"ارے شوکت اب آ بھی چکو، کتنی قے کرو گی ؟"

"اچھا نھنے بیوی کا نام کیوں لیتے ہیں ؟"

"پھر کیا کہیں ؟" ننھے بھائی بولے ۔

"ابا یا منے بھائی کی طرح بیوی یا بیگم کہیں۔" جنتا نے ڈیمانڈ کی ۔

"ہم تو انھیں کبھی خانم بھی کہتے ہیں۔" منے بھائی بولے ۔

"یہ جھول ہے، ہم شوکت کو بیوی یا بیگم کہہ کر پکاریں اور اماں وارد ہو جائیں یا تمہاری بیوی دوڑی چلی آئے تو بڑی بے حجابات ہو جائے گی ۔"

"سخت گھپلا ہے ! مسماۃ شوکت عرف بھابی جان کا مطالبہ جائز ہے اور پبلک کو ماننا ہی پڑے گا ۔"

"ایسی کی تیسی شوکت کی، ہم قطعی اس چڑیل کو بھابی جان نہیں کہیں گے ۔" شمیم بھڑک اٹھے۔ انھوں نے بچپن میں شوکت آپا کو بہت پیٹا تھا ۔

"کہہ تو سکتے ہیں مگر . . ." چنو بولے ۔

"مگر . . ."

"پیسے دو ۔"

"پیسے ؟ "

"کم سے کم دو دو روپیہ مہینہ ۔"

"دماغ خراب ہوا ہے، دو روپیہ مہینہ میری جوتی دیتی ہے ۔" شوکت آپا بگڑ اٹھیں ۔

"فی کس ۔" چنو اڑ گئے ۔

شوکت آپا بگڑ اٹھیں۔ کل تیس روپیہ تو دونوں کو جیب خرچ ملتے تھے اس میں سے . . . اُف حساب لگانے کے خیال سے ہی چکر آنے لگے ۔ "واہ وا میں تو کوڑی بھی نہیں دینے کی ! خرگرگی بھرتی، اور فی کس دو روپیہ اندھیر ہے کہ نہیں ۔"

"بھئی دو دو روپیہ دو تو ہم خود تمہیں بھابی جان کہنے کو تیار ہیں ۔" ننھے بھائی لجاجت سے بولے ۔ "سب پیسے تم دبا لیتی ہو ۔"

"کیوں سرکار آپ کی کیا رائے ہے ؟ " منے بھائی نے پوچھا ۔

"ہم اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتے ۔"

"لیکن چھوٹے چھوٹے بچّے شوکت کا نام لیں، یہ بدتمیزی ہے۔ ننھے بھائی ان کی ٹھکائی کر سکتے ہیں۔" منے بھائی چورن میں نوشادر ملانے کے قائل تھے۔

"ہمیں قطعی کوئی انکار نہ ہوگا۔ ہم ٹھکائی کے لیے تیار ہیں۔" ننھے بھائی آستین چڑھانے لگے۔

جمتا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"سرکار تو کچھ نہ کہیں گے؟" منے بھائی دھیرے سے بولے۔

"نہیں، ہم بچوں کے بیچ میں بولنے کے قطعی قائل نہیں۔ بشرطیکہ مارنے کی وجہ معقول ہو۔" اب بڑی مصیبت آئی۔ ننھے بھائی تگڑے تھے کوئی بہانا بنا کر ٹھوک سکتے تھے اور اتنے شریر بچوں کے لیے بہانا تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، بہانے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

فوراً ایک خفیہ میٹنگ کال کی گئی جس میں جگنو بھی شامل تھے وہ شوکت کے سگے بھائی تھے مگر وہ پارٹی بازی میں یقین نہیں رکھتے تھے اور بڑے سوچ بچار کے بعد انھوں نے ہی یہ ترکیب بتائی کہ "شوکت کا بائیکاٹ کر دو۔ وہ اس طرح کہ چاہے جان پر بنی ہو ان کا نام ہی نہ لو۔"

جگنو گاندھیائی اصول کے پیرو تھے ویسے بھی سب ان سے دبتے تھے۔ جگنو شمیم اور مجیب کو ہوم ورک میں مدد دیتے تھے۔ جسیم بھائی سے بے حد یارانہ تھا۔ مجھے جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اگر وہ شوکت آپا کی حمایت کرتے تو مشکل پڑ جاتی، ہم ان سے بدظن ہو جاتے اور شوکت آپا کو وہ بہت ہی چاہتے تھے۔

بس جناب ہو گئی شروع ستیہ گرہ۔ اِدھر ہم اتنے اُدھر وہ، ننھے بھائی کے کالج جانے کے بعد تن تنہا رہ جاتیں۔ انھوں نے دلھن بھابی کے ساتھ مل کر محاذ بنانا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا دلھن بھابی تاش پچیسی کی شوقین اور شوکت آپا کو دنیا کے تمام کھیلوں سے نفرت۔

شوکت آپا کا دم گھٹنے لگا ہم ان سے قطعی بات نہ کرتے وہ کچھ پوچھتیں تو بالکل ایسے بنے رہتے جیسے سنا ہی نہیں، خود کھسر پھسر کر کے قہقہے لگاتے۔ ننھے بھائی اول تو کچھ نوٹس نہ لیتے اور پھر ان کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔ انھیں آتا دیکھ کر سب نہایت ضروری کام سے تتر بتر ہو جاتے اور ان سے بہت دور جا کر بات بے بات قہقہے لگاتے۔ منے بھائی فوراً ہمارے محاذ میں شریک ہو جاتے اور گروہ بن کر تاش کھیلے جانے لگتے۔ ننھے بھائی کو تاشوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جگنو اتنے پڑھاکو تھے کہ شوکت آپا بلاتیں تو چلے جاتے۔ سوائے شکایتوں کے ان کے پاس دوسرا کوئی موضوع نہ تھا وہ غیر جانبدار بنے خاموش سنتے رہتے پھر پڑھائی میں لگ جاتے۔ اس تنازعے سے جان بچانے کے لیے وہ اپنے دوست کے ہاں

پڑھنے چلے جاتے۔

میری اماں کے بیٹے کہلانے کے اصلی حقدار جگنو تھے پھوپھی بھتیجے کے کردار میں بڑی مماثلت پائی جاتی تھی۔ان کے تعلقات اپنی نانی ہماری بچھو پھوپھی سے بھی بڑے پُرتکلف تھے۔وہ ہمارے بھائیوں اور ابّا میاں کے ساتھ عید، بقرعید جاتے، پھوپھی بادشاہی انھیں بڑی تلخ باتیں کہتیں، پھوپھی کے ٹکڑوں پر پلنے کے طعنے دیتیں مگر وہ بجائے دکھی ہونے کے ہولے ہولے مسکراتے، کہ پھوپھی کا خون کھول اٹھتا۔ جیسے میری اماں پھوپھی کی گالیاں، کوسنے سُن کر مسکراتی رہتی تھیں۔لوگ پوچھتے انھیں بُرا نہیں لگتا۔

"اے واہ مجھے کاہے کو بُرا لگے۔وہ پھوپھی بزرگ ہیں انھیں حق ہے جو چاہیں کہیں۔" اماں بھولی صورت بنا کر کہتیں۔

ہمارے دونوں ماموں ابّا میاں کی بے انتہا عزت کرتے تھے بہن سے زیادہ ان سے عقیدت تھی۔ابا کو ان سے کوئی شکایت نہ تھی کہ انھوں نے ان کی اکلوتی لاڈلی بہن بادشاہی خانم کی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگے۔وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کے قائل نہ تھے۔حالاں کہ پھوپھی اماں کا خیال تھا وہ جورو کے غلام ہیں اور الّو کا گوشت کھلا دیا گیا ہے۔

جگنو ہم سب کو بہت پسند تھے مگر جب ان سے میری شادی کا ذکر چلا اور شوکت آپا کی زبانی مجھے بزرگوں کی رائے کا پتہ چلا تو میں ایک دم لگا بین تڑانے لگی۔

"جانتی ہو جگنو سے تمہاری شادی کے منصوبے بن رہے ہیں مگر میں ہرگز یہ شادی نہیں ہونے دوں گی خدا نہ کرے جو تم جیسی خودسر زبان دراز سے میرے بھائی کی قسمت پھوٹے۔"

"ہنہہ،اس گدھے سے میں کب شادی کرنا چاہتی ہوں۔لعنت ہے۔قبر بجُو، مجھے گھن آتی ہے کمبخت سے۔" میں نے اپنی حمایت میں وہ کچھ کہہ ڈالا جو میں قطعی نہیں سوچتی تھی۔جگنو مجھے بے حد پسند تھے شادی کا تو خیال بھی نہیں آیا تھا مگر صرف جگنو سے نہ میں نے کبھی زبان چلائی نہ بدتمیزی کی،خاصہ رعب تھا حالانکہ وہ چند سال ہی بڑے تھے مگر مجھے اچھی طرح پڑھاتے تھے۔

جب مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ میرے سگے بھائی نہیں،جب میں سوچتی تھی سب لڑکے بھائی ہی ہوتے ہیں،دوسرے کسی رشتہ کا گمان بھی نہ تھا۔

جگنو بھوتوں،پریوں کی بڑی دلچسپ کہانیاں بڑے ڈرامائی انداز میں سُنایا کرتے تھے۔مجھے کبھی نہیں چھیڑا،نہ کبھی میری گڑیا چیری۔اللہ میاں کے بارے میں اُنھیں نے پہلی بار مجھے معلومات پہنچائی۔ انھوں نے بڑی تیزی سے سب سے پہلے قرآن شریف پڑھ لیا تھا۔انھیں وسیم بھائی بہت ستاتے اور

مارتے تھے مگر میں نے ان سے کبھی شکایت نہیں سُنی۔ مذاق میں اُڑا دیتے تھے، کہ راستے میں سارے وقت دھکے دیتے چلتے ہیں۔

مجھے جگنو ہمیشہ بہت پیارے تھے اگر ان سے میری شادی ہوجاتی تو میں ایک نہایت پتی ورتا بن جاتی، مجھے دراز قد مرد پسند تھے اور وہ گھر میں سب سے اونچے نکلتے تھے۔ آج میں اپنی کہانیوں کے ہیرو کو پرکھتی ہوں تو انھیں بالکل "جگنو" پاتی ہوں۔ جگنو کے دل کا حال میں وثوق سے نہیں بتا سکتی ہوں مگر میں نے ہمیشہ انھیں اپنا روحانی محبوب مانا۔ اُف اگر جگنو نے یہ الفاظ پڑھ لیے تو کیا ردّ عمل ہوگا؟

مگر اب میں اور وہ دونوں ردّ عمل کے دائرے سے خارج ہو چکے ہیں۔ وہ ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر، بہترین شوہر، اچھے باپ اور اب تو ماشاء اللہ نانا اور دادا بھی بن گئے ہیں۔ اگر میری شادی ان سے ہوجاتی تو وہ مجھے مٹی کا تودہ بنا دیتے اور ساری سیمابیت ختم ہوجاتی، میری سمجھ بوجھ پر ایک بھاری سا تالا بن کر جم جاتے۔ اس دن سے میرے اور جگنو کے درمیان ایک دیوار سی حائل ہوگئی۔

خدا خدا کر کے شوکت آپا کی زچگی ہوئی، بیٹا پیدا ہوا۔ نہایت تندرست اور پیارا، مگر ہم لوگ اس پر ایسے ٹوٹ کر نہیں گرے جیسے منے بھائی کے بیٹے زعیم عرف بجّو پر قربان ہو گئے تھے۔ ابا بھی بڑے خوش تھے دو پوتیوں کے بعد پہلا پوتا پیدا ہوا تھا۔ نعیم پہلا نہ تھا۔ پہلے ہم نے اسے پیار کرنے کی کوشش کی مگر شوکت آپا نے پابندیاں لگائیں سو رہا ہے جگایا تو ہلکان ہوجائے گا۔ ہم نے منے بھائی کے بچے کو گڑیوں کی طرح استعمال کیا تھا۔ اسکول سے آتے ہی چاہے سوتا ہو یا جاگتا اٹھا لیتے تھے دلہن بھابی کچھ نہیں کہتی تھیں اگر وہ چڑچڑا بن کر رونے لگتا تو ماں کی گود میں ڈال کر کوئی دلچسپی تلاش کر لیتے دلہن بھابی چڑھ جاتیں تو دو دھمو کے بچے کو ہی لگا دیتیں ہمیں کچھ نہ کہتیں۔

اب یہ حال ہوگیا کہ ہم نعیم کو ترسانے کے لیے زعیم سے کھیلتے پیار کرتے۔ رلاتے ستاتے، وہ اس کا عادی ہوچکا تھا۔ نعیم کسمسا تا تو اسے بے توجہی سے الگ کر دیتے۔ اُف یہ نند، دیور بھی بڑے کمینے ہوتے ہیں جو کہ ہم تھے۔

ننھے بھائی سب ہی بچوں کو پیار کرتے تھے۔ منے بھائی کے بچے بیمار باپ سے دور رہتے اور ان سے چپٹتے وہ انھیں اُچھالتے، ہتھیلی پر کھڑا کرتے۔ زعیم باپ کی طرح سوکھا مارا تھا ہلکا پھلکا، تیز طرار، بے انتہا چلبلا۔ نعیم بے حد موٹا اور ذرا ہکلاتا تھا۔ شوکت آپا کو جلانے کے لیے ہم اسکے ساتھ

رُکھائی سے پیش آتے۔

ہاں میں نے اور نیّر نے شوکت آپا کے نرمی اور پیار سے کہنے پر انھیں مفت ہی شوکت آپا کہنا شروع کردیا تھا۔ پھر ہماری دیکھادیکھی مجیب نیّر اور جنّو بھی کہنے لگے۔ شمیم شوکت ہی کہتے اور چُھنّو بات ہی نہیں کرتے ان کی ستیہ گرہ جاری تھی۔

پھر ایک دم ابّا میاں سانبھر میں جج کی حیثیت سے مقرر ہو گئے۔ گھر درہم برہم ہو گیا! ابّا اماں کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ جسیم شمیم مجیب اور حبیب کو ننھے بھائی اور شوکت آپا کی کوٹھی میں چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ابّا میاں سب کا خرچ ننھے بھائی کو بھیج دیتے تھے۔ ابّا میاں کے ساتھ ہی منے بھائی بھی جودھپور چلے گئے۔

جسیم بھائی بڑے تند مزاج تھے۔ شمیم اور جنّو حد درجے کے بدذات۔ مجیب دوسرے جگنو تھے اور حبیب دوسرا چھنّو۔ نہایت شریر اور خودسر۔ جگنو ایف ایس سی کے بعد بمبئی میں ڈاکٹری پڑھنے چلے گئے۔ میں اور نیّر اماں کے ساتھ سانبھر چلے گئے۔ ہماری پڑھائی پر کسی نے توجہ نہ دی۔

لڑکے ننھے بھائی اور شوکت آپا کے بس کے نہیں تھے۔ دونوں کا ناک میں دم کرڈالا! انھوں نے بھی مورچہ قائم کرکے کھانے کی ماردی۔ ابّا کے پاس دونوں پارٹیوں کی شکایتیں جاتیں مگر کوئی علاج نظر نہ آتا۔ نہ جانے شکایتیں کس حد تک صحیح تھیں۔

جسیم بھائی بی ایس سی کرکے آگرہ یونی ورسٹی میں ایم ایس سی کرنے چلے گئے۔ جنّو کو ٹایفائیڈ نے ایسا دبوچا کہ اسے جودھپور علاج کے لیے بھیجنا پڑا کیوں کہ سانبھر میں کوئی اچھا انتظام نہ تھا۔ آپا نے مجیب کو ممانی جان کے ہاں رکھ دیا اور حبیب کو بریلی، سارا نظام تتر بتر ہو گیا۔ ننھے بھائی کے گھر کا خرچ جو ابّا بھیجتے تھے بڑی تنگی سے پورا پڑتا تھا۔

قلم بے دم ہوا جاتا ہے جب علی گڑھ چھوڑنے کا سماں یاد آتا ہے۔ اسکولوں کی چھٹیاں تھیں میری تعلیم کے سب دروازے ایک دم بند ہو گئے۔

میں نے بہت خوشامد کی کہ بورڈنگ میں داخل کرادی جاؤں مگر بے حد سختی سے ڈانٹ دیا گیا بورڈنگ میں لڑکیاں آوارہ ہوجاتی ہیں۔ کسی نے میری ایک نہ سنی۔ نیّر ساتھ جارہی تھی مگر اسکول کھلنے پر آپا اسے سانبھر سے بلالیں گی۔

اُف سانبھر کتنی بھیانک جگہ تھی ہم ریل سے اترے تو پلیٹ فارم ہی غائب۔ بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کہنے کو رتھیں تھیں، بے حد بھدے گھنٹیاں جڑی تھیں مگر چاروں طرف سے ایسی چادریں

لپیٹ گئیں کہ دم گھٹنے لگا۔ رتھ کے دونوں طرف داڑھیاں چڑھائے لمبے تڑنگے راجپوت تلواریں سونتے اونچے اونچے گھوڑوں پر سوار ساتھ چل رہے تھے۔ سرخ انگارہ ڈاکوؤں جیسی آنکھیں، اگر ذرا سا بھی پردہ سرک جاتا تو فوراً جکڑ دیتے۔

باقاعدہ جلوس نکل رہا تھا۔ کچی سڑکوں پر جھٹکے کھاتے خدا خدا کر کے محل کا پھاٹک نظر آیا۔ لمبا چوڑا احاطہ جس کے ایک طرف جیل، قیدی سلاخوں کے پیچھے کھڑے مارواڑی میں تبصرہ کر رہے تھے۔ رتھیں ایک دروازے سے لگائی گئیں، چاروں طرف چاندنیوں کا حصار کھینچا گیا، ان ٹٹ والوں کو جو احاطے کی دیوار کے قریب سے گزر رہے تھے بے پردگی کے خوف سے روک دیا گیا۔

کمبخت محل ایک بوسیدہ تین منزلہ کھنڈر تھا۔ ابا میاں پہلے سے پہنچ گئے تھے۔ نیچے کی منزل میں نوکر اور باورچی خانہ تھا۔ اس کے اوپر زنان خانہ جس میں ہم ٹھونس دیے گئے۔ ایک لمبا سا برآمدہ اور دو کمرے چھوٹا سا گھٹا ہوا صحن اور ایک دالان در دالان۔ اس کے اوپر ابا میاں کے تین کمرے ایک برآمدہ مختصر سی چھت اور ایک کوٹھری تھی۔ ابا کے کمرے ایک لمبی چوڑی چھت پر کھلتے تھے لیکن اس کے دوسرے سرے پر کچہری کے کمرے تھے دن بھر اس چھت کے دروازے بند رہتے اور چھت پر سپاہیوں اور مجرموں کا جمگھٹا رہتا۔ دن بھر ہتھکڑیاں بیڑیاں بجاتے سارے قیدی اترا چڑھا کرتے۔

علی گڑھ کے کچے میونس کے بنگلے بڑے بڑے کشادہ کمرے اور لق و دق صحن پاس ہی لال ڈگی جس میں عموماً بھینسیں نہایا کرتی تھیں مگر تھا تو پانی اور گھنے گھنے درخت، سانبھر کے مقابلہ میں بہشت بریں معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف لہلہاتے کھیت، املی کا جناداری درخت جس میں کونپلیں نکلتیں اور ہم جٹ جاتے، کونپلوں کے بعد پھول کھاتے، پھر چھوٹی چھوٹی کچیاں لونگتے۔ پھر کچی گدر اور پکی املی۔ کنوئیں کے پاس ایک جامن کا پیڑ اور صحن کے بیچوں بیچ نیم کا پیڑ جس میں جھولا ڈال کے ہم اور نیرا اتنا جھولتے تھے کہ رات ہو جاتی اور ڈانٹ پڑتی۔

ہائے علی گڑھ، پیارا دُلارا علی گڑھ! علی گڑھ چھوڑتے وقت ہم بہت روئے۔ سانبھر کے پرانے گھر جس کی دیواروں سے ہر وقت چونے کی پپڑیاں جھڑتیں۔ فرش پتھر کے تھے مگر ہم لوگوں سے پہلے جو لوگ رہتے تھے بڑے ہی سخت مذہبی تھے۔ گوبر کی تہیں لگی تھیں، دیواروں پر بھی ہر طرف دیوی دیوتاؤں کی گیرو میں انگلیاں ڈبو کر تصویریں بنائی گئی تھیں۔ مردانہ بہت صاف ستھرا تھا، پکا چکنا فرش اور ہموار دیواریں۔ زنان خانہ میں بیسیوں بھونڈے طاق اور بے حد نا ہموار گدھول دار دیواریں تھیں

دروازے پرانی بھاری اور بڑی بڑی کیلیں ٹھکی تھیں کہ کھولو تو جیل کے دروازوں کی طرح زور سے چنگھاڑتے تھے۔

اماں نے فرش کھرچوا کے دھلوایا تو نیچے بارش کا سا سماں بندھ گیا نوکر چلّانے لگے۔ فرش چھلنی ہو رہا تھا۔ بھیگے ہوئے گوبر کی سڑاند نے اور حواس گم کر دیے۔ خیر جب سوکھ گیا تو کھرچا گیا۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا بھینسوں کے باڑے میں بیٹھے ہیں۔

میں نے اور نیر نے ایک کمرے پر قبضہ کر لیا جس میں ایک کھڑکی پیچھے گلی میں کھلتی تھی۔ لوگ بڑی سخت چھوت چھات کے قائل تھے۔ مرد تو ابّا میاں سے ضرورتاً ملنے آتے تھے مگر عورتیں کبھی نہیں آئیں۔ ہاں بڑھئی، سلاوٹ، لوہار اور رنگریزوں کی عورتیں کبھی آجاتیں تو وہ نہایت اکھڑ مارواڑی بولتی تھیں کہ کچھ پلّے نہ پڑتا۔

کیا تنہائی تھی۔ اماں نے تو برآمدے میں چوکا بچھوا کر اس پر چاندنی تکیہ لگایا اور بیٹھ کر چھالیہ کترنے لگیں۔

پاس ہی ایک چولھا بنوا لیا، کچھ نہ کچھ پکتا رہتا۔ علی گڑھ میں تنگی دیکھ کر پرانے باورچی ولی محمد چلے گئے تھے انھیں بلوا لیا گیا۔ علی بخش نوکروں کے داروغہ نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا، اس کے علاوہ اماں کے پہنچتے ہی لوگ بچّے لے کر آنے لگے۔ دس بارہ برس کے ہوش لونڈے، آٹھ آنہ مہینہ کھانا کپڑا، چار رکھ لیے گئے، وہ مفت ہی صرف کھانے کپڑے پر رہ پڑے، کسی مصرف کے نہیں تھے، خوب لڑتے اور اتنا کھا جاتے کہ آئے دن ہیضے کی نوبت آجاتی۔

ابّا نے فوراً مرغیاں اور چار کتّے پال لیے مگر بچّوں کی ایسی عادت ہو چکی تھی کہ ان نوکر بچوں کی بھی مرغیوں جیسی دیکھ بھال کرتے۔ سب ہی کے دانت کان اور آنکھیں خراب تھیں بڑی پابندی سے ان کے منہ کھلوا کر دیکھے جاتے اور پرمیگنٹ پوٹاشیم سے کلّیاں کروائی جاتیں، دانت منجھوائے جاتے، آنکھیں بورک پاؤڈر ڈال کر دھوئی جاتیں، پھڑیوں پر مرہم لگتے۔

کمبختوں کے میل کی پپڑیاں جمی تھیں پتھر کے ٹکڑے سے منجھوائے گئے تو گھاؤ پڑ گئے۔

نیچے کافی کوٹھریاں تھیں بڑے ابّا آگرے سے آئے تو نیچے نوکروں والے حصّہ میں ایک طرف رہنے لگے کیونکہ وہ بغیر موری اور غسل خانے کے گزر نہیں کر سکتے تھے۔

کیا وحشت ہوتی تھی، میں اور نیر باقاعدہ پروگرام بنا کر خوب روتے۔ اسے تو چند ماہ ہی گزارنے تھے پھر آپا آکر اسے لے جائیں گی مگر میرا کیا ہوگا مجھے تو کوئی بھی نہیں لے جائے گا۔

سب سے بڑی محرومی کتابوں کی تھی۔ نیتر کے پاس آٹھویں کا اور میرے پاس نویں دسویں کا کورس تھا۔ نہ جانے کس امید پر کورس سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ تہذیب نسواں آتا تھا اس میں مس حجاب اسماعیل کے جو نئی نئی حجاب امتیاز علی بنی تھیں رومانی افسانے ہم دونوں سر جوڑ کر پڑھا کرتے اور پر لگا کر نارنگی کی کلیوں کی مہک آرغنوں کی مدہوش کن موسیقی شمعی انگلیوں اور آسمانی آب رواں کے پیراہنوں کی دنیا میں کھو جاتے۔ نیتر تو واقعی کھو جاتی، میں بڑی بدمزاق تھی میں جل کر کوئلہ ہو جاتی۔ نمک کی جھیلوں کی سڑاند، چونا جھڑتی دیواریں، ٹپکتی چھتیں، بھاری کیلیں جڑے پھاٹک اور بند راہیں، موت کے داخلے کی بھی راہیں بند۔

تب میری سمجھ میں آیا عورتیں ستی کیوں ہو جاتی تھیں۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے مرگھٹ کے پاس سے گزرتے وقت وہ پھاٹک دیکھا تھا جس پر لال رنگ کے ہاتھوں کے نشان تھے۔ چتا پر چڑھنے سے پہلے پتی کی لاش پر جلنے والی عورتیں سرخ رنگ میں ہاتھ ڈبو کر پھاٹک پر چھاپ لگا دیتی تھیں۔ کتنے ہاتھ تھے؟ بعض تو اتنے ننھے ننھے تھے کہ شاید دودھ پیتی بچیوں کے ہوں گے جو اپنے شوہروں کی چتا پر بھسم ہو گئیں۔

وہ ہاتھ اب بھی یاد آجاتے ہیں تو دماغ کی رگوں کو کھرچنے لگتے ہیں۔

مگر جتنا جتنا یہ فضا مجھے کچلتی کوئی فولادی اسپرنگ سا میرے ذہن میں اچھلتا۔ میں واہموں سے برسرپیکار ہو جاتی۔ مرے پہ سو درّے سامان کی کوٹھری میں ایک صندوق کھولا تو پتہ چلا کہ آپا کی جاں فشانی سے جمع کی ہوئی کتابیں ہیں بے حد بوسیدہ اور سیلن کی وجہ سے چپکی ہوئی۔ تہذیب نسواں کی پرانی جلدیں، سہیلی عصمت اور مخزن کے پرچے، مولوی نذیر احمد اور علّامہ راشد الخیری کی تصنیفات، میں اور نیتر دیوانوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔

نیتر جلدی سو جاتی میں پڑھتی رہتی، یہاں تک کہ لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا، تب میں چھت پر جا کر چاندنی میں پڑھتی، راجپوتانہ کا چاند بے انتہا روشن ہوتا ہے، فضا میں نمی کی دھند نہیں ہوتی، میری آنکھیں پہلے ہی بہت کمزور تھیں اور بھی خراب ہونے لگیں۔

میں نے ہوکے میں جلدی جلدی سب پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر خالی ہاتھ رہ گئی۔ عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے پڑھ کر میرے اوپر الٹا اثر ہوا، مجھے سماج سے زیادہ خود پر غصہ آتا، کہیں مجھ میں ہی کسر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنے والدین پر غصہ نہیں رحم آتا، وہ اتنے محدود دائرے میں قید ہیں، وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتے، میری اماں کو میری شادی کی فکر ہے، یہاں مارواڑ میں بر کیسے جڑے گا؟ اپنی بساط

پھر وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہیں جتنا انھوں نے اپنی دوسری اولاد کو چاہا۔ وہ اپنی بیٹیوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی بیٹوں سے، انھیں بیٹوں کی کمائی کھانے کا خیال بھی نہیں آتا، ابا ہی ان کا سہارا ہیں بیٹیوں کو کیسا جی کھول کر جہیز دیا۔ آپا کے بچے بیٹوں کی اولاد سے زیادہ ہی پیارے ہیں۔ اپنی دانست میں مجھے بورڈنگ کی گندی فضا سے بچا رہے ہیں، ذہنی طور پر وہ بچے ہیں، میں ان سے زیادہ بوڑھی ہوں۔

انھیں دنوں چنٹو ٹائیفائیڈ کے متواتر حملوں کی وجہ سے علی گڑھ سے ابا کے کہنے پرجود چھوڑ چلا گیا وہاں اس کا علاج ہونے لگا۔ شمیم کا جو دل گھبرایا، وہ امتحان کو لات مار کر بھاگ آئے۔ امتحان کی فیس ہی نہیں بھری، سارا الزام شوکت آپا اور ننھے بھائی پر رکھ دیا۔

ننھے بھائی نے آکر پول کھولا۔ شمیم فیس لے جاتا تھا اور داخل نہیں کرتا تھا۔

کیا قیامت ہے شمیم پڑھنا نہیں چاہتا اور میرے پڑھنے پر پابندی! شمیم غلطی کر کے اپنی زندگی برباد کرنے کا حق رکھتا ہے، میں زندگی سدھارنے کی حقدار نہیں، کون منصف ہے اس دنیا کا؟ کون میری زندگی کا معمار ہے؟ اگر والدین ہیں تو پھر خدا نے مجھے دماغ کیوں دیا، میں اس کا کیا کروں گی؟

بڑے ابا مجھے اور نیرؔ کو انگریزی پڑھاتے تھے مگر ساتھ ساتھ اپنے شعر سننے پر مجبور کرتے تھے۔ مجھے ویسے ہی شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نفرت ہو گئی مگر پڑھنا تھا اس لیے شعر سننے پڑتے تھے۔

نیر چلی گئی اور میری دماغی صحت ڈگمگانے لگی۔ کتابیں بھی ختم ہو گئی تھیں، جب ہوک اٹھتی تو ابا میاں کی قانون کی کتابیں پڑھنے لگتی، خاک پلے نہ پڑتیں، ڈکشنری دیکھ دیکھ کر پاگل ہو جاتی۔ اس عمر میں خودکشی بہت آسان لگتی ہے اور میں نے بھی خودکشی کے پلان بنائے، رات رات بھر سوچا کرتی، چھت پر سے کود جاؤں تیسری منزل سے سر کے بل! چپکے سے جاکر نمک کی جھیل میں چھلانگ لگا دوں، چند گھنٹوں میں گھل کر آنا ہو جاؤں گی۔

مگر چند گھنٹے! اُف نمک میرے گوشت کو ہولے ہولے چبائے گا پہلے کھال اترے گی پھر گوشت کی تہیں۔ کبھی رات کو ایک کروٹ سوتے بازو سُن ہو جاتا تو ایسا لگتا نمک کی جھیل میں ڈوب رہی ہوں اُبھر رہی ہوں۔ چیخ مار کر میں جاگ اٹھتی۔

پھر ایک دن میں نے اماں کو کہتے سنا۔

"اے ہے میں کوئی نادان ہوں، تین بیٹیاں دو بیٹے بیاہے ہیں۔ جودھپور میں سب کچھ ملتا ہے ویسے میں نے یہاں کے بزاز سے کہلوایا اس نے کہا جیسا مال حکم ہو دم بھر میں حاضر ہو جائے گا۔ بڑے بڑے سیٹھ رہتے ہیں سانبھر میں، سیروں سونے کا زیور ہے ایک ایک کے پاس اور جے پور کا جڑاؤ کام....."

حرکت تیزاب بن کر میرے دماغ کو کھانے لگا اماں نے انجان بن کر ایک خط مجھے دیا کہ ابا میاں کی میز پر رکھ آؤں۔ اس خط میں میرا پیغام تھا اور لڑکے کی تصویر چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک خوبصورت نوجوان گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کیمرے کے لینس کو گھور رہا تھا۔

میں نے منے بھائی کو اسی وقت خط لکھا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ آپ رکوایئے۔ جواب آیا لڑکا میرے دوست کا چھوٹا بھائی ہے، ڈپٹی کلکٹر ہے، مراد آباد کے لوگ ہیں، بڑا خاندان ہے تمہیں بچپن میں دیکھ چکے ہیں، پیغام میرے ذریعہ آیا ہے۔ تم چاہو گی تو پرائیویٹ امتحان بھی دے لینا۔

ہمت ٹوٹنے کے بجائے خون سوار ہو گیا۔

پھر میں نے ترپ کا اکہ مارا۔ میں نے جگنو کو لکھا، خدا قسم تم سے شادی کے لیے زبردستی نہیں کروں گی میری شادی صرف تم رکوا سکتے ہو۔ ماموں کو لکھو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو فوراً سانبھر پہنچ کر شادی رکوائیں۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی تو افسوس ہو گا تمہیں۔

اور میں خودکشی کے پروگرام بنانے لگی۔ موت سے ڈر بھی، پر زندگی سے تو گھگی بندھ رہی تھی۔ پڑھنے کے شوق سے زیادہ میرے دل میں شادی کی ہیبت تھی۔ بچپن سے میرے کان میں ڈالا گیا تھا کہ میں کسی گن کی مالک نہیں، جس کے گھر جاؤں گی، گھورا کر دوں گی۔ منہ پھٹ زبان دراز دو دن میں خصم طلاق دے کر میکے پھنکوا دے گا۔ احساس کمتری میری رگ رگ میں سما چکا تھا۔ نہ صورت، نہ شکل، مجھ پر کون احمق جان دے گا؟ جو چیز میرے نصیب میں نہیں اس کے لیے ترسنے کی بجائے کیوں نہ اسے خود ہی ٹھکرا دوں۔ شادی ہی نہیں کروں تو کون احمق مجھے طلاق دے گا۔ میں پڑھ لکھ کر خود مختار بن جاؤں گی، میاں کے ٹھکرانے کے بعد بھاوجوں کے بچے پال کر زندگی نہیں گزاروں گی۔

چند دن کے اندر بڑے ماموں سانبھر پہنچ گئے، اماں، ابا سے باتیں ہوئیں مجھے معلوم تھا جگنو سونے کا لڈو ہے۔ سارے خاندان کے بیٹیوں والے اس پر دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ میرے ترپ سے اسے کوئی نہیں کاٹ سکتا۔ بتا نہیں سکتی کہ اتنی آسانی سے اتنے بڑے معاملے سے صاف نکل آنے سے میری ہمت کتنی بڑھ گئی۔ میں نے طے کر لیا آج سے اپنی ناؤ کی ملاح میں خود ہوں۔

سارا خاندان مگن، اور میں نے کسی کو نہ دکھ دیا نہ بے عزتی کا سوال اٹھا۔ آج تک سوائے میرے اور جگنو کے کسی کو نہیں معلوم کہ میں نے کیا چال چلی تھی۔

ترپ کا اکہ تو چیک گیا مگر اب مجھے جوکر کی ضرورت پڑنے والی تھی مجھے پڑھنے کے لیے علی گڑھ جانا تھا، لوہے کے چنے تو اب چبانے کا وقت آ رہا تھا۔

اور میرے دانتوں میں کھجلی ہو رہی تھی۔

# لوہے کے چنے

اماں میرے مستقبل سے مطمئن ہو کر بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ انھوں نے کچھ موٹے نقلی ریشم کی گلابی فیروزی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ ان کے ساتھ کی کالردار مردانہ وضع کی قمیضیں بنوائی تھیں۔ دو چار بنارسی تھان خرید لیے تھے۔ اب اور خرید و فروخت بند کر دی تھی۔ آٹھ تولے کے کڑے پہونچیاں جھمکے بھی بنوا لیے تھے۔ مجھے ان میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے سادہ شلوار قمیض اور دوپٹے چاہئیں تھے۔ چادریں تکیہ کے غلاف تولیے اور پلنگ پوش، سال بھر کے لیے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ لٹھے کے تھان گھر میں رہتے ہی تھے میں نے آٹھ شلواریں بنائیں، اماں سے کہا صرف تین بنائی ہیں۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا۔ تین چار لٹھے ہی کی قمیضیں بنا لیں۔ ابھی دوپٹے چاہئیں تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اماں سے کہے بغیر سامان کیسے تیار کروں گی۔ اس وقت ایک لالٹین اور لوٹا بھی لے جانا پڑتا تھا۔ میں نے ثابت دوپٹے چھپا دیے اور پھٹے دوپٹے اور پھاڑ کر پہننے لگی۔ مگر انھوں نے کچھ نوٹس نہ لیا۔ کون تھا دیکھنے والا۔ پورا بستر بھی لے جانا تھا۔

رات رات بھر میں بورڈنگ کے خواب دیکھتی۔ ایسی لگن تو ولایت جانے کی بھی نہیں لگی تھی۔ عجب کیسی کا احساس تھا کہ دم گھوٹے دے رہا تھا۔ وہ شادی جس پر اماں مطمئن بیٹھی تھیں نہیں ہونے والی تھی کہ میں نے جگنو کو قسم دی تھی۔ میں تو کسی بادشاہ سے بھی شادی کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسکول کھلنے کا وقت آ رہا تھا۔ میں نے ایڈمیشن فارم بھی نہیں منگائے تھے۔

پھر ایک دن میں نے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار سنبھالے اور میدان میں اتر گئی۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا میاں ناشتہ کر کے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اماں چوکے پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ میں نے آنکھ کھول کر یہی منظر دیکھا تھا۔ پرانا دم گھوٹ ماحول میری ہمت پست کیے دے رہا تھا۔ عجب اکیلے پن کا

احساس دم گھوٹ رہا تھا اتنے بڑے کنبے کے باوجود میں اپنے محاذ پر تنہا تھی کسی طرف سے کمک آنے کی امید نہ تھی کئی دن سے میں عجیب ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی، میں مری پڑی ہوں اور سارا گھر ماتم کناں ہے میں بین سن رہی ہوں وہی لاکھوں عورتوں کے بین جو نہ جانے کب سے رو رہی ہیں۔

پھر میری آنکھ کھل جاتی تیل ختم ہو جانے پر لالٹین بھڑک کر بجھ جاتی۔ میں پسینہ پسینہ سوکھی سوکھی آنکھوں سے مختصر سے صحن میں سے جھانکتا ہوا آسمان دیکھتی۔ تارے مدھم ہو جاتے، دور کہیں مدقوق مؤذن کی آواز مجھے بجائے سکون بخشنے کے دہلا دیتی۔

ایک اور دن گذر گیا۔

اور میری منزل ایک قدم آگے کے بجائے پیچھے ہی ہٹ گئی۔

اس دن میں نے بمبے کے پاس بیٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز پڑھی تھی بے لفظ دعائیں مانگیں تھی۔ خدا کو میرے دل کا حال معلوم تھا بلکہ اس وقت ایسا محسوس ہوا خدا میرے دل میں اتر آیا ہے عجیب ہلچل سی بے آواز بے مقصد میرے وجود کو مسمار کیے دے رہی ہے مگر جتنی ٹوٹتی ہوں اتنی ہی دیواریں سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔ ناامیدی میں کبھی کوئی انجانی سی طاقت نہ جانے کہاں سے ابھر کر ہاتھ تھام لیتی ہے۔

اور وہی انجانی طاقت مجھے مقتل کی جانب گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔

میں تھوڑی دیر مونڈھے پر بیٹھی رہی۔ اماں چھالیہ میں سے سڑا ہوا حصہ کتر کر بڑے تاسف سے دیکھ رہی تھیں۔ ابا کی نظریں اخبار پر گھوم رہی تھیں میں باری باری دونوں کو نگاہوں کی ترازو میں تول رہی تھی شاید میری نگاہوں کی چبھن نے ابا میاں کو میری طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

تھوڑی دیر بڑی بڑی غلافی آنکھیں نوکیلی میری آنکھوں سے الجھی رہیں میں نے پلک نہیں جھپکائی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ابا میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا مذاق نہ تھا۔ کہتے ہیں اکثر مجرم ان کی ایک نظر سے پانی ہو جاتے تھے اور جرح کی ساری کہانیاں ورق ورق ہو جاتی تھیں۔

"میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ جانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہہ ہی دیا۔ اور میری آواز میں کوئی لرزش نہ تھی۔

پڑھتی تو ہو اپنے بڑے ابا سے۔

"میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہوں۔"

"بس ہو گیا۔ دو سال رہ گئے ہیں بننے کے ... بچہ ... بیکار ..."

"میں میٹرک کرنا چاہتی ہوں۔"

"مگر ذرا سوچو کیا فائدہ ہے۔ اس سے تو بہتر ہے تم کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ سیکھو تمہاری تینوں بہنیں کتنی سلیقہ مند ہیں، اور تم ..."

"مجھے سلیقے سے دلچسپی نہیں، میں پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں، بیکار ..."

"تو میں چلی جاؤں گی۔"

"کہاں چلی جاؤ گی؟" ابا میاں نے اخبار رکھ دیا۔

"اسکول ..."

"اسکول؟ ... کون سے اسکول؟"

"کسی بھی اسکول میں ..."

"نہیں، ہم تمہیں اسکول وغیرہ نہیں بھیجیں گے۔ کل سے تم متنجن کی ترکیب سیکھو اور حبشی حلوا سوہن ...."

بیگم اس دفعہ حلوا سوہن گول کر گئیں۔

"اے گرمیوں میں موا حبشی حلوا سوہن کیا بنے گا ... ہاں گاجریں ..."

"مجھے متنجن سے قے آتی ہے۔ میٹھے چاولوں میں گوشت اور حبشی حلوا سوہن بھی پسند نہیں۔ میں اسکول جانا چاہتی ہوں، صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے علی گڑھ ..."

"ہم تمہیں علی گڑھ نہیں بھیج سکتے۔ شوکت بڑی لاپروا ہیں اور تم نہایت خود سر ہو۔ اس کا کہنا نہیں مانو گی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو خاندان کی بدنامی ہوگی۔"

"تو میں خود چلی جاؤں گی۔" میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔

ان کی شعلہ بار آنکھیں پوری طرح کھل گئیں، میں بھسم نہ ہوئی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا تاج محل کی مشرقی برجی سے لٹکی ہوئی ہوں رسی کمزور ہے میری ہتھیلیاں خون خون ہو رہی ہیں۔ کوئی دم میں رسی ٹوٹ جائے گی اور سنگ مرمر کے بے رحم فرش کی طرف میرا جسم لپکے گا اور میں پاش پاش ہو جاؤں گی۔

"کہاں چلی جاؤ گی۔"

"کہیں بھی۔"

"بس یوں ہی چل دو گی۔"

"ہاں، گھر سے نکل کر تانگہ لوں گی۔ وہاں سے اسٹیشن جا کر کسی بھی ڈبے میں بیٹھ جاؤں گی۔"

"پھر ؟"

"کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر مشن اسکول کا پتہ پوچھتی پہنچ جاؤں گی، وہاں عیسائی ہو جاؤں گی۔ وہاں مجھے نن بننا چاہوں تو نن بننے کا موقع ملے گا۔"

تھوڑی دیر سناٹا گونجتا رہا۔ اماں کا سر تو مفلوج ہو گیا۔

"سن رہی ہو بیگم یہ کیا بک رہی ہے۔"

"خدا غارت کرے کمبخت کو۔ خاندان کے منہ کو کالکھ لگائے گی۔"

"مگر تانگہ تو سانجھر میں ہے ہی نہیں۔" ابا میاں کی آنکھوں میں شرارت چمک اٹھی۔ "اور ہماری رتھیں اور سرکاری اونٹ تمہیں ہماری اجازت کے بغیر نہیں ملیں گے۔"

"میں پیدل چلی جاؤں گی۔" میں نے مشرقی مینار سے لٹکتی ہوئی رسّی کو اور مضبوطی سے تھام لیا میری ہتھیلیوں میں سانجھر جھیل کا نمک ہولے ہولے جذب ہو رہا تھا۔

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ اماں نے ساڑھی کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں۔

"میں ظفر کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

"ظفر ہی نے اچھے بھلے پیغام میں کھنڈت ڈال دی۔ ورنہ اب تک تو ہم اس کمبخت کے بوجھ سے سبکدوش ہو چکے ہوتے۔"

"تو بس میرا بھائی ہی گناہگار ٹھہرا، ارے ان کے بیٹے کے لیے نواب زادیاں مل رہی ہیں مگر اس نے میری خاطر میرا بوجھ ہلکا کرنا چاہا، ارے میرے پیر پکڑے، کہا جب تک ہاں نہیں کرو گی نہیں چھوڑوں گا۔"

اماں دھاروں دھار رونے لگیں۔

"غارت ہو کلموہی۔" اماں نے جوتی کھینچ کے ماری، جو دانہ کی متلاشی مرغی کے لگی۔ اور نہ جانے کیوں میں ہنسی دباتی بھاگی۔

مجاہد خونم خون سہی مگر جانبازی سے مورچہ وقتی طور پر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے دو تین گلاس صراحی کا پانی چڑھایا اور اندر کی کوٹھری میں دروازے کھڑکیاں بند کرکے بیٹھ رہی۔

پتہ نہیں مجھے اپنی ڈھٹائی پر بجائے شرمندگی کے بڑا سکون مل رہا تھا۔ کتاب اٹھائی علامہ راشد الخیری کی "طلسماتِ کا سفید بال" جی جل کے کوئلہ ہو گیا اٹھا کر دیوار سے ماردی اور اوندھی ہو گئی۔ رات بھر ٹھیک سے سوئی نہ تھی فوراً سو گئی اور کوئی خواب نہ آیا۔

شام کو آنکھ کھلی مگر میں سوتی بنی رہی۔ دو ایک بار کوئی دیکھنے بھی آیا شیخانی بوانے آواز بھی دی مگر میں نے دم سادھ لیا۔ وہ مجھے کھانا کھلانے پر مصر تھیں اور اماں کہہ رہی تھیں بھوک لگے گی کھالیں گی شہزادی صاحبہ کے لیے خوان سجا کے لے جانے کی ضرورت نہیں۔

رات کو گیارہ بجے بھوک سے آنکھ کھلی۔ میں نے فجر کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی تھی جیسے میں اللہ میاں سے شرط باندھ رہی تھی کہ فجر کی نماز قبول ہوئی ہے تو پھر آئندہ قضا پیش کردی جائے گی ورنہ معاملہ کھٹائی میں رہا تو پھر نمازوں کے بجائے کون جانے کسی گرجا میں واسطہ پڑے گا تب دیکھا جائے گا۔

کانگریس کا زور دن بدن بڑھ رہا تھا مگر ریاستوں میں گاندھی جی کا نام بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم مہاراجہ جودھپور کی رعایا تھے ان کی سخاوت کے بل بوتے پر پل رہے تھے۔ پچھلے نومبر میں راج کنور کی سالگرہ ہر شہر میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ ابا میاں نے بھی جشن اور چراغاں کا انتظام کیا تھا۔ رات بھر باہر سے آئے ہوئے نقالوں اور رنڈیوں کا ناچ ہوتا رہا تھا ہم سب نے کچہری کی چھت سے دیکھا تھا ساری رات۔ جب نیند بھی تھی۔

جشن کے بارے میں ابا میاں بہت ناراض تھے ریاست میں اس بلا کی غربت تھی کہ ڈھنگ کا اسپتال تھا نہ اسکول۔ امیر علاج کے لیے جودھپور یا جے پور چلے جاتے یا ڈاکٹر بلا لیتے غریب یا توٹ پوٹ کے کھڑے ہو جاتے یا مر جاتے۔ ابا میاں کے محکمہ کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ سیتلا مائی کی پوجا پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے اور اسی ٹونے ٹوٹکے ڈاکٹر سے سڑک کے بچوں کو پکڑوا کر ٹیکے لگواتے جس پر بڑا ماتم پڑتا۔ ان کے والدین بڑا واویلا مچاتے مگر ابا میاں کو چیچک کے ٹیکے لگوانے کا جنون تھا۔ ہمارے ماموں چیچک کے ٹیکوں کے قطعی نہیں قائل تھے چھوٹے ماموں کی شادی اماں نے کی ان کی پہلی بیٹی بھی ہمارے ہاں پیدا ہوئی اور موقع پاتے ہی ابا نے اس کے ٹیکہ لگوا دیا۔ سنتے ہیں بڑا اندھیر مچا تھا۔ ممانی جان خفا ہو کر میکے چلی گئی تھیں۔ باقی تین بچوں کے کسی نے ٹیکے نہیں لگوائے تینوں کے چیچک نکلی۔ بہت بچپن میں نکلی بس نکتیں جھلس گئیں زیادہ داغ نہیں پڑے بس اختری چکنی اور سفید پڑ گئی۔

بڑے ماموں کے بچوں کے ٹیکے ہمارے ہاں لگوا دیے گئے تھے لیکن جب دوسری شادی سے بچی پیدا ہوئی تو چیچک میں مر گئی۔ دوسری بری طرح چیچک میں داغدار ہو گئی تیسرا لڑکا ہوا وہ بھی چیچک میں مر گیا۔ اس کے بعد اصغر دوسرا بیٹا چیچک سے اس قدر بدصورت ہو گیا تھا کہ بندر لگتا تھا مگر ماموں چیچک کے ٹیکے کے نام سے لرزتے تھے۔

ٹیکوں کی بات تو یہ جودھپور دربار تک پہنچی۔ بڑی سخت تفتیش ہوئی مگر ابا نے جواب دیا معاملہ

دب گیا کیونکہ ابا انڈین گورنمنٹ سے متعلق رہ چکے تھے اور انھوں نے اسے اوپر سرکار تک بات پہنچانے کی دھمکی دی اور استعفیٰ بھی داخل کر دیا۔

استعفےٰ منظور نہیں ہوا اور ان کی مصروفیات میں طبّی محکمہ کی سرپرستی بھی شامل کر دی گئی جو انھوں نے ترقی کی پروا کیے بغیر خوشی سے منظور کر لی۔

سارے عملہ کے بچوں کو پکڑ کر ٹیکے لگوائے خود چپراسیوں، کلرکوں، حتیٰ کہ قیدیوں کو بھی نہیں بخشا۔

"سرکاران میں قتل کے مجرم ہیں انھیں کیا ضرورت ہے ٹیکے کی" ایک سمجھدار کلرک نے کہا۔

"اگر اسے چیچک ہوئی تو اوروں کو بھی سمیٹ لے گا اور اگر بچ گیا چیچک سے اور گھناؤنی صورت لے کے اللہ میاں کے دربار میں پہنچا تو بغیر اعمال دیکھے ہی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔"

چیچک کے ٹیکوں کا اتنا ہنگامہ ہوا کہ ابا کا نام ہی "وہ چیچک والا جج" پڑ گیا تھا۔

میں نے خودسری ورثہ میں پائی تھی۔

رات کو بھوک لگی نعمت خانہ میں اماں نے ضد میں تالا ڈال دیا تھا۔ پہلے میں نے مصالحہ کے ڈبہ پر ہلّہ بولا۔ کونڈوں کے بے بھنے چنے ملے وہ پھانکے تھوڑی سی خشخش چبائی، ترکاری کی ٹوکری میں دو ٹری سوکھی گاجریں، مرجھائی ہوئی گو بھی خاصی لذیذ لگی، کچھ پستے بادام اور چھوہارے سمیٹے اور مزے سے دو گلاس پانی چڑھا کر تاروں کی چھاؤں میں دری پر پانی چھڑک کر پڑ رہی۔ میں نے محاصرہ کا زوردار مقابلہ کیا اور دو دن تک خاموش جنگ جاری رہی، مشن جانے کا خواب دھندلا پڑتا جا رہا تھا اسٹیشن بہت دور تھا اور سڑک پر مجھے راستہ پوچھتے دیکھ کر طوفان کھڑا ہو جاتا فوراً دھر لی جاتی میرے منصوبے میں کوئی دم نہ تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے غیب سے مدد کی امید تھی بھر جگنو کو لکھوں کہ میری تعلیم پر زور دے اور مجھے پڑھنے بھجواؤ ورنہ مجھے نہ قبولنے کی دھمکی دو۔

یہ نئی چال مجھے بے حد پسند آئی۔ اور محاصرہ بے حقیقت معلوم ہونے لگا۔

تیسرے دن ابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

"مشن میں جانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔" میں چپ رہی۔

"عیسائی ہو جاؤ گی؟" ابا میاں نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے بھرے گلے سے کہا۔ "ان عیسائیوں سے پالا پڑا تھا نکلے جتے کی کانی جھونک

میمیں تھیں ینیچے ینیچے اسکرٹ، کالی ٹانگیں، میلے کرمچ کے بوٹ اور نہایت بھونڈی پچکی ہوئی ٹوپیاں، حد سے زیادہ بگڑی کرخت زبان۔ بچپن سے میں نے صرف اسلام کی رحمتوں کا ذکر سنا تھا۔ اس کے بعد ہندو دھرم سے ایک رومینٹک سالگاؤ تھا۔ مندروں میں بھجن گھنٹیاں، سجے سنورے بھگوان، خاص طور پر مورمکٹ سجائے کرشن کنہیا، گیتوں میں ان کی شوخیاں شرارتیں، گوپیوں کے سنگ راس رچانا، مرلی کی دلکش دُھن۔

مگر ہندو ہونے کا طریقہ کیا ہے یہ مجھے بالکل بھی نہیں معلوم تھا۔ بچپن میں میں نے اپنی گوئیاں شیلا کے ہاں تہواروں کی دھوم دھام دیکھ کر چاچی سے کہا تھا "مجھے ہندو بنا لو۔"

پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئیں، پھر بولیں۔

"دُھت"۔ خوب سب نے میرا مذاق اڑایا۔

اماں بھی چھپ کر پنڈت جی کو ستیہ نراین کی کتھا کے لیے روپیہ دیا کرتی تھیں اور شیتلا میا کو بھی بھوگ لگواتی تھیں۔ مگر عیسائی مذہب کچھ انگریز حاکموں کا محکمہ سمجھا جاتا تھا اور اس طرف رغبت ظاہر کرنا ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ وجہ مجھے نہیں معلوم تھی کہ کیوں؟

"بیوقوف ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہئیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا تمھیں پڑھنے کا اتنا شوق ہے۔ تم نھنے اور شوکت کے ساتھ رہ سکتی ہو۔" پھر انھوں نے مجھے ایک کتاب دی۔

"یہ پاس بُک ہے اپنے دستخط سے تم پوسٹ آفس سے روپیہ نکلوا سکتی ہو۔ اس میں چھ ہزار روپے ہیں اسے تم جہیز سمجھو یا اپنا حق، ہم تمھاری ذمہ داری سے دستبردار ہوتے ہیں۔"

کتاب لے کر میں سکتے میں رہ گئی۔

"اس کے علاوہ آگرہ کا ایک مکان ہم نے تمھارے نام کر دیا ہے۔ چاہو اسے بیچو یا کرائے پر اٹھاؤ، تم جانو۔"

انھوں نے مجھے مکان کے کاغذات تھما دیے۔

ایک دم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے ناؤ میں بٹھا کر پتوار ہاتھ میں دے کر مانجھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا ہو۔

"ارے بیوقوف روتی کیوں ہو، فوراً داخلے کا فارم منگاؤ اور تیاری کرو۔ ہاں بیوی کو بتانے کی ضرورت نہیں، کپڑوں اور کرائے کے لیے یہ پچاس روپیہ رکھو۔"

مشرقی مینار کی رسّی میں نے چھوڑ دی اور تیرتی ہوئی سنگ مرمر کے فرش پر کھڑی ہو گئی۔

اماں کو انھوں نے کیا سمجھایا کہ وہ ایک دم ایسی ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ دوپٹوں کے لیے

پورا تھان منگوایا تین روپیہ کا بیس گز کا چھوٹے عرض کی ململ کا تھان ملتا تھا۔ آٹھ دوپٹے بن گئے۔

اماں نے رنگ منگائے اور مجھے طرح طرح کے دوپٹے رنگنے کی ترکیبیں بتائیں۔ مجھے یاد ہے ایک چنریا ساون کے موسم کے لیے ایک زرد بسنت کے لیے ایک پتنگوں کا۔ اماں نے دوپٹہ پہلے پانی میں بھگویا پھر نچوڑ کر ذرا پھریرا کیا پھر اسے تہہ کیا، بیچ میں کس کے ڈوری بندھوائی اور کلف ملے رنگ میں آدھا گلابی آدھا دھانی رنگوں میں ڈبویا۔ ڈوری کھولی تو بے حد خوبصورت پتنگیں بن گئیں۔ خوب کلف اور ابرق ڈال کر باقی دوپٹے ہلکے رنگوں میں رنگوائے جب سوکھ گئے تو پاندان کے ڈھکنے سے سخت تکیے پر گھسے لگا کر چنے پھیر انھیں مروڑ کر بٹ لیا اور بنڈل سے بنالیے۔ چار چادریں اور تکیہ کے غلاف ایک راجستھانی پلنگ پوش۔

پراسپیکٹس اور فارم آگیا تھا اور میں نے بھر کر بھیج دیا۔

مجھے دسویں کلاس میں داخلہ نہیں مل سکتا، نویں میں ملے گا اور میں علی گڑھ روانہ ہوگئی۔ اماں مجھ سے بالکل ناراض نہ تھیں۔ ابا روز شام کو ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔

"بیمار تو تم پڑتی نہیں ہو، دانت تمہارے بہت صاف ہیں، منہ کھولو۔" میں نے منہ کھولا اور وہ غور سے ایک ایک دانت دیکھتے رہے۔

"پان مت کھانا اور نیم کی مسواک ضرور کرتی رہنا اور ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے نہانا۔"

"اے ہے جاڑوں میں بھی؟" اماں بولیں۔

"جاڑوں میں بھی تازہ پانی سے روز نہانا اور کھیلوں میں برابر حصہ لینا، بہت موٹی ہورہی ہو۔" اور میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی یہ کیا ماجرا ہے۔ نافرمانی پر تو والدین عاق کردیتے ہیں بیٹیوں کا تو گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ یہاں پہلی بار اماں ابا کا پیار مل رہا ہے۔

میں علی گڑھ پہنچی تو شوکت آپا سورہی تھیں، جاگیں تو بولیں۔

"ہمارے یہاں تو پلنگ نہیں، کہاں سوؤ گی؟"

"کھٹیا منگالوں گی۔ اور کوٹھری میں کئی پلنگ کھڑے ہیں۔"

"ان کی بان گل گئی ہے۔"

"نئی لگ جائے گی۔"

"ہمارے پاس تو دو ہی کمرے ہیں ہماری گذر ہی مشکل سے ہوتی ہے، دو کمرے ہم نے کرایہ پر اُٹھادیے ہیں۔"

"برآمدہ میں تو جگہ ہے۔"

"وہاں باورچی خانہ ہے۔"

"برآمدہ بہت لمبا ہے۔ نئی لگوالوں گی۔"

"غسل خانہ گھر جائے گا۔ کوئی آئے جائے گا تو تم ناک بھوں چڑھاؤ گی۔"

"نہیں چڑھاؤں گی اور چڑھاؤں گی بھی تو تمہیں کیا اثر پڑے گا۔ نیر کہاں سوتی ہے؟"

"نیر کہاں، وہ تو بورڈنگ چلی گئی۔"

"بورڈنگ؟"

"ہاں بھئی۔ یہاں انھیں تکلیف ہوتی تھی۔ نعیم غل مچاتا تھا۔ کہو بھلا ہم اپنے بچّے کا گلا گھونٹ دیں؟"

میں نے سامان نہیں کھولا فوراً مہترانی کو بھیجا کہ کل اتوار ہے نیر سے کہنا میں آئی ہوئی ہوں۔

بارہ بجے نیر آگئی۔ ہم جیسے صدیوں کے بچھڑے لپٹ گئے۔

"بہن، بھوک کے مارے دم نکلا جارہا تھا۔"

"کھانا نہیں کھایا؟"

"کہاں کھایا۔ پکا ہی نہیں تھا پھر آنے کی اجازت لینی تھی، اجازت دے کے سیدھی بھاگی۔ کچھ ہے کھانے کو؟"

بہت ڈھونڈا کچھ نہ ملا۔ گندی پتیلیاں اور رکابیاں لڑھک رہی تھیں شوکت آپا اور نعیم نے کھانا کب کھایا؟ شاید جب میں ادھر کوٹھری میں پرانا سامان ٹٹول رہی تھی اور پھر بستر کھولا، میلے کپڑے نکالے۔ ایک پلنگ پیچھے کی طرف بالکل ثابت مل گیا نئی بان سے بنا ہوا، میں نے وہ گھسیٹ کر برآمدے میں غسل خانہ سے نکلنے کا راستہ چھوڑ کر بچھایا اور لیٹ گئی نیر کے انتظار میں۔

"کھانا کھاؤ گی؟" شوکت آپا نے پکارا۔

"میرے لیے پتیلی میں چھوڑ دو۔ بعد میں کھالوں گی۔"

مگر شوکت آپا بھول گئیں۔ میں تو بنا کھائے بھی رہ سکتی تھی مگر نیر دھان پان سی ناک پکڑو تو دم نکلے۔

ہم نے چپکے چپکے ڈبّے ٹٹولے، ایک ڈبّہ میں تھوڑا سا ناریل ملا، نیر ہمکنے لگی۔ دودھ کی پتیلی کھولی موٹی سی ملائی جمی تھی نیر نے انگلی سے ملائی کو چھوا۔

"شوکت آپا جان لیں گی۔"

"کھا بھی لو! تم بھوکی ہو۔"

"ہاں کئی بار بلا چکی ہیں کہ اتوار کو آؤ، گھر کے کھانے کو ترس گئی ہوگی۔"

"مگر اس وقت شاید کھانا کم تھا، تم بورڈنگ کیوں چلی گئیں؟"

"نہ پوچھو بہن پھر بتاؤں گی۔"

"نہیں، ابھی بتاؤ۔"

"چلو ادھر نیم کے نیچے بیٹھیں گے۔"

"گرمی ہوگی۔"

"نہیں ادھر ہوا بھی چل رہی ہے، شوکت آپا جاگ جائیں گی۔"

ہم دونوں نیم کے نیچے سوکھے پتے جمع کر کے بیٹھ گئیں۔ نیر بولی۔

"میری مانو تو بہن بورڈنگ چلی چلو۔"

"کیوں؟"

"ارے بھئی کیا بتاؤں، شوکت آپا سے میری تو نہیں بنی اور تم تو بہت ہی خود دماغ ہو تمہاری تو ایک منٹ نہیں بنے گی۔ دوسرے نعیم پڑھنے نہیں دیتا، چڑھ بیٹھتا ہے اور کیا زور کا گھونسہ لگاتا ہے کہ بھئی میرا تو دم جانے لگتا ہے۔"

"مجھے نہیں مارے گا، میں اس کی وہ ٹھکائی کروں گی کہ یاد ہی کرے گا۔"

"اری بہنا انگلی لگا کے تو دیکھو! چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

"تم پھسڈی ہو، میں تو کسی سے دبنے والی نہیں۔"

"یہی تو ڈر ہے۔ یہ بہن تم یہاں پڑھنے آئی ہو یا مہا بھارت رچانے آئی ہو۔"

اور ہم فکر میں پڑ گئی۔ نیر نے شکر ہے کہ مٹائی نہیں کھائی۔ شوکت آپا نے اٹھ کر فوراً ڈبہ کھولا اور ناریل کا ٹکڑا غائب دیکھ کر بہت بگڑیں۔

"بہت بھوکی تھی نیر، تم نے میرے لیے بھی پتیلی میں کچھ نہ چھوڑا۔ دال بھی نہ ملی نہ روٹی۔"

"دال ہمارے یہاں پکتی ہی نہیں اور ذرا سا قیمہ تھا نعیم روکھا روکھا کھا گیا۔ روٹی مجھے دھیان ہی نہ رہا باسی تو تھی میں نے کتے کو ڈال دی۔ مگر میرا کھوپرا کیوں کھا گئیں۔"

"اے شوکت آپا ذرا سے کھوپرے پر دم دیتی ہو، خاک ڈالو۔"

"واہ واہ کیوں خاک ڈالو۔ ہم سہ پہر کو ضرور کچھ کھاتے ہیں۔ اس کا بھی خیال نہ کیا۔"

اتنے میں ننھے بھائی آ گئے۔ "یہ چلی کہاں"
"ہاں بس تانگہ منگا کے جا ہی رہی تھی۔"
"کہاں جا رہی تھیں؟"
"بورڈنگ!"
"نہیں بورڈنگ تم نہیں جاؤ گی۔"
"میں قطعی جاؤں گی۔"
"نہیں ہم تمھیں بورڈنگ نہیں جانے دیں گے۔"
مجھے ہنسی آئی چاہا کہہ دوں آپ کے والد بزرگوار بھی یہی کہتے تھے۔
"آپ کو کیا میں بورڈنگ میں رہوں یا کہیں رہوں؟"
"ہمارا نقصان ہو گا۔"
"کیسا نقصان؟"
"تمہارے کھانے وغیرہ کے روپیہ سے ہمیں سہولت ہو جائے گی۔" شوکت آپا بولیں۔
"اچھا تو تم لوگ منافع کماتے ہو ہم لوگوں سے۔"
"خاک منافع، تمہارے رہنے سے ہمیں تو پریشانی ہی ہو جائے گی۔"
"اور جو سہولت ہو گی وہ۔"
"اچھا بک بک نہ کرو۔" ننھے بھائی بولے اور شوکت آپا طنزیہ مسکرائیں۔
"ننھے بھائی، کھانے کا آٹھ روپیہ دھوبی وغیرہ کا میں خود دوں گی۔ ایسا کیا منافع ہو گا کیونکہ میں کہے دیتی ہوں کہ میں قطعی آٹھ روپیہ سے زیادہ کا کھانا کھاؤں گی۔ نعیم میرے پڑھنے میں مخل ہوا تو ٹھکائی کر دوں گی۔"
"واہ واہ کیسے کرو گی ٹھکائی۔"
"ایسے" میں نے فوراً نعیم کے دھموکا لگایا اور وہ ہنس کے مجھ سے کشتی لڑنے لگا۔ "اور شوکت آپا نہایت بجس بھُسی ہیں اگر مجھ پر بھولے سے ہاتھ اٹھایا تو دُھن کے پھینک دوں گی۔ بچپن میں میں نے انھیں بڑی مار دی ہے مگر اب میں بچہ نہیں۔" ننھے بھائی ہنسنے لگے۔
"شوکت چُنّی سے کشتی لڑو گی؟"
"میری جوتی لڑتی ہے۔"

"تو بھی اس کا بورڈنگ چلے جانا ہی اچھا ہے۔ ہتھنی ہے یہ تو اگر بگڑ بیٹھی تو تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دے گی۔"

"واہ ... دیکھیں تو یہ ایک انگلی چھوا کر بھی۔"

"اول تو ہم کالج میں ہوں گے۔ دوسرے ہم دو پہلوانوں میں چل رہی ہو تو دخل نہیں دیتے۔ تماشا دیکھتے ہیں۔"

ننھے بھائی نے زور سے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔ کوئی اور نازنین ہوتی تو دم توڑ دیتی۔ میں ہنستی رہی۔

بورڈنگ جاتے وقت میں نے شوکت آپا کو منا لیا تھا۔ بے حد خوشامد سے ہر ہفتہ آنے کی اجازت مانگی۔

حالانکہ بالکل آنے کا ارادہ نہ تھا۔ گھر کے کھانے کی خوب تعریفیں اور بورڈنگ کے کھانے کو راتب کہا۔

بالکل روانہ ہوتے وقت چپکے سے بولیں۔

"یہ تمہاری اور جگنو کی شادی کا کیا قصہ ہے۔"

"مجھے کیا پتہ؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بھائی صاحب کی کارستانی لگتی ہے۔" وہ اپنے باپ کو بھائی صاحب کہتی تھیں۔

"یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔ میں نے جگنو کو خط لکھا۔"

"پھر؟"

"اس نے جواب ہی نہیں دیا۔ مگر قیامت ہو جائے یہ شادی نہیں ہوگی۔"

جی چاہا کہہ دوں غصہ نہ دلاؤ، میں کہیں انتقاماً بد ذاتی پر نہ تل جاؤں۔ جگنو مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اس کا برا نہیں چاہتی۔

"ابھی تو مجھے بی۔ اے کرنا ہے۔"

"شادی کے بعد پڑھتی رہوگی؟"

"انشاءاللہ۔" اور میں روانہ ہو گئی۔

مجھے نویں میں داخلہ مل چکا تھا مگر میں نے ضد کی کہ دسویں میں داخلہ لوں گی۔ خاتون آپا نئی نئی پرنسپل بنی تھیں سمجھانے لگیں کہ اسکول کا نتیجہ خراب ہوگا۔ تم فیل ہو جاؤ گی۔

"میں فیل نہیں ہوں گی اور فرض کیجئے ہو بھی گئی تو کیا فرق پڑے گا۔ وہی بات ہو جائے گی"
میں نے انھیں سرسری انداز میں بتایا کہ میں کن مشکل راہوں سے گذر کر بورڈنگ میں آئی ہوں۔
سارے خاندان کو ناراض کیا ہے مجھے کامیاب ہونا ہے۔ میں ٹیوشن لوں گی، دن رات پڑھوں گی۔ آپ نے میری اردو کی پختگی نہیں آزمائی مجھے موقع دیجئے شاید میں آپ کو نا امید نہ کروں۔ میں تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں نیر کو تو اس کی ماں فخریہ پڑھا رہی ہیں۔ میں سارے خاندان سے لڑ کر آئی ہوں۔
اس وقت رحمت کے فرشتہ کی طرح اعلیٰ بی آگئیں۔ اعلیٰ بی یعنی بیگم شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج، روزانہ بورڈنگ اور اسکول میں چکر لگایا کرتی تھیں۔
انھوں نے بڑے زور شور سے میری حمایت کی اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔
"اے بی خاتون چولھے میں ڈالو اسکول کے نتیجے کو بچی محنت کرنے کو کہتی ہے اسے موقع دو۔"
"ورنہ پھر میں پرائیویٹ امتحان دوں گی، مگر اس سال میٹرک کا امتحان ضرور دوں گی۔"
"ہاں! اور بیٹی تو میرے پاس رہنا۔ خاتون جہاں اسے امتحان دینے سے تو نہ روک پاؤ گی، داخل کر لو، میں ذمہ لیتی ہوں اس کا۔"
میں داخلہ کے بعد نکل رہی تھی تو وہ خاتون آپا سے کہہ رہی تھیں۔
"غضب خدا کا خاتون، ایک لڑکی کا ارادہ کمزور کرنا چاہتی تھیں۔"
بورڈنگ میں میں اور نیر ایک کمرے میں رہنے لگیں۔
نیر بڑی سلیقے والی تھی میں کمرہ گندہ کرتی اور پڑھنے بھاگ جاتی وہ بڑبڑاتی مگر چندن کر دیتی کمرہ، مجھ پر بڑا رعب جماتی، وہ ذہین بھی تھی شوخ بھی اور کلاس میں اوّل آتی تھی۔ میں ہمیشہ سمجھتی تھی وہ بہت تعلیم حاصل کرے گی، نام پیدا کرے گی، شہرت پائے گی۔ مگر وہ ہمیشہ سے نہایت سلجھی ہوئی دوست نواز اور فرماں بردار تھی۔ اس کی اماں اور دادی نے اس کی منگنی ددھیال میں ایک بہت ہونہار لڑکے سے کر دی تھی اور وہ بہت خوش تھی وہ ایک مثالی مشرقی خاتون بننے کے خواب دیکھتی تھی، اچھی بیٹی فرمانبردار بیوی بہترین ماں اور سماج کی پرانی قدروں کی شدت سے قائل۔ ہم بچپن سے ساتھ رہے اسے میری کوئی ادا پسند نہ تھی اور مجھے اس کے زندگی کے پروگرام سے گھٹن ہوتی تھی مگر ہم دونوں میں بہت گہرا پیار تھا۔ ایک دوسرے کی خوشی سے خوشی ہوتی تھی۔
نہایت نمکین، سبک نقشہ، نازک ہاتھ پیر، بے حد جامہ زیب، ساتھ ساتھ نہایت شوخ باتونی اور اپنی عمر سے زیادہ ہوش مند، بچپن سے ہی ہر بات میں وہ مجھ سے بہتر تھی۔ نہایت اچھی سلائی بنائی اور

پکوان تیار کرتی تھی۔ اس نے پانچ برس کی عمر میں ایک کوچوان کا کُرتہ سیا اور ثریا بی بی سب حیرت زدہ ہوتے تھے وہ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے نازک کشیدہ کاری کرتی تو اس میں اتنی صفائی ہوتی تھی کہ بڑے بڑوں کو مات کر دیتی۔

اس نے چھ برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا لمبے لمبے سنہری جھلملاتے بال تھے۔
میں اس کا بالکل مخالف عکس تھی ہر وقت میرا اس سے موازنہ کیا جاتا اور میں صفر ثابت ہوتی۔
مگر اپنے کسی رویئے سے اس نے مجھے حقیر نہ سمجھا مجھ سے بڑی پیاری دوستی تھی۔ بریلی کی سہیلیوں کی صحبت میں اسے وہ باتیں معلوم ہو چکی تھیں جن سے میرے فرشتے بھی انجان تھے۔ ہر معاملے میں وہ میری استاد تھی میں ہاتھ پیر مار کر اس سے ایک کلاس آگے ہو گئی تھی مگر وہ مجھے بہت کچھ پڑھا سکتی تھی۔
جب تک تیر میرے کمرے میں نہیں آئی تھی ایک تیسری کلاس کی لڑکی کچھ دن رہی۔ یہ لڑکی نہایت غریب، بیمار اور بدصورت تھی بالکل لاوارث تھی بس اس کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ صورت بھیانک لگتی تھی دماغی طور پر کمزور تھی گھنٹوں بیٹھ کر ایک جملہ رٹتی اور دم بھر میں بھول جاتی۔ مجھے اتنا گھورتی کہ میں بدحواس ہو جاتی۔ بالکل نوکروں کی طرح میرے کپڑے تہہ کرتی، کتابیں سجاتی، بغیر مانگے پانی کا گلاس لے آتی، اس کے دانت چھدرے اور چھچھ کی طرح آگے کو نکلے نچلے ہونٹ پر دھرے رہتے تھے بات کرتی تو لعاب کے تار دانتوں اور ہونٹ کے درمیان جال سا بننے لگتے اور میرے حلق میں اُبکائی اُمنڈ آتی۔
شام کو میں پڑھتی رہتی اور وہ میرا پلنگ گھسیٹ کر صحن میں بچھاتی، بستر کرتی اور تکیہ پر بیلے کے پھول سجا دیتی۔

رات کو کبھی میری آنکھ کھل جاتی تو وہ بڑی بڑی بھیانک آنکھیں مجھے بہت قریب سے گھورتی ملتیں، انجانے خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور میں چیخ کر نہ جانے کیا بک دیتی اور وہ سہم کر اپنے پلنگ میں دبک جاتی۔ میں جھلا کر اپنا پلنگ اس سے دور کھینچ لے جاتی مگر پھر میری آنکھ کھلتی تو اس کی برف زدہ انگلیاں مجھے اپنے جسم پر رینگتی محسوس ہوتیں۔ سوکھی ماری لڑکی سے مجھے ایسا خوف آتا کہ جیسے وہ مجھے نگل جائے گی۔ وہ مجھے گھورتی مگر مجھ میں اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی۔

مجھے اس نفرت اور حقارت کی طوفان سے بڑی وحشت ہوتی جو اس کے خلاف میرے دل میں موجزن ہو جاتا۔ میں کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس کا ذکر کیوں گھناؤنا لگتا ہے۔

بورڈنگ کی دلچسپیوں نے تھوڑے دن کے لیے مجھے یہ بھلا دیا کہ زندگی میں میرا ایک مقصد ہے۔

میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنا۔ ورنہ زندگی کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لیے ہی بند ہوجائیں گے۔

میں ہر گیم میں حصہ لیتی۔ بڑی جلدی وزن کم ہوگیا اور میں جی جان سے کھیلوں میں غرق ہوگئی۔

تب میری کلاس میٹ عصمت علی خاں نے مجھے گرفت میں لیا۔ ہم دونوں ہم نام تھیں رول کال کے وقت بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ خاص طور پر ٹیچنگ کی ٹیچر مس رام بہت چراغ پا ہوتی تھیں وہ سمجھتی تھیں ہم ان پر کوئی انکھوٹی آزمارہے ہیں۔ غصہ میں آکر رجسٹر پھینک دیتیں اور دونوں کو کلاس سے نکلنے کا حکم صادر کردیتیں وہ سمجھتی تھیں ہم نے شرارت میں ایک جیسے نام رکھ لیے ہیں۔ سعادت تین سال سے پڑھ رہی تھی وہ اسے عصمت کہتی تھیں کیوں کہ رجسٹر میں اس کا نام عصمت لکھا تھا۔ پیار کا نام سعادت تھا۔

میں نئی تھی وہ مجھ پر بے حد خفا ہوتی تھیں کہ میں نام پکارنے پر انھیں ستانے کے لیے بول پڑتی ہوں۔ ان کے اس برتاؤ پر ہم لوگوں کی بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی اور وہ جل کر خاک ہوجاتیں اور نزلہ مجھ پر اُتارتیں۔

کھیل کے میدان میں بھی مجھ سے انھیں سخت شکایات تھیں۔ میں نے جو کھیل کبھی نہیں کھیلے تھے ان کے اصول جاننے سے پہلے حصہ لینے لگتی۔ تندرستی اچھی تھی کھیل تو فوراً قابو میں آجاتا لیکن بے حد اندھادھند رچ جاتی۔ وہ سمجھتیں میں جان بوجھ کر انھیں ستانے کے لیے رولز توڑتی ہوں۔ چونکہ میں لڑکوں کی صحبت میں پلی تھی جانکار لڑکیوں سے کبھی اچھا کھیل ڈالتی تھی۔ اسی لیے مجھے ٹیم میں لے لیتی تھیں۔

سعادت کو پتہ تھا کہ میں کئی مضامین میں کمزور ہوں۔ اردو میرا سب سے کمزور مضمون تھا کیونکہ سانبھر میں تھوڑی بہت کتابیں پڑھنے کے علاوہ میں نے اردو کے بجائے انگریزی، حساب، جغرافیہ و تاریخ پر زیادہ محنت کی تھی۔

شاعری نہ کبھی پڑھی نہ ہمارے گھر میں شاعرانہ ماحول کے پنپنے کا سوال۔ زیادہ تر تو بڑے ابا کی شاعری جھیلی تھی اور شاعری سے اور بھی جی اچاٹ ہوتا تھا۔ اردو پردے کے پیچھے بیٹھ کر ماسٹر مبارک علی سے پڑھتے تھے انھیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون لڑکی پڑھ رہی ہے اس لیے ان کی کلاس میں مشکل مضامین رٹا کرتے۔ زیادہ وقت سعادت ہی دھیان سے پڑھتی اور سمجھتی تھی۔ کلاس میں میرے علاوہ سعادت، زہرہ بٹ، محمودہ عمر اور مونا پیرسن اور شاید سعیدہ عمرالدین کل چھ لڑکیاں تھیں۔

مجھے کھیل کود میں غرق دیکھ کر سعادت نے پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ پڑھنے پر مجبور کیا۔ سعادت مجھے پڑھا کر ہی اپنا سبق یاد کرتی تھی۔

اگر سعادت نہ ہوتی تو شاید میں اتنی محنت نہ کرتی۔ اس نے میرا تیل نکال ڈالا۔

کئی بار میں نے اس سے اپنی پیچڑ قسم کی روم میٹ کا ذکر کرنا چاہا مگر نہ جانے کیوں میری زبان نہ کھلی۔

پھر جب امتحان سر پر آئے تو میں اپنی ممانی جان کے ہاں چلی گئی کیوں کہ اب سعادت تنہا پڑھنا چاہتی تھی اور میرا ماموں زاد بھائی عشرت عثمانی بھی میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔

عشرت بہت ہی ذہین تھا مگر اسے بھی کسی کے ساتھ پڑھنے کی عادت تھی۔ عشرت نے بھی مجھے بے انتہا گھسا۔ آپا جی ہماری دینیات کی استانی نے ایک دعا بتا دی تھی کہ پڑھ کر امتحان کے کمرے میں داخل ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ اور امتحان کے زمانے میں نماز تو زور شور سے پڑھنے ہی لگتے ہیں خاص طور پر تہجد، کیوں کہ صبح اٹھ کر پڑھنے سے پہلے اگر وضو کر کے نماز پڑھی جائے تو نیند اڑ جاتی ہے اور برکت تو ملتی ہی ہے۔

امتحان کے کمرے میں جاتے وقت لڑکیاں اپنی دوستوں کو ہار پھول پہنا کر وش کرتی ہیں مگر میری روم میٹ روز میرے لیے بازار سے گجرا منگا کر پیش کرتی تھی جی چاہتا کمبخت کے منہ پر ماردوں کیوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

ایک دن جب آخری پرچہ تھا تو صبح ہی اٹھی تو میں نے شکر کیا کہ کوئی گجرا میرے تکیہ پر نہیں سجا ہوا تھا۔ کمرے سے نکلنے لگی تو ایک سسکی سی سنائی دی میں نے مڑ کر دیکھا تو بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں قریب گئی تو پلکیں نہیں جھپکیں اور آنکھوں کے ڈیلے ابلنے لگے جیسے مینڈھک کی طرح اچھل کر مجھے دبوچ لیں گے اس کا پاجامہ اور بستر بھیگا ہوا تھا اور سارا جسم سلگ رہا تھا۔

میں سرپٹ بھاگی کمرے سے۔

آخری پرچہ کر کے جیسے کندھوں پر کسی نے پر لگا دیے۔ خوشی سے الٹے سیدھے انگریزی اور اردو کے گانے گاتے قلانچیں بھرتے داخل ہوئے۔

"شی!" میٹرن نے ڈانٹ لگائی۔

"کیوں؟"

"رسول فاطمہ کا انتقال ہو گیا۔"

نہیں میرے قلم میں طاقت نہیں جو میں اس نفرت اور گھن کی تفصیل لکھ سکوں جو مجھے خود اپنے وجود سے آنے لگی۔ صبح شاید وہ دم توڑ رہی تھی میں نے میٹرن کو اطلاع نہ دی سیدھی امتحان دینے چلی گئی۔ آخری پرچہ اردو کا تھا۔

اگر میں میٹرن کو خبر کردیتی تو شاید وہ بچ جاتی کئی دن سے وہ سینے کے درد میں تڑپ رہی تھی مگر اپنا کمرہ چھوڑ کر نرسنگ روم میں جانے کو تیار نہ تھی کہ اکیلے کمرے میں مجھے وحشت ہوگی اور میں پرچہ اچھا نہ کر سکوں گی۔

دن رات دوزخی آنکھیں میرا پیچھا کرتیں۔ اندھیروں سے جھانکتیں۔

وہ ایک لاوارث لڑکی تھی کوئی اس کی میت کا وارث بھی نہ آیا۔ اس کا جنازہ اٹھا لڑکیاں چیخ چیخ کر روئیں۔ کاش مجھے بھی رونے کی عادت ہوتی۔ میری آنکھوں میں کنکر چبھتے رہے۔ میں نے اسے قتل کیا آج تک میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں قاتل بھی ہوں۔

کوئی لڑکی اسے اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہ ہوتی تھی، وہ نہایت چیچنی تھی بیس ہوجاتی تھی۔ لڑکیاں اس سے گھبراتی تھیں میں کتنی فراخدل تھی کہ میں اسکے ساتھ اتنے سکون سے رہی۔

"تمہیں اس نے نہیں ستایا"

"نہیں" میں نے کہہ دیا۔

"تم بڑی دل والی ہو، بہن"، سب نے میری بڑی تعریف کی۔

اور خود میں نے۔

میں نے خود اپنے سے کبھی کچھ اس کے بارے میں نہ پوچھا نہ کہا۔ دماغی توازن برقرار رکھنے کے لیے مجھے چپ ہی رہنا تھا۔

کئی رات وہ خواب جو مجھے بچپن سے ستایا کرتا تھا، اور میں سوتے میں اٹھ کر ادھر ادھر نہ جانے کسے ڈھونڈا کرتی تھی، وہی دھند میں کوئی میلے مٹیالے کپڑوں کی گٹھری سل پر سفید سفید کچھ پیس رہی ہے شاید کھیر کے چاول ہیں۔ دور تک فضا میں عورتوں کے بین کی آواز پھیلی ہوئی ہے اور میری سانس رک رہی ہے، رک جاتی ہے، میں چونک کر جاگ پڑتی ہوں، لالٹین جلا لیتی ہوں کہ اندھیرے میں دوزخی لحیم شحیم آنکھیں مجھے ڈسنے لگتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ کو ذہنی پتوار پر خون کے دھبے دکھائی دیا کرتے۔ وہ مسلسل ہاتھ دھوئے جاتی دھبے اور گہرے ہوجاتے۔

بعد میں ڈاکٹر کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ آٹھ دس گھنٹے پہلے مرچکی تھی۔ وہ آواز شاید کوئی اور آہٹ ہو گی پھر اس کی آنکھیں لاکھ کوشش پر بند نہ ہو پائیں۔

شمیم بھی بورڈنگ میں تھے اور ان کا خرچ براہ راست ان کے پاس آتا تھا ننھے بھائی نے انھیں تھوڑے دن رکھا۔ وہ دن بھر شوکت آپا کا جی جلاتے نعیم کو رلاتے اور کھانا ہاتھ لگ جاتا تو گوشت قیمہ روکھا کھا جاتے، روٹیاں کوؤں کو کھلا دیتے۔ شوکت آپا زیادہ تر سویا کرتی تھیں اٹھتیں اور کھانے کا صفایا اور شمیم کو گھر سے غائب پاکر سر پیٹ کر رہ جاتیں۔ وہ کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنا سامان بھی لے گئے تھے۔ جس دن اچانک آجاتے صفایا کر دیتے، یہاں تک کہ نعیم کا دودھ بھی مع ملائی کے کھا جاتے۔

ننھے بھائی نے سرکار کو لکھا کہ اس سے ان کی جان چھڑائی جائے اور وہ بورڈنگ منتقل ہو گئے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پاس روپے ہیں، جھوٹ بولنے میں تو مشاق تھے کہنے۔

ابا میاں نے لکھا ہے کہ تم سے لے لوں اور روپے بھی اگر میں فیل ہو گیا تو تم بھی فیل ہو جاؤ گی۔

"وہ کیوں ؟"

"کیوں کہ میں ہی تمہیں پاس کرا سکتا ہوں میری سب پروفیسروں سے دوستی ہے دن رات کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے بلکہ پرچے بنانے میں ان کی مدد کر رہا ہوں۔

مجھے اس وقت نہیں معلوم تھا کہ زیادہ ممتحن باہر کے ہوتے ہیں میں ان کے چرکے میں آجاتی اور وہ روپیہ مارے جاتے۔

امتحان کے بعد جب دعوتیں پارٹیاں ختم ہوئیں تو جودھپور جانے کا سوال آیا۔ کئی بار شمیم آچکے تھے کہ "چلو اب یہاں کیوں مری پڑی ہو۔" ان کے نواب زادے تو بغیر امتحان دیے ہی چلے گئے تھے۔

جیسے ہی شدت کی گرمی ہونے لگی وہ مسوری چل دیے۔ شمیم ایک پارٹی کے ساتھ آگرہ رنڈیوں کا گانا سننے گئے تھے ورنہ ضرور ان کے ساتھ جاتے۔ میں ان سے پڑھنے کو کہتی تو جواب دیتے۔

"تین دفعہ کا کورس رٹا پڑا ہے۔ ذرا سی کتبیا بدلی گئی ہے سو ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔ کچھ مشکل سوال ہوں تو پوچھ لو۔"

"کون سی کتبیا ؟"

"یاد نہیں پتلی سی ہے۔ اس کمبخت شیکسپیئر کی۔"

"میکبتھ ؟"

"ہاں ہاں وہی۔اس میں کیا دھرا ہے مجھے پورا شیکسپیئر رٹنا پڑا ہے چاہے جہاں سے پوچھ لو۔"

"مگر وہ تو خاصی موٹی کتاب ہے۔"

"پیارے میاں الّو کے پٹھے نے اپنے کٹے سے پھڑ وادی آدمی سے بھی کم کچی۔ مگر ہمیں سب یاد ہے۔"

"اچھا لیڈی میکبتھ کی سولولوکی سُناؤ۔"

"کس کی ؟ اس کھکھوڑا ئن کی ؟ کیا گدھے پن کی بکواس ہے۔ میں نے بھی اسے وہ کھری کھری سُنائیں کہ بس دانت کھٹے ہو گئے ہوں گے۔ مگر دیکھ لینا نمبر فل ملیں گے۔"

میں نے تو لیڈی میکبتھ کو ذہنی احساس گناہ میں گرفتار بتا کر رحم کھایا تھا۔ دولت اور اقتدار کی ہوس انسان کی کیا مٹی پلید کرتی ہے۔ دو دن پہلے رشیدہ آئی تھیں، پتہ نہیں وہ کیا کان میں ڈال گئیں۔ شمیم کے بقول خود ان کی فرسٹ ڈویژن تو دھری ہے، کیا تعجب جو ناپ کر جائیں۔

شمیم ہانکتے تو بہت تھے مگر تین برس ایک ہی کلاس میں پڑھ کر تو میں بھی شاید فرسٹ ڈویژن مارلوں۔ شمیم فرسٹ ڈویژن آ گئے تو کون سا تیر ماریں گے۔ مجیب کے ساتھ تھے انھوں نے بی ایس سی کا امتحان دیا ہے انھیں بھی بی اے کا امتحان دینا چاہیے تھا مگر ان کا ارادہ آگے جھک مارنے کا بالکل نہیں تھا وہ فلم میں جانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"فلم میں جاہل ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔" وہ بھولے میں خود کو جاہلوں کی فہرست میں شمار کر گئے۔

"بالکل غلط سُندر بی۔اے ہیں، موتی لال بی اے ہیں۔" انھیں کسی فلم میں دیکھا نہیں تھا، صرف سُنا تھا۔

"ارے سب شہرت کے لیے پن چھلے لگا لیے ہیں۔ چارلی اور دیکشت۔"

"چارلی تو سُنا ہے بی اے ہیں۔"

"بس اتنی ہے تمہاری معلومات۔ کچھ نہیں جیب کترا تھا۔ ایک دن چندو لال شاہ کی جیب کتری، اس صفائی سے کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ پڑی۔ بس لٹو ہو گئے چندو لال شاہ اور رکھ لیا پانچ سو پر ملازم۔"

"پانچ سو پر ملازم !" مجھے کسی فلم والوں، موتی لال، سریندر اور اشوک کمار کسی کے نام نہیں معلوم تھے۔ ہاں اور ڈی بلی موریہ اور ای بلیمور یہ اور سلوچنا یعنی کافی معلومات تھیں۔

ان میں سے صرف ایک فلم سلوچنا اور بلی موریہ کی نمائش ایک سال پہلے میں نے دیکھی تھی جس پر ابا نے اماں کو بہت ڈانٹا تھا اور باقی نمائش پر پابندی لگادی گئی تھی۔

امتحانوں کی وجہ سے سعادت نے مجھے نہیں جانے دیا تھا، ورنہ جی تو بہت تڑپا تھا۔

"تو ہمارا کرایہ تم دو تو ہم تمہیں گھر لیتے چلیں"۔

"میں تو اکیلی آئی تھی اکیلی چلی جاؤں گی"۔

"نہیں ہم تمہیں اکیلی نہیں جانے دیں گے"۔

"تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ ہم کس دن گئے۔ ہم برقعہ اوڑھ لیں گے اور بہت سی لڑکیوں کے ساتھ جائیں گے"۔

"بڑی کمینی ہے کمبخت۔ بہن ہمیں لے چل ہمارے پاس کرایہ نہیں۔ لاؤ اپنے اور ہماری ٹکٹوں کے پیسے"۔

تھوڑی سی بحث کے بعد میں نے حساب لگا کر خرچہ کے روپیہ دیدیے۔ شمیم خوب ہنسے۔

"گدھی۔ یہ دیکھو انھوں نے جیب سے روپیہ نکال کر دکھایا، آج ہی منی آرڈر ملا ہے"۔

"لاؤ میرے پیسے کمینے کمبخت"۔ مگر شمیم ہنستے ہوئے چلے گئے۔

شمیم نے زندگی میں اتنی بار اُلّو بنایا پھر بھی عقل نہ آئی اور ہمیشہ ہر کوئی اس کے جھانسے میں آجاتا تھا۔

پلیٹ فارم پر مجھ سے میرا ٹکٹ مانگا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بیوقوف ہم حفاظت سے رکھیں گے، تم کھودوگی"۔

میں نے ٹکٹ نہیں دیا، کیا عجب جو ابھی جا کر ٹکٹ واپس کر کے پیسے داب لے اور میں بے ٹکٹ سفر کرتی پکڑی جاؤں اور جرمانہ بھروں۔ میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو میں حفاظت سے رکھونگی"۔

"دیکھو وہ آئس کریم والا کھڑا ہے، ہمیں آئس کریم کھلاؤ"۔

"لاؤ پیسے!"

"نہیں، اپنے پیسے سے کھلاؤ"۔

"ہٹ ہٹ، یہ جھول ہے۔"

"اگر نہیں کھلاؤ گے تو میں چلاتی ہوں کہ یہ لڑکا مجھے چھیڑ رہا ہے۔" میں نے ان کا گریبان پکڑ لیا۔

"ہٹ بیہودہ ہم تو تیرے سگے بھائی ہیں۔"

"تمٹ بابو کو کیا معلوم۔" شمیم بے بس ہو گئے۔

"کمینی کہیں کی اچھا گریبان تو چھوڑ ابھی کھلاتا ہوں چڑیل۔"

میں نے گریبان چھوڑ دیا، دور ہٹ کر بولے۔" دو جوتے کھلاتا ہوں۔ذلیل ہیں بنانے چلی تھی۔" اچھا تو ناشتہ دان میں سے ایک نوالہ نہیں ملے گا۔ممانی جان نے کباب، پراٹھے اور خاگینہ اور شکر قند کا حلوہ ....

"لا۔ ہمارا حصہ دیدے۔"

"دو جوتے دوں گی۔"

"مکار!" بھنبھناتے ہوئے گئے اور آئس کریم لادی۔

"اللہ کرے حلق میں کیڑے پڑیں، ذبتھیریا ہو جائے۔"

"اُف کتنی لذیذ ہے کہ بس مم مم۔"

شمیم کتنے ہی بدذات سہی ان کی خدمت میں وقت خوب گزرتا تھا اتنا ہنساتے تھے کہ پیٹ دکھنے لگتا تھا۔گھر میں ہر ایک کو بنا کر جو چاہنا اینٹھ لینا۔اور سچ تو خدا کا بندہ کبھی بولتا ہی نہیں تھا پھر بھی شمیم نہ ہوتے تو مزہ نہیں آتا تھا۔شوکت آپا کو بے حد ستاتے تھے مگر وہ بھی ان کی باتوں پر ہنسی نہ روک پاتی تھیں۔

نعیم کے دودھ کی ملائی چٹ کر جاتے،شوکت آپا دہائی ڈالتیں تو کبھی نہ کھتے۔

"ہاں کھائی ملائی تو پھر؟ ارے اس کتے کا چچا ہوں،بزرگوں کی خاطر مدارات تو چھوٹوں پر واجب ہے۔اسے توفیق نہ ہوئی تو میں نے دل میں کہا " تو چچا ہے بھتیجے کا خیال تو نہ رکھے گا تو اور کون رکھے گا۔میں نے ملائی کھائی اسے خدا کی خوشنودی مفت ہاتھ آ گئی۔بزرگوں کی خدمت بڑا ثواب کا کام ہے۔"

"ارے غارت ہو خوشنودی۔ اور ثواب جائے چولھے میں۔ ندیدہ کہیں کا۔"

"اور بھئی ہم تو اسی کے فائدے کے لیے ملائی زہر مار کر جاتے ہیں۔کوئی ہمیں پسند ہے ملائی۔

اللہ قسم گھن آتی ہے چکنی چیزوں سے۔"

"ہاں بڑے چہیتے۔ بزرگ بنتے ہو کبھی بھتیجے کو کچھ دیتے ہاتھ ٹوٹتے ہیں۔"

"ارے کیا ذلیل باتیں کرتی ہو شوکت، یہ لے نعیم بیٹے۔" انھوں نے جیب سے روپیہ نکال کے نعیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ شوکت آپا شرمندہ ہوگئیں۔ "جا بیٹے عیش کر۔"

ننھے بھائی تولیہ باندھے نہا کر نکلے، میز پر کچھ ڈھونڈنے لگے۔

"شوکت یہاں روپیہ رکھا تھا، تم نے تو نہیں اٹھایا؟" نعیم کے ہاتھ میں روپیہ دیکھ کر "نعیم یہ روپیہ . . ."

نعیم بے حد ہکلاتا تھا۔

"یہ . . . یہ . . . رو رو . . ."

"گدھے کتنی بار منع کیا ہے ہماری چیز کو ہاتھ نہ لگایا کرو۔" انھوں نے روپیہ چھین ایک چپت جڑی۔

"چہ . . . چہ چاچا۔" نعیم اور بھی ہکلا کے رونے لگے۔

"واہ وا، بیکار مار دیا۔ شمیم دے کے گئے ہیں یہ روپیہ۔"

"شمیم اور کسی کو روپیہ دیں، اور وہ بھی اپنی جیب سے۔ گھاس کھا گئی ہو۔"

شوکت آپا خوب بھنّائیں، شمیم کو کوسنے لگیں۔

مگر ننھے بھائی مسکرا رہے تھے۔

"بدذات کو ڈانٹیے گا۔"

"ہمارا روپیہ مل گیا، ہم کسی کو نہیں ڈانٹیں گے۔"

یہ قصہ شوکت آپا نے سنایا اور ہنسنے لگیں۔ کہاں تک جی جلاتیں۔

# علی گڑھ

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں، اور سب کا چل چلاؤ تھا۔ ننھے بھائی شوکت آپا کو لینے جودھپور گئے، وہ اسحاق بھائی کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں، وہیں چنو ٹائیفائڈ کے علاج کے لیے مستقل سال بھر سے تھے، انھیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔

ننھے بھائی انھیں معائنہ کے لیے ہسپتال لے گئے معلوم ہوا ٹی بی ہے دوسری اسٹیج شروع ہو چکی ہے۔ ننھے بھائی نے وہیں چنو کو بتا دیا کہ تمھیں ٹی بی ہو گئی ہے سیدھے سوجت چلو وہاں سرکار کے فیصلے کے بعد تمھارا علاج ہو گا۔

جب چنو آیا تو پہچان نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اسے قریب دو سال بعد دیکھا تھا بے انتہا لمبا بانس، ہڈیاں ہی ہڈیاں، بوٹی نام کو نہیں۔ گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اماں نے ننھے بھائی کو خوب ڈانٹا جیسے وہی چنو کو ٹی بی کرا لائے تھے۔

ابا نے سینی ٹوریم میں عرضیاں بھیجیں کہیں جگہ خالی نہ تھی۔ آپا موجود تھیں وہ بچوں کو لے کر علی گڑھ جانے والی تھیں۔ ابا نے ان سے کہا "تم چنو کو لے کر آبو روڈ اسٹیشن چلی جاؤ تمھارے بچے آرام سے علی گڑھ پہنچ جائیں گے۔"

چنو کا قد چھ فٹ تین انچ ہو گیا تھا۔ ایک دن اسے خون آیا تو بچوں کی طرح رونے لگا۔ اماں کا روتے روتے برا حال تھا۔ چنو سے انھیں محبت کرنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ کسی کو بھی چنو سے دلچسپی نہ تھی وہ بہت تندرست جنگلی بجار کی طرح طاقتور تھا۔ منے بھائی کو بھی ٹی بی ہو کر اب آرام تھا۔ مگر چنو کو ٹی بی ہو جائے گی یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں اور چنو بچپن سے ایک دوسرے

سے زیادہ قریب رہے تھے۔ شمیم انتہائی بدذات اور مرکھنے تھے۔ جب وہ ہم سے لڑتے تھے تو ہم دونوں میں کسی کو بھی ستاتے دوسرا فوراً مدد کو پہنچتا اور ہم دونوں کر ان پر بھاری پڑ جاتے تھے جنوری کو دق میرا کلیجہ مسل گیا اور چھپ کر بہت روئی۔ سارا گھر سہما ہوا تھا۔ اماں وقت بے وقت روتیں۔

میں نیر حبیب مجیب علی گڑھ چلے گئے۔

ایف اے کلاس میں چھ لڑکیاں تھیں۔ آج علی گڑھ کالج میں دو دو سیکشن ہیں اور داخلہ نہیں ملتا۔ اس وقت علی گڑھ میں صرف "ایف اے" "سیکنڈایر" تک انتظام تھا مسلمان لڑکیوں کو پڑھانے کے خلاف تھے۔ سعادت لکھنؤ آئی۔ ئی کالج چلی گئی تھی۔ وہ میڈیسن کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لکھنؤ میں چھٹیاں ہوتیں تو وہ بنگلور اتنی دور جانے کے بجائے علی گڑھ آجایا کرتی تھی اور کلاس میں بھی بیٹھتی تھی اگر ہماری کلاسیں ہوتیں۔

بورڈنگ کی زندگی انتہائی محدود مگر زندہ دل انسان کے لیے تو پتھر میں بھی پھول کھلنے لگتے ہیں۔ میں ہر ہنگامے میں جوش و خروش سے حصہ لیتی۔ بہت سی دوست تھیں تو بہتوں سے لڑائیاں بھی ہوتیں گیمس اب میرے قابو میں آچکے تھے اور ہر گیم میں حصہ لیتی تھی۔

ایف اے کی لڑکیاں ان خاص کمروں میں رہتی تھیں جو ڈائننگ روم کے قریب تھے۔ کمروں کے پیچھے غسل خانے بھی تھے۔ بجلی اب بھی نہیں آئی تھی اور لالٹین جلتی تھیں۔ پلنگ ہر لڑکی کو اپنے یہاں سے لانا پڑتا تھا۔ اور ایک دن جب شوکت آپا سو رہی تھیں میں کوڑے کی کوٹھری میں چھپا ہوا نیا بنا پلنگ اڑا لائی تھی۔ اس کا میں نے ان سے کبھی ذکر نہیں کیا۔ بے چاری نے ڈھونڈا ہوگا۔ پھر مہتر کو چور گردان لیا ہوگا۔

میری روم میٹ نصیر تھی جو سیکنڈ ایر میں تھی۔ نصیر بے حد پیاری ہنس مکھ اور ہر کھیل میں مشاق تھی۔ نصیر میری جان تھی۔ میرے پھوہڑپنے کو جھیلتی تھی۔ اگر میں کسی کے پاس گپنوں میں کھو جاتی تو فوراً پکڑ کر مجھے پڑھنے کی طرف توجہ دینے پر مجبور کرتی۔

ممتاز عبداللہ ہمیں ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ کافی کم عمر اور اندازے سے بے حد نرم تھیں اس لیے بے حد رعب جماتی تھیں۔ ان سے لڑکیاں بے حد خائف تھیں۔ میں بھی ذراسی ڈرتی تھی۔ اور اپنی خصلت کے مطابق جس سے ڈرتی تھی اس سے کافی بدظن ہو جاتی تھی۔ مجھے رعب جمانے والوں سے بغض تھا۔

ان سے بالکل مختلف ان کی بڑی بہن خاتون عبداللہ پرجان جاتی تھی۔ بے حد نرم گفتار ہمیشہ مسکرا کر بات کرتیں۔ کسی لڑکی کو ڈانٹنا ہوتا تو بے حد گھبراتیں ڈانٹتے ڈانٹتے انھیں ایک دم ہنسی آجاتی اور ان کی پوزیشن ڈگمگانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔ کیوں کہ وہ اتنی نرم دل تھیں ان سے واقعی ڈر لگتا تھا۔

مس رام اب میری کوئی کلاس نہیں لیتی تھیں صرف گیمس پر آتی تھیں خود انھیں گیمس سے وحشت ہوتی تھی مگر اپنی ڈیوٹی بجالانا فرض سمجھتی تھیں۔ چوتھی کلاس سے وہ مجھے جانتی تھیں اور ہر شرارت میرے سر چپکا دیتی تھیں۔ لڑکیاں میری طرف سے صفائی پیش کرتیں میں خود بے گناہی کے ثبوت مہیا کرتی مگر وہ بڑی لجاجت سے کہتیں "پلیز کونے میں بیٹھ جائیے" میں تنگ آکر ہتھیار ڈال دیتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے احکام بھول کر مجھے سیڑھیوں پر بے کار بیٹھا دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتیں۔

"آپ گیم میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ بس ہر وقت کھالی بیٹھے رہتے۔"

میں انھیں قطعی یاد نہ دلاتی کہ انھوں نے خود سزا دے کر بٹھایا ہے اور فوراً کھیل میں شریک ہو جاتی۔

ایک دن خالی پیریڈ میں وہ اپنی کلاس کی لڑکیوں کو ہنکاتی لے جا رہی تھیں میرا بھی خالی پیریڈ تھا۔

"چلیے یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ چلیے ایک دم۔"

"مگر..." میں نے کہنا چاہا۔

"چلیے..." وہ بہت سختی سے بولیں اور قریب قریب ڈھکیلتی ہوئی آنھیں کلاس میں لے گئیں۔

"مس رام پلیز..." میں نے جیسے ہی منھ کھولا وہ دھاڑیں۔

"سائیلینس، اپنی سیٹ پر، اپنی سیٹ پر چلیے۔ پلیز ایک دم سائیلینس۔" لڑکیاں دوپٹوں میں منھ چھپا چھپا کر ہنس رہی تھیں جس کی سیٹ پر میں بٹھادی گئی تھی وہ عجب چکر میں تھی۔ اور بوکھلائی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے اسے میرے پاس کھڑا دیکھ کر ڈانٹا اسی لڑکی کو۔

"کلاس میں بات نہیں، کھالی پیریڈ میں دوستی چلاؤ۔ گیٹ آوٹ پلیز..."

"مگر مس رام..."

"پلیز گیٹ آوٹ... گو ٹو یور کلاس، بیٹھے بیٹھے پلیز سٹ ڈاؤن" وہ بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو

ڈانٹ کر بلیک بورڈ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ وہ لڑکی منہ موڑ کر رونے لگی نئی نئی داخل ہوئی تھی۔

خاتون آپا کی عادت تھی دبے پیر بلی کی طرح آکر کلاس روم میں کھڑی ہو جاتیں اور لڑکیاں اٹھنے لگتیں تو فوراً بٹھا دیتیں۔ ایک دم جاتے جاتے مجھے دیکھ کر ٹھٹکی رہ گئیں۔

"لو!۔۔۔ وہاٹ آر یو ڈوئنگ ان دِس کلاس۔"

"میں۔۔۔ وہ۔۔۔"

"کم ٹو مائی آفس پلیز۔"

میں مس رام سے اجازت لے کر بھاگی۔ انھوں نے بھی خاتون آپا کو سلام دیتے سن لیا تھا۔ وہ اس نئی لڑکی کو ڈانٹنے لگیں جو کھڑی بسور رہی تھی۔

میں نے تفصیل بتائی تو خاتون آپا نے کہا۔

"بکومت۔"

"قسم خدا کی آپ آٹھویں کی لڑکیوں سے پوچھ لیجیے مس رام زبردستی پڑھا رہی ہیں۔"

پھر خاتون آپا ہنسنے لگیں۔

"مس رام کب سے پڑھا رہی ہیں۔ تھک گئی ہیں، کہتی ہوں چھٹی لے لو تو بگڑ جاتی ہیں۔"

مس رام بھی کافی حسین ہوں گی۔ بے حد نبک نقشہ، شفاف بے داغ رنگ۔ ہائی سفید ہوتے ہوئے گھنگھریالے بال مجھے کرید لگ گئی۔ کسی استاد کے بارے میں اُلٹے سیدھے سوالوں کے جواب نہایت خشک ہوتے ہیں۔ مگر رشیدہ عبداللہ سے دنیا کی کسی بات پر روکھا جواب نہیں ملتا تھا۔

مس رام ایک انگریز کے دام محبت میں گرفتار ہوئیں تھیں۔ وہ پولیس میں تھا۔ اور اس کی منگیتر ولایت میں تھی مس رام اس وقت بے حد حسین تھیں۔ ان کی نانی پرنانی ہندوستانی تھیں۔ تو قاعدے سے وہ اینگلو انڈین ہوئیں۔ ان کی شادی اس پولیس والے سے نہ ہو سکی اور وہ محکمہ تعلیم میں غرق ہوگئیں۔ جب علی گڑھ آئی تھیں تو بے حد خوبصورت تھیں۔ کئی پروفیسروں نے ڈورے ڈالے مگر یہ بالکل تارک الدنیا ہوگئیں۔ ارتھمیٹک میں بڑی دماغ پاشی کی ضرورت ہوتی ہے عموماً اس مضمون میں اس قابلیت کی لیڈی ٹیچر نہیں ملتیں۔

اختر اور جمیلہ ساتویں کلاس میں تھیں ڈے اسکالر تھیں۔ گھر سے مزے مزے کے کھانے پکوا کر خوب ہماری دعوتیں کرتیں میں میٹرک کی تیاری کر رہی تھی اور بہت کم جاتی تھی مگر میں بھی

مہینہ دو مہینہ میں عثمان ولا چلی جاتی تھی۔ عشرت میٹرک کے بعد بمبئی سینٹ زیویرز میں داخل ہو گئے تھے۔

جسیم بھائی کو اختر کی طرف سے انکار ہوا تو وہ ایسے دل شکستہ ہوئے تھے کہ ابا نے انھیں انجینئرنگ کے لیے انگلینڈ بھیج دیا تھا۔

انکار اس وجہ سے ہوا تھا کہ داؤد بیگ باوا یعنی رفیع الدین بیگ کے بھتیجے بمبئی فلموں میں بہت دولت کما رہے تھے۔ باوا اختر کی شادی ان سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ وہ جواتنے ٹھاٹ باٹ سے لوٹے تو فوراً منگنی کر دی گئی۔ اور جسیم بھائی کو انکار کر دیا گیا۔

اختر نے مجھے انگوٹھی اور بہت قیمتی گھڑی دکھائی۔ مجھے اس کی منگنی سے بہت خوشی ہوئی۔ شمیم ٹھیک ہی کہتے تھے فلم لائن میں ڈگریوں کی نہیں فن کی قدر ہوتی ہے۔ داؤد بیگ حسین تھے جوان تھے اور بے حد کامیاب۔ میں نے اس وقت تک صرف ایک فلم دیکھی تھی سلوچنا اور بلی موریہ کی۔ فلم لائن سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بس شمیم تو کچھ فلمی ستاروں کے نام سے واقف تھے اور شمیم بھکڑ تھے۔ انھوں نے ایک سال امتحان نہیں دیا۔ سوجت اور جودھپور میں منڑگشت کرتے رہے۔ جنوآبو سے نینی تال اور پھر بھوالی سینی ٹوریم چلے گئے۔ ان کی بیماری گرفت میں آگئی تھی اور وزن بڑھ رہا تھا۔ مگر ابھی انھیں اور رہنا تھا۔

میں خاتون آپا کے آفس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ جھڑوانے کے لیے آدھ گھنٹہ پہلے کھول دیتی تھی۔ ممتاز آپا اسی طرح رعب گانٹھتی تھیں مگر خاتون آپا بڑی بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی تھیں میں ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی صدر بھی تھی اور ویسے بھی بورڈنگ کی ہر میٹنگ میں پرجوش حصہ لیتی تھی کھانا بورڈنگ کا ہوتا ہی خراب اور بدمزہ ہے۔ دراصل ایک ہی مزے کا کھانا روز پکتا ہے تو دل بولا جاتا ہے۔ ایک دن روٹیوں میں مکھیاں چپکی ہوئی نکلیں۔ بس لڑکیوں نے ڈائننگ روم چھوڑ دیا اور ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ کامن روم میں میٹنگ ہوئی کافی جوش آگیا اور اگلی پچھلی ساری بلائیں یاد کر کے ماتم پڑ گیا۔ رات کو بھی کسی نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ چوری چوری باہر سے مونگ پھلیاں اور چنے منگوائے اور چھوٹی بچیوں کو کھلا کے پانی پلا دیا۔ خاتون آپا مع کچھ ٹیچروں کے سمجھانے آئیں۔ مگر ہم نے فوراً نماز کے کمرے میں جا کر مغرب کی نماز کے بعد نفلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ یہ ترکیب خاکسار نے نکالی تھی اور نہایت کامیاب رہی۔ ویسے اختر جمیلہ کو پتہ چل گیا تھا اور وہ چھ سات ڈاگ بسکٹ کے بنڈل اور اچار چپکے سے کپڑوں میں لپیٹ کے دے گئی تھیں۔ ایک نہایت مرغن کھانوں کا بڑا سا کٹوردان

زہرہ بٹ کھسکا لائی تھی جو تبرک کی طرح کمروں کمروں بانٹا گیا۔ مگر اوپر والوں کا دانہ پانی حرام تھا کہ بچیاں بھوکی ہیں۔ ویسے بچیاں کچھ نہ کچھ دبا کے ڈبوں اور تھیلوں میں رکھتی ہی تھیں وہ نکل پڑا لیکن غنیم بے خبر تھا۔ اس کے علاوہ کچی کیریاں جھول رہی تھیں، نیچے بھی گرتی تھیں، وہ چھوٹی بچیاں ٹور ٹور کر لا رہی تھیں منہ کا مزہ بدل رہا تھا عیش ہو رہے تھے۔

رات کو ہم نے سونے کی گھنٹی کا بھی بائیکاٹ کیا اور ٹینس کورٹ پر دریاں بچھا کر خوب زور زور سے قوالیاں گائیں۔ بی بی بیٹڈ کی دھن پر ایک ہجو پورے اسٹاف پر لکھی جسے گا گا کر لوٹ ہو گئے۔ کھانا میز پر لگتا۔ گھنٹی بجتی اور پلیٹوں میں چوہے فٹبال کھیلتے مگر ہم ڈٹے ہوئے تھے۔

پھر منتظمین کا وفد آیا، اور لڑکیوں نے مجھے ٹھوکے مار مار کر آگے ڈھکیلا۔ حالاں کہ میں بھی برابر کی گناہ گار تھی لیکن سب کا غصہ مجھ پر ہی اترا۔

"ہم یہ غلیظ کھانے سے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" ڈرامائی انداز میں فرمایا۔

"کھانا اچھا خاصہ ہوتا ہے۔" ممتاز آپا بولیں۔

"آپ کھاتی کتنا ہیں۔" میں نے ان کے دبلے پن پر چوٹ کی۔ وہ مجھ سے کافی عاجز تھیں۔ سلگ کر رہ گئیں۔

"اور پھر آپ کے ہاں تو اچار چٹنی مکھن دودھ ملائی انڈے۔"

"پھل میوے مٹھائی بڑی سڑا کرتی ہیں۔" لڑکیوں کی ہمت بڑھ گئی۔ وفد نہایت غصہ سے واپس لوٹ گیا۔

کوئی چار بجے اعلا بی کاسنی غرارہ سفید چکن کا کرتا اور سفید چنا ہوا دوپٹہ اوڑھے جیسے ہوا پر تیرتی چلی آ رہی ہیں۔ آتے ہی پکارا۔

"ارے لڑکیو! اے کہاں مر گئیں۔" ان کی آواز سنتے ہی چند لڑکیاں تو سر سر رونے لگیں اور کمروں میں جا چھپیں۔ چھوٹی بچیاں بے ساختہ دوڑ کر انھیں گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ ان بچوں کو ہم لوگ "چوزے" کہا کرتے تھے۔ "چوزوں" کا غول لیے وہ ہماری طرف آئیں۔

"کیوں ری کچی کیری بھکس رہی ہے۔ گلا آئے گا تو مرے گی۔" انھوں نے حمیدہ کے ہاتھ پر تھپڑ مار کر کیری گرا دی، حمیدہ نیم کے پیڑ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اے کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، چلو میرے ساتھ۔"

دم بھر میں گودام کھلا، جھپا جھپ پوریوں کا آٹا گندھا، کچھ لڑکیاں آلو چھیلنے لگیں۔

ایک ہلچل مچ گئی۔

"اے ہے چٹنی، لڑکیو! چٹنی بغیر پوریوں کا خاک مزہ آئے گا۔" علابی بولیں۔

ایک جھنڈ کیریوں پر لوٹ پڑا۔ آدھی کھائیں آدھی کی بھر بھگونا چٹنی پیسی۔ اعلابی پوریاں تلنے بیٹھ گئیں۔ جتنے چھلکے، صاف پڑے تھے۔ بیلنوں اور خالی بوتلوں سے پوریاں آڑی ترچھی تونی بیلی جانے لگیں۔

ایک بچی اپنی سلیٹ پر بیل رہی تھی۔

بیان نہیں کر سکتی اس دن کیا لطف آیا ہے۔

"اے دیوانیو میٹھا!" اعلابی چلائیں، اور سب سنانے میں رہ گئے۔

"حامد میاں کی منگنی کے لڈو لڑکیوں کے جننے کے اماں نے بھیجے ہیں۔" اچھن آپا جھولرے کے سر پہ ٹوکرا رکھوائے داخل ہوئیں، پیچھے پیچھے برقعہ سنبھالے ہانپتی کانپتی ان کی اماں پالی خالہ۔

"اموتو یہ ٹھاٹ ہیں۔" شلوار قمیص بغیر دوپٹے کے، کٹے ہوئے بال اڑاتی رشیدہ آپا پھٹ پڑیں لڑکیاں کائیں کائیں کرتی ان سے لپٹ پڑیں۔

چٹائیاں بچھیں، ٹاٹ کے ٹکڑے گھسیٹ کر لائے گئے رکابیاں سینیاں لگیں غرض جس کو جس برتن میں موقع مل گیا جٹ گیا۔ اُف کتنا کھایا۔ نمکین پھر میٹھا پھر چٹنی پھر نمکین پھر میٹھا!

بڑی دیر میں نظر آئیں کچھ اجنبی سی غیر غیر سی ایک طرف خاتون آپا کھڑی دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھیں۔

"اے ہے کوئی دولھا میاں کو تو بلاؤ۔" وہ شیخ عبداللہ کو دولھا میاں کہتی تھیں۔

اور جیسے کسی نے علادین کا لیمپ گھسا، شاہد نے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا۔ پاپا میاں ذرا جھک کر داخل ہوتے۔ تالیوں کی شور میں وہ کڑہائی سے تھوڑی دور ایک کرسی پر بٹھا دیے گئے۔

کھانے کے بعد کرسیوں پر اشاف، پاپا اور اعلابی بیٹھے۔

"بچیو! ایک دن یہ سارا لمبا چوڑا میدان" انھوں نے چھڑی گھما کر کہا "ایک جنگل تھا یہاں سیار گیدڑ چلاتے تھے، سانپ پھنکارتے تھے، میں منڈیر پر کھڑا ایک گلزار کے خواب دیکھا کرتا تھا آج اس جنگل میں پھول کھلے ہیں۔" کالی کلوٹی لڑکیوں تک کے چہرے گلنار ہو گئے۔ دو چار عادی مجرم آنسو بہانے لگیں۔

"تمھیں اس کالج کی آن بان ہو، تم سے اس حقیر زمین کے ٹکڑے پر ایک درس گاہ قائم ہے۔

میری دعا ہے کہ زندگی میں تم بھی کوئی حسین خواب دیکھو اور وہ حقیقت بن جائے۔"

تالیوں کا شور کم ہوا تو خاتون آپا بولیں۔

"پاپا کی رائے ہے کہ بورڈنگ کی چار ذمہ دار لڑکیاں ایک ایک ماہ کھانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں۔ دوسرے مہینہ دوسری چار لڑکیوں کا گروپ ذمہ داری لے۔"

"ہم تیار ہیں" بہت سی لڑکیاں چلائیں۔ میں چپ رہی، مگر سب کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔

"مہینے کے شروع ہونے سے پہلے تمہیں تمام جنس گیہوں، دالیں، گھی، تیل، مٹی کا تیل وغیرہ کا بجٹ تیار کرکے۔" کچھ مس جرمی نے کان میں کہا۔ "ہاں صبح کا ناشتہ اور شام کی چائے پر بسکٹ۔"

"مر گئے" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ اور تفصیلیں سناتی رہیں مگر میرا دماغ نہ جانے کہاں قلانچیں بھر رہا تھا۔

"کیوں؟ آپ کی کیا رائے ہے" ممتاز آپا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میری؟" میں چونک پڑی۔

"ہاں میرے خیال میں پہلے بیچ میں عصمت کو ہی ذمہ داری سونپی جائے۔"

"ذمہ داری اور میں!" میں نے سوچا۔

"اس طرح لڑکیوں کو گھرداری کا بھی سلیقہ آئے گا۔"

"گھرداری"! مجھے چکر آ گیا۔ "غریب ہوا تو کھچڑی پکالیں گے، امیر ہوا باورچی رکھے گا۔" مجھے اپنے ہی الفاظ یاد آئے۔

"عصمت! پلیز اسٹینڈ اپ اینڈ آنسر!" خاتون آپا نرمی سے بولیں۔ میں کھڑی ہوگئی۔

"میں تو بہت پھوہڑ ہوں۔" میں نے جیسے فخریہ کہا۔

"تب تو تم دوسرے تیسرے بیچ میں بھی شامل رہنا۔ پہلے بیچ میں نصیر۔۔"

"پلیز، میرا فائنل ایر ہے۔" نصیر منمنائی۔

"تو محمودہ، مسعودہ، عصمت اور سلطانہ۔"

"پلیز عصمت کو ہمارے بیچ میں مت رکھیے یہ بڑی گڑبڑ مچائیں گی، کچھ کریں گی نہ کرنے دیں گی۔" محمودہ بے انتہا خوبصورت تھی، تمام لڑکیاں اس پر مرتی تھیں، مگر مجھ سے جھگڑا تھا، ایک نازک سی بات پر۔

"ارے واہ خواہ مخواہ ہی جھوٹے الزام لگا رہی ہو" میں نے اسے ڈانٹا۔

"نصیر آپا سے پوچھ لیجئے۔ ایک منٹ تو میری ان سے بنتی نہیں، ہر وقت بدتمیزی کی باتیں کرتی ہیں" سب لڑکیاں کھی کھی ہنسنے لگیں۔

"تم نے ہم سے تو کبھی شکایت نہیں کی۔ بنیاد کیا ہے جھگڑے کی" انھوں نے لڑکیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ لڑکیاں بے تحاشہ ہنستی رہیں۔ محمودہ چپ!

"عصمت، محمودہ کل وقفہ میں دفتر آؤ" محمودہ رو پڑیں۔ میں نہایت معصوم شکل بنائے رہی۔

"اور سوچ سمجھ کر ہمیں اپنی رائے سے مطلع کرو کہ کھانے کے بارے میں جو آئے دن شکایتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے بارے میں کیا کرنا چاہئے۔ یہ دھرنے اور اسٹرائیک سے پہلے سوچ بچار کر کے اپنی شکایتیں دفتر میں پیش کرو"

اعلابی اور پاپا میاں سب کو دعائیں دیتے چلے گئے۔

"عصمت، محمودہ۔ ہمارے ساتھ عبداللہ لاج تک چلو۔ ملازم واپس پہنچا جائے گا" خاتون آپا بڑی فکر مند تھیں، ان کا چہرہ بے حد سفید تھا اور ماتھے پر شکنیں۔ تھوڑی دور تک ہم چلتے رہے۔

"اب بتاؤ کیا قصہ ہے۔ محمودہ"

محمودہ نے سر جھکا لیا۔

"عصمت تم ہی بتاؤ۔"

"خاتون آپا مجھے تو محمودہ سے کوئی شکایت نہیں"

"پھر بھی تمھیں معلوم تو ہوگا انھیں تمھاری کون سی بات ناگوار گذری"

"خاتون آپا دن میں نہ جانے کتنی باتیں لڑکیوں کو ناگوار گذرتی ہوں گی"

"تم بہت بدتمیز ہو"

میں نے اقرار میں شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"لڑکیوں کو بہت ستاتی ہو"

"آپ سے کس نے شکایت کی میری۔ اور پھر آپ نے مجھے سزا کیوں نہ دی؟"

"تم بہت حجت کرتی ہو" وہ غصہ ہو گئیں۔

"سوری خاتون آپا۔ میری تو ساری لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بچیاں تک مجھے گھیر کر کہانیاں

سنتی ہیں۔کوئی گھر کی یاد میں بے چین ہوتی ہے تو میرے پاس آتی ہے۔مجھے سب لڑکیاں پیاری لگتی ہیں مجھے اس اسکول سے بے پناہ محبت ہے۔میرا کوئی استاد مجھ سے ناراض نہیں۔میں نے آج تک کسی سے گستاخی نہیں کی۔"

"تم نے منی کے بارے میں کچھ بکواس کی۔" ممتاز آپا کو وہ منی کہتی تھیں۔

"شاہدہ، خورشید چڑیلوں نے شکایت جڑی ہوگی۔چور کہیں کی۔"

"نہیں شکایت نہیں کی، مگر تم ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کرتی ہو۔"

"کیا ممتاز آپا بہت خفا ہیں۔خورشید بہت ذلیل ہے۔"

"نہیں۔مگر تمہاری استاد ہیں۔ان کے بارے میں تم کیا بکواس کرتی ہو۔"

"خاتون آپا، ہم سب لڑکیاں پیٹھ پیچھے ٹیچروں کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں مگر ہم جاکے ان کی رپورٹ تو نہیں کر دیتے۔خورشید جھوٹی ہے۔"

"نہیں تم خورشید سے کچھ نہ کہنا۔ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتائیں گے اور پھر بات اور پھیلے گی۔مگر تم ایسی دیوانی باتیں کیوں کرتی ہو؟"

وہ دیوانی بات یہ تھی کہ ایک دن ممتاز آپا نے مجھے ہسٹری کی کاپی کھو دینے پر ڈانٹا، بعد میں وہ کاپی انھیں مس جرمی کے کمرے میں مل گئی۔وہ وہاں کاپیاں لے گئی تھیں ایک کاپی چھوٹ گئی تھی۔مس جرمی نے براہ راست مجھے کاپی دے دی۔کاپی کھونے پر ممتاز آپا نے مجھے کلاس سے نکال دیا تھا۔میرا بہت جی جلا۔میں نے کہا۔

"ٹھہر جاؤ میں بھی ممتاز آپا کے سسر سے شادی کر کے انھیں وہ مزہ چکھاؤں گی کہ یاد ہی کریں گی۔"

خورشید خوب ہنسی تھی کہ لاجواب ترکیب ہے انتقام لینے کی۔

"اچھا محمودہ تمہاری شکایت۔"

"یہ نہیں بتاتی تو میں بتائے دیتی ہوں خاتون آپا خدا کی قسم میری نیت میں کھوٹ نہ تھی۔ محمودہ بہت خوبصورت ہے۔میں نے کہا محمودہ میں اپنے بیٹے سے تمہاری بیٹی کی شادی کروں گی۔ خاتون آپا کیا لڑکیاں آپس میں ایسے رومینٹک وعدے نہیں کرتیں۔"

"کرتی تو ہیں۔"

"تو میں نے کون سا اتنا بڑا جرم کیا، یہ بولی ہیں تو اپنی لڑکی کی شادی ہرگز تمہارے لڑکے

سے نہیں رہوا رہی تھی میں نے کہا میں زبردستی تمہاری لڑکی بھگوا لوں گی۔ اس پر سب لڑکیاں ہنسنے لگیں
تو یہ بھی بھول رونے لگیں۔ بیوقوف کہیں کی۔"

خاتون آپا ہنسنے لگیں تو محمودہ بھی ہنسنے لگی۔

"محمودہ تم بے فکر رہو، اگر خدا نہ کرے تمہاری لڑکی کا دل میرے بیٹے پر آ گیا تو میں اس کا
ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دوں گی میرا مطلب ہے اپنے بیٹے کا۔ بس اب تو تم خوش؟"

"کیا تم لوگ بچوں جیسی باتوں پر لڑ بیٹھتی ہو؟"

ابھی دو سال ہوئے پاکستان میں محمودہ سے ملاقات ہوئی۔ اس کی چاندنی بیٹی بھی ساتھ تھی میں نے اس سے کہا "بیٹی جان، میرے کوئی بیٹا نہیں ورنہ قسم سے میں ساری سرحدیں توڑ تاڑ کے تمہیں بہو لیتی" محمودہ کی بیٹی میرے سینے سے لگ گئی۔

کتنی حسین و دلچسپ تھی کالج کی زندگی۔ ایک ایک بات دل پر نقش ہے۔ ہنسی مذاق ہی نہیں۔ وہ وقت جو اعلانی کے ساتھ گذرا۔ جو پاپا میاں کے قدموں میں بیٹھ کر بتایا۔

خاندان کے بزرگوں سے مجھے اپنے سوالوں کے جواب کبھی نہیں ملے۔ میرے ہر سوال پر ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا۔ اماں سے بات کرتے ڈر لگتا تھا۔ وہ مجھ سے ہر وقت نالاں رہتی تھیں میں نیک اور سمجھدار لڑکی نہیں تھی۔ گھر گھرستی سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میری تینوں بہنیں سلائی، بنائی اور پکوان میں ماہر تھیں بڑی کامیاب بیویاں ثابت ہوئی تھیں۔ آپا بیوہ ہو گئی تھیں، مگر زندگی کے چند پُر بہار سال اور تین ہونہار ذہین بچے ان کے مثالی مشرقی عورت ہونے کا ثبوت تھے۔ اماں نے گھر کا سارا انتظام سونپ دیا تھا اور بڑی خوبصورتی اور سگھڑاپے سے گھر کا انتظام کرتی تھیں۔ علی گڑھ میں خولجہ فیملی کے سگھڑاپے اور ٹھاٹ باٹ سے بے حد مرعوب تھیں۔ وہ ان کے گھر کی بہت سلائی بنائی کرتی تھیں۔ آپا بالکل مشین بن گئی تھیں۔ صبح اٹھ کر نماز اور تلاوت قرآن کے بعد وہ کھانے کی طرف توجہ دیتیں پھر بڑے چوکے پر سلائی کی مشین اور کپڑوں کے گٹھر کھول کر بیٹھ جاتیں۔ جب تک چھوٹی آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ بھی ان کا ساتھ دیتیں۔ اماں ایک مخصوص کونے میں بیٹھی چھالیا کترتی رہتیں وہ بالکل ریٹائر ہو گئی تھیں اور ہر طرف آپا کا حکم چلتا، اور ہم چھوٹوں کی حیثیت محکوم جیسی تھی۔ چونکہ میں سلائی اور پکوان میں دلچسپی نہیں لیتی تھی لہذا راندۂ درگاہ تھی۔ پوری کوشش یہی رہتی تھی کہ ان کے سائے سے دور رہوں۔

تو بھلا اپنے سوالوں کے جواب کس منہ سے مانگتی۔

اعلابی دوستوں جیسا برتاؤ کرتی تھیں ان کی باتوں میں کہانی قصوں جیسا چٹخارہ تھا۔
اسکول کے قیام میں لیا لیا لعنتیں اور بدنامیاں سہیں۔ ان کا خاندان بڑا روشن خیال تھا۔ شادی سے پہلے ہی انھوں نے لڑکیوں کا اسکول کھولنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ نوکروں کی بچیوں کو جمع کر کے قرآن اور اُردو کے ساتھ تھوڑا بہت حساب بھی سکھاتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں بڑی شدت سے احساس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں تو بہت ہی جہالت کا زور ہے۔

اعلابی نے جو میکے میں اسکول سا شروع کیا تھا وہ گھر کے نوکروں کے علاوہ محلہ کے بچوں تک پھیل گیا تھا۔ شادی کے بعد یہ اسکول خاک میں مل جائے گا۔ پاپا میاں تو بچپن سے ہندوستانی عورت کی زبوں حالی سے متاثر تھے۔ وہ جموں کے ایک برہمن خاندان کے بیٹے تھے۔ بچپن سے ہی بے انتہا حساس تھے۔ محلہ میں کوئی مرد اپنی بیوی کو روزانہ شراب پی کر مارا کرتا تھا۔ اس کی چیخیں پاپا کی نیندیں حرام کر دیتیں۔ جب اس کے پٹنے کا اور چلّانے کا وقت آتا تو پاپا بے چین کروٹیں بدلتے۔ جس دن اس کے رونے چلّانے کی آواز نہ آتی وہ کان لگائے ان چیخوں کے انتظار میں جاگتے رہتے۔ پٹنے والی عورت کا سارا کرب پاپا کے دل میں سما گیا تھا۔

انھوں نے اپنی ذہانت سے تن تنہا تعلیم حاصل کی اور ایک مقام پیدا کیا۔

"سہاگ رات" اعلیٰ بی کہتی تھیں! "نہ جانے کیوں میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ زندگی کے اتنے عظیم موڑ پر جی کانپ رہا تھا۔ وہ اجنبی جو اتنا قریب آنے والا تھا۔ کون ثابت ہوگا؟"

مگر وہ اجنبی اُن کے اپنے خوابوں کا شہزادہ ثابت ہوا۔ اس کے سر میں تعلیم نسواں کا سودا ابھرا تھا۔ ایسے میل شاذ ہی ہوتے ہیں۔

"میں نے سُنا ہے تجھے شادی سے چڑ ہے لڑکی۔" اپنی سناتے سناتے ایک دم اعلابی نے بات پلٹی۔

"اعلابی کسی انسان کے حکم کا تابع بننا، مجھ سے نہیں جھیلا جائے گا۔ میں نے زندگی بزرگوں کے جبر کے خلاف احتجاج کر کے گذاری ہے۔ مجھے اپنی راہ آپ بنانی ہے مجھے پتی ورتا مشرقی سگھڑ بیوی بننے کے خیال سے ہی گھن آتی ہے۔"

"اے ہے وہ کیوں؟"

"سب کا خیال ہے کہ میں کچھ پاگل ہوں۔"

"اللہ خیر!"

"مگر میں اپنے پاگل پن میں مگن اپنے دکھ سکھ انعام و سزا کی خود ذمہ دار بننا چاہتی ہوں۔"

"اگر کوئی تیرا جیسا سرپھرا مل گیا تو؟"

"جیسا آپ کو ملا۔"

"ہاں! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ تیرے پاپا کے علاوہ کوئی مجھے سمجھ سکتا تھا۔"

"لوگ کہتے ہیں آپ نے اپنے گھر اور بچوں کو نظرانداز کیا۔ آپ کی بہنوں نے بچے پالے۔"

"اے ہے تو تمہاری خواجہ فیملی میں کون بچے پالتا ہے۔ آیا، دادا، یا دادی یا نانی خالہ پھوپھی۔ ہمارے یہاں مائیں، بچوں کو خاک پالتی ہیں، پہلا بچہ دادی کا، دوسرا نانی کا، پھر خالہ پھوپھی کا۔ اور جتنے بچے آتی آیائیں، ہے کہ نہیں۔ رہا کھانا پکانا تو باورچی موجود ہیں۔"

"بیگم اماں روز کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے ضرور پکاتی ہیں۔"

"ارے وہ تو جی بہلاوے کے لیے کوئی چٹپٹی مصالحہ دار چیز، میاں پرہیزی کھاتے ہیں نا اور سلائی مغلیائی کرتی ہیں۔ اب تو درزی بھی زنانے کپڑے سینے لگے ہیں۔"

"ویسے میں اپنے کپڑے سی لیتی ہوں۔"

"اے بس کافی ہے۔ یہ دیکھو میں محسن کا کرتا ترپ رہی ہوں۔ اصل میں یہ گھرداری اور سگھڑاپے کا خواہ مخواہ جھنڈا کھڑا کر دیا گیا ہے۔"

"آپ پاپا کے بٹن ٹانکتی ہیں۔"

"اے وہ بٹن تو دھوبی ٹانکتا ہے۔ اے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ اس کی لونڈیا رام دئی چوتھی میں پڑھ رہی ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے مڈل سے پہلے گونا کیا تو نکال دوں گی۔ کہتا ہے اس کی ساس اندھی ہے اور جیٹھانی بھڑوں کا چھتہ ہیں، میں نے کہہ دیا تب تو میٹرک کے بعد ہی رخصت ہوگی۔ موئے نے چھ برس کی تھی تب ہی شادی کر دی تھی۔ سنا ہے لڑکا موٹر سائیکل مانگتا ہے۔ کالج کا دھوبی ہے کھاتا پیتا آدمی ہے۔ داماد کو تمہارے پاپا نے رکھوا دیا ہے۔ میں نے کہہ دیا اگر موٹر سائیکل مانگی تو نوکری سے بھی گئی۔ مانگ کے تو دیکھے۔ ہاں سائیکل میں دلا دوں گی۔"

"سنا ہے رتی رام بہو کو مارتا ہے؟"

"کچھ ایسا ویسا مارتا ہے۔ حرام خور چھدا کی بہو بیٹے کو بھڑکاتی ہے۔ میں نے ساس اور بیٹے کو بلایا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔"

اتنے میں بابو دھوبی آگیا۔ بابو لمبا سجیلا سانولا سا نوجوان، نہایت صاف قمیص اور پتلون ڈالے بالکل کالج کا اسٹوڈنٹ لگتا تھا۔ سائیکل پر نئی دلہن کو بیٹھا کر سینما دیکھنے جاتا تھا۔ بڑھیا ساس جل جل کر مرنڈا ہوتی، بقول جلی بیٹیوں کے عبداللہ فیملی نے علی گڑھ کے نوکروں کے دماغ آسمان پر چڑھا دیے تھے۔ کالج کے نوکر تو ایسے اکڑتے تھے جیسے لاٹ صاحب کے بچے ہوں۔ بیگم عبداللہ نے تو جیسے علی گڑھ کے سارے نوکروں کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ذرا ڈانٹو مارو اُن کے پاس روتا جاتا ہے۔ اور وہ اسے یا تو کالج میں نوکری دے دیتی ہیں یا یونیورسٹی میں کھپا دیتی ہیں۔ صرف وہ نوکر جمے رہتے ہیں جو بزاز سے ڈسکاؤنٹ وصول کرتے ہیں، ترکاری والوں سے، سودے والوں سے کمیشن لیتے ہیں۔ آم کے موسم میں مفت آم، درزی سے مفت بچوں کے کپڑے سلواتے ہیں، ورنہ کوٹھی کے پھاٹک میں بھی داخل نہیں ہونے دیتے۔

موٹر میں شہر خریداری کے لیے جاتی ہیں تو ہر دکاندار سے ڈرائیور کا یارانہ پھر کیوں نہ وہ گالیاں کھالیں۔ سب جانتے ہیں نوکر چور ہوتے ہیں جو پکڑا نہ جائے وہ ساہوکار۔

"بی بی پتلون کے بٹن اور چاہئیں، محسن بھائی کے بٹن بہت ٹوٹتے ہیں۔"

اعلیٰ بی نے بٹنوں کا پتہ دے دیا۔

جب وہ چلا گیا تو بولیں۔

"بڑا چور ہے مگر پکڑنا مشکل ہے۔"

"کیا چراتا ہے؟"

"چادریں، تکیے کے غلاف، چراتا نہیں بس خود استعمال کرتا ہے۔ نئے کی جگہ پرانے پکڑا دیتا ہے لڑکیاں دیوانی خاک سمجھیں۔ جب پھر نئے سال نئے کپڑے لاتی ہیں، یہ پرانے دیدیتا ہے۔ نئے خود استعمال کرتا ہے مگر نامراد کو پکڑوں کیسے؟"

اور مجھے یاد آیا۔ گھر سے چھ چادریں لاتے ہیں واپسی میں بس چیتھڑے لے جاتے ہیں۔

"بڑا چالباز ہے، پکڑا نہیں جاتا۔"

"اے بیٹی کس کس کو پکڑو۔ یہ موئے ہوڑے (خانہ بدوش ہوکن) چوری پر ہی گذر بسر کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتے ہیں۔"

اور مجھے یاد آیا کہ جسیم بھائی باہر سوتے تھے۔ تھوڑی سردی میں باہر سونے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ننھے بھائی کی شادی کے بعد صحن کا ایک کونا ان کے لیے وقف ہو گیا تھا۔ لڑکے باہر سونے

لگے تھے۔ رات کو کوئی لما . . . ے کے بھاگا۔ جسیم بھائی پیچھے لپکے وہ کھیتوں میں غائب ہوگیا۔ واپس لوٹے تو توشک پادر اور تکیہ دوسرا لے کے چمپت۔ ہر کوٹھی میں پہرے دار موجود پھر بھی اچک ہی لے جاتے تھے۔

سی بے آبادات لوٹتے چھوڑ دیتے تھے اور ہمارے پھوپس کے بنگلہ میں کبھی چوری نہیں ہوئی۔

رتی رام اس کی ماں اور چھدا رام اس کا باپ حاضر ہوئے۔

معلوم ہوا کہ تازہ مارپیٹ کی اصل ذمہ دار بڑی بہن یعنی رشیدہ آپا تھیں۔ انھوں نے اپنا گلابی سوٹ شلوار کا جوڑا بہو کو دے دیا۔ وہ بہت شرمائی سر ہلایا مگر ضد کر کے اسے پہنا ہی دیا خود کمربند باندھنا سکھایا۔

ساس بھڑک اٹھی: "یہ پہراوا ہمارے کیاں نا چلے گو۔"

"کیوں نا چلے گو؟" اعلیٰ بی نے ڈانٹا۔

"برادری کے لوگ کھلی اڑائیں گے جی۔"

"اڑانے دو۔"

"نا بیگم صاحب یہ نا ہو سکے۔"

"مگر تو نے بہو کو مار کیوں لگوائی۔ ہم سے آکے کہا ہوتا۔"

"جے موری بھول بھئے گئی بیگم صاحب، تاؤ چڑھ آیو، اور پھر بتریوں سدی آئینہ میں مٹک رئی ہی چھنال۔"

"دیکھ بہو رتی کی دلہن شلوار بھی پہنے گی اور آئینہ میں بھی مٹکے گی۔ اور رتی رام نے ہاتھ بھی لگایا تو ہتھکڑیاں ڈلوا دوں گی۔ سمجھی۔"

"جے بھی کوئی زبردستی ہے بیگم صاحب۔" بہو بھنائی۔

"چپ رہ کھانگی" چھدا نے جوڑے ہاتھ کا ایک تھپڑ بہو کے جڑ دیا۔

"چھدا کے بچے تو نے پھر بہو پہ ہاتھ اٹھایا۔"

میں جب بھی اعلابی سے ملنے جاتی تھی انھیں نوکروں کے درمیان صلح صفائی کرتے پاتی۔ یہی نہیں پڑوس کے نوکروں کی بیویاں شکایت لے کے آتیں اور اعلابی اُن کے مالکوں کی مدد سے مقدموں کے فیصلے کرتیں۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں نوکروں کی پلٹنیں رہا کرتی تھیں۔ ہر کوٹھی میں شاگرد پیشہ ہوتا تھا۔ ہر کوٹھی کا مہتر دھوبی چوکیدار چپراسی بہشتی، ڈرائیور خانساماں اوپر کے کام کے چھوکروں کے لیے کوٹھریاں بنی تھیں جہاں ان کے خاندان رہتے تھے۔ مغلانیاں مامائیں، بچوں کی کھلائیاں اور ہر میاں اور بیگم کا پرائیویٹ اوپر کے کام کا چھوکرا۔ گھر کے اندر ہی اسباب کی کوٹھری یا نوکروں کے دالان میں رہتے تھے۔

اُن ہی دنوں میں ایک طوفان پھٹ پڑا لکھنؤ کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ایک کتاب "انگارے" چھاپ ڈالی۔

انگارے اور وہ بھی اردو یعنی مسلمانوں کی جاگیری زبان میں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا اور ایک ملّا شاہد احراروی اس کا نام تھا، گرلز کالج پر پل پڑا۔ اس نے ایک چیتھڑا سا اخبار نکالا اور عبداللہ فیملی کی دھجیاں اڑانے لگا۔ اس نے کہا گرلز کالج رنڈی خانہ ہے اسے فوراً بند کردیا جائے۔ اور رشیدہ آپا اور دوسرے لکھنے والوں کے گندے گندے کارٹون نکالے۔

میں نے وہ کتاب نہیں پڑھی تھی، لیکن احراروی نے دل میں اس کتاب کو پڑھنے کی لگن پیدا کردی۔ نہ جانے کہاں سے وہ کتاب بورڈنگ میں کسی ڈے اسکالر نے لادی اور راتوں رات لالٹین جلاکر، روشنی نہ دکھائی دے اس لیے شیشوں پر رضائیاں لٹکا کر ہم نے وہ کتاب پڑھی۔ اور جل گئے۔

مگر پڑھ کر تذبذب میں پڑ گئے۔ عریانیت اور گندگی بہت تلاش کی مگر پلے نہ پڑی۔ مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ "انگارے" گندی نہیں۔ یہ سخت بے حیائی کا ثبوت ہوتا کہ کوئی شریف لڑکی "انگارے" کو گندہ نہ کہے۔ سب میری طرف دیکھنے لگیں حالانکہ میری ہم خیال تھیں لیکن میری طرح بے لگام نہ تھیں۔ اب مجھے معلوم ہو چلا تھا کہ بہت سی باتیں جو یہ دل میں تو مانتی ہیں مگر خوف سے زبان تک نہیں لاپاتیں تو چاہتی ہیں میرے منہ سے سنیں "کتاب بے انتہا گندی ہے میرے تو ہاتھ سڑ گئے دل سڑ گیا دماغ سڑ گیا۔ چلو نماز کے کمرے میں توبہ کریں۔ اللہ سے معافی مانگیں۔ اللہ کو یہ کتاب بہت ناگوار گذری ہوگی۔"

"ایسی باتوں کا مذاق نہیں بنانا چاہیے۔"

"مذاق کون نامعقول بنا رہا ہے۔ شریف لوگ کہتے ہیں گندی ہے تو جھوٹ تو نہ بولتے ہوں گے۔"

"نان سنس" - جمیلہ حامد بولی۔ وہ اعلیٰ خاندان کی کانونٹ کی پڑھی لڑکی تھی بے حد منہ پھٹ، دھڑے بات کہہ دینے کی عادی۔ ظاہر ہے میری اس کی خوب ٹھنی تھی۔

"توبہ جمیلہ" لڑکیاں چلائیں۔

"تم نے "لیڈی چیٹرلیز لوَر" پڑھی ہے"

"لائبریری میں ہوگی یونیورسٹی میں!"

"ہرگز نہیں، وہ کتاب بین ہو چکی ہے"

"پھر تم نے کہاں پڑھی؟"

"میری ایک کلاس میٹ لوریٹو کانونٹ میں تھی اس نے دی تھی"

ہم سب جل کے خاک ہو گئے۔ دیسی اسکولوں کی پڑھی لڑکیاں کانونٹ کی لڑکیوں کے سامنے چت ہو جاتی ہیں۔ سعادت کتنی ذہین تھی یونی ورسٹی میں اوّل آئی تھی تھوڑے دن کانونٹ میں پڑھی تھی لیکن محمودہ عمر، جمیلہ حامد، عذرا حیدر کیا فنا فٹ انگریزی بولتی تھیں کہ ہم سب کی سٹی گم کر دیتی تھیں۔ جمیلہ حامد کی اردو ظاہر ہے کہ کمزور تھی جو ایک خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے۔ بس جمیلہ کا ایک علاج تھا کہ خوب سرپٹ فارسی ملی اردو بولو بڑھ جائے گی۔ بڑا اونچے مچان سے کہے گی۔

"نان سنس، بھئی ذرا ہولے ہولے بولو"

اور کافی لڑکیوں نے ڈرتے ڈرتے فیصلہ کیا کہ کتاب گندی سہی متاثر کرتی ہے اور سچائی سے لبریز ہے۔

میں نے جب تک ایسی گندی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں یہ مواد نہیں ملتا۔ مگر زبانی اس سے گندی باتیں پلنگ کے نیچے چھپ کر بڑی بوڑھیوں سے سنی تھیں۔ ہم جنس سے محبت، کچھ ہوتی ہے، کیا ہوتی ہے یہ بھید نہیں کھلا تھا۔ چند لڑکیوں کے بارے میں بعض لڑکیاں جلے اڑایا کرتی تھیں کہ کس طرح وہ ایک دوسرے کی دیوانی تھیں۔ اگر ایک کسی اور سے بات بھی کرے تو طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ مگر ان دوستیوں کو نظر انداز کر دینا اور ٹال جانا ہی سنجیدگی اور شرافت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

انگارے پڑھ کر ملّا احراری کا جیتھڑا پڑھا تو جی خوب جلا اور میں نے ایک مضمون لکھا۔ یہ اس قسم کا لہ۔ مسلمان لڑکیاں پہلے ہی محروم اور پچھڑی ہوئی ہیں اوپر سے کٹر ملّا احراری جو ان کا دشمن بنا ہے۔ کالج بند کر دیا جائے مگر ہم ساری لڑکیوں کی یہاں سے بس لاشیں ہی جائیں گی۔

کون بند کرنے آئے گا۔ ہم اس سے نپٹ لیں گے اور یونیورسٹی میں ہمارے چھ ہزار بھائی ہیں۔ کیا وہ خاموشی سے ہماری لاشوں کو کچلتا دیکھیں گے۔ جب بھی ہمیں ملّا احراری کا خیال آتا ہے ہم اپنے چھ ہزار بھائیوں بزرگ پروفیسروں، ٹیچروں کو یاد کر لیتے ہیں۔ تب ہماری ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک وہ سلامت ہیں کوئی مائی کا لال ہمارا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ جھانسی کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجی تھی۔ ہم کالج کی تمام لڑکیاں اپنے ہزاروں بھائیوں کی خدمت میں نیک خواہشات کے ساتھ احترام اور خلوص کی راکھی بھیجتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری رکھوالی کے لیے کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

میں نے مضمون جو طویل اور جذباتی تھا لڑکیوں کو سنایا۔ ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ پاپا میاں کو خبر پہنچی وہ آئے اور سنا اسی وقت لفافہ منگوا کر علی گڑھ گزٹ کو بھیج دیا۔ دوسرے دن مضمون چھپ گیا۔

لڑکوں نے وہ مضمون پڑھا اور اسی رات جاکر ملّا احراری کی خوب ٹھکائی کی۔ دفتر توڑ پھوڑ ڈالا کسی کو اس کی حمایت کی ہمت نہ پڑی۔ ان لڑکوں کی رشتہ دار لڑکیاں کالج میں پڑھتی تھیں ان کے ذریعہ لڑکیوں کا شکریہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد ملّا غائب ہوگیا۔

اپنی اس فتح پر بورڈنگ میں خوب جشن منایا گیا۔ خوب الٹے سیدھے گانے گائے اور ٹینس کورٹ پر خورشید عبداللہ نے ڈانس لیا۔ کالج سے شیروانیاں منگوا کر مشہور شاعروں کا بھیس بدل کر ان کا کلام پڑھا گیا۔ خورشید جہاں جو بھاری بھرکم اور گوری تھی جوش ملیح آبادی بنی۔ تارا جو خوب سانولی تھی چمکدار سفید دانت تھے داڑھی لگا کر جگر مرادآبادی بنی صفیہ سراج مجاز کی بہن تو اپنے بھائی کے کپڑے لے آئی وہ جب مجاز بنی تو سب کی چیخیں نکل گئیں۔ فاخرہ ساغر نظامی بنی۔ بےحد دلچسپ مشاعرہ رہا۔ خاتون آپانے دوسرے دن کی چھٹی کا اعلان کیا ٹینس کورٹ خاصا رقص گاہ بن گیا۔

ملّا احراری کا جنازہ سارے بورڈنگ میں گھمایا گیا۔ بیچ صحن میں چتا جلائی گئی جس کی آگ میں مونگ پھلیاں بھون بھون کر کھائی گئیں۔

مہینوں اس فتح کا نشہ سوار رہا۔ رشیدہ آپانے بے حد پیٹھ ٹھونکی۔ یہ ہماری اپنی جیت تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کالج کے لڑکے لڑکیوں نے ایک مقدس رشتہ قائم کیا۔ کالج کے لڑکے اس وقت پابندی سے سیاہ شیروانی پہنتے تھے۔ کبھی ہم کسی مشاعرے میں اسٹریچی ہال جاتے یا نمائش میں

لڑکوں کے غول لڑکیوں کے پیچھے لگتے تو الٹی لڑکیوں پر ڈانٹ پڑتی تھی۔ حالاں کہ کالی اچکن سفید پاجاموں کے رواں دواں غول سے زیادہ ہماری پہچان نہ تھی۔ لڑکیاں کالج کے لڑکوں کو "کوڑیالے" کہا کرتی تھیں۔ کوڑیالا سانپ بے حد خطرناک ہوتا ہے اس کا ڈسا لہرا نہیں لیتا۔ یہ نام کچھ رومینٹک بھی لگتا تھا۔ لڑکیوں کے دل میں چھپا خوف اور کچھ دھندلا سا رومان اس لفظ سے وابستہ تھا۔ ان دنوں کالے دبلے سوکھے لڑکے بھی دور سے بڑے بانکے لگتے تھے۔ جب پاس سے دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ ان میں زیادہ تر کالے کھترے اور بدصورت تھے۔

اب تو لڑکے کالج میں فنکشن پر آزادی سے آتے ہیں، سیل کے موقعوں پر لڑکیاں انکی خاطریں کرتیں ہیں قطعی کوڑیالے نہیں، اچھے بھلے انسان لگتے ہیں۔

پرانی لڑکیاں جواب پروفیسر، لکچرار اور ٹیچر بن گئی ہیں بڑی حسرت سے کہتی ہیں "ہمارے زمانے کے لڑکے ہینڈسم ہوا کرتے تھے۔ اب تو کوڑا آرہا ہے۔"

دراصل وہ پردہ جو درمیان میں حائل تھا۔ اپنے اندر نہ جانے کتنے خواب سموئے ہوئے تھے جو فنا ہو گئے۔ اب لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر بوکھلاتی نہیں۔ انھیں اپنے جیسا طالب علم سمجھتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں پردہ ہٹا تو رومان ختم ہو گیا۔ اب بھی عشق چلتے ہوں گے اور بیاہ بھی رچتے ہوں گے۔

اتنی بات تو ہے کہ پردہ ہٹتا ہے تو کچھ چھچھورے قسم کے جذبات جو صرف تصور کے بل پر پروان چڑھتے ہیں اور بڑی ذہنی الجھنوں کا باعث ہوتے ہیں کچھ بلکہ بہت کچھ سلجھ جاتے ہیں حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو جنس مخالف ہی نہیں عام انسان کی حیثیت سے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اندھے معاشقوں کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ زندگی نسبتاً پائیدار بنیادوں کے سہلے بنتی سنورتی ہے۔

ایف اے کے بعد بی اے کا علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا۔ میری بینک بک میں ابھی کافی روپیہ تھا۔ ابا میاں نے لکھنؤ آئی۔ٹی کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی جگنو کو حبیب ہاسپٹل بمبئی میں ابھی دو سال کام کرنا تھا۔ کیونکہ انھیں اسی شرط پر وظیفہ ملا تھا۔

لکھنؤ میں گذارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے۔ دماغ کو نئی راہیں ملیں۔ نئے دروازے کھلے۔

# سُوجت

شاید یہ لکھنا بھول گئی کہ ابّا میاں کا تبادلہ سوجت کا ہو گیا تھا اور ہم لوگ سانبھر کے بجائے پھلیرہ جنکشن پہ گاڑی بدل کر سوجت کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

سانبھر کے مقابلہ میں سوجت جنّت تھا۔ یہاں اچھی بارش ہوتی تھی، بہت سی باؤلیاں تھیں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ رتھ کے بجائے تانگہ تھا جو جوڈیشری کے آدھے درجن تانگوں میں سے تھا۔ علی گڑھ کے مریل گھوڑوں والے کھٹارہ تانگوں کے مقابلہ میں تو فٹن لگتا تھا۔ نہایت تازہ دم گھوڑا۔ اونٹوں کے علاوہ اور گھوڑے بھی تھے۔ کوچوان سانبھر میں اونٹوں سے بہت کبیدہ خاطر رہتے تھے اتنے گھوڑوں پر ہیڈ سائس بن کر بہت خوش تھے۔ نوکروں کے کوارٹر بہت صاف کھپریل کے تھے، مگر بنگلہ بہت خوبصورت تھا۔ کافی کمرے تھے۔ صحن ابّا میاں نے آکر بنوایا تھا باغیچہ آگے پیچھے چاروں طرف تھا۔ چھت پر جانے کا زینہ تھا مگر اوپر کوئی کمرہ نہیں تھا۔ لمبی چوڑی چھت کے دونوں سروں پر چھپر ڈال دیے تھے کہ برسات میں پلنگ گھسیٹ لیے جائیں۔

دودھ بے انتہا سستا تھا اور گھر پر بھینس لاکر دوہ جاتے تھے۔ مگر امّاں نے فوراً بھینس پال لی، کہتی تھیں بھینس نہ بندھی ہو تو گھر اجاڑ لگتا ہے۔ مرغیاں اور بکریاں بہت سی پل گئی تھیں، تین نئے کتے بھی بڑھ گئے تھے۔ ایک بہت خونخوار کتا۔ کوئی کنور صاحب شکار کھیلنے آئے تھے ابّا میاں اوّل نمبر کے شکاری خود تھے۔ ان سے بہت دوستی ہو گئی وہ اپنا ولایتی کتا دے گئے ابّا نے انھیں چاندی کا جاپانی ڈبہ دے دیا جس پر اژدہے لڑ رہے تھے، ہم سب کو بہت پسند تھا۔ بالکل ایسا لگتا تھا اژدہے زندہ ہیں اور ہل رہے ہیں۔ اور نامعقول کتا بے حد خونخوار تھا۔ صرف ابّا کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کے ان کی مونچھیں چاٹتا تھا۔ گھر میں اماں بغیر زنجیر کے نہیں لانے دیتی تھیں۔
یہاں پردہ بھی کم تھا۔ ہمیں دو چار بول آ گئے تھے اور تھوڑا کام چل جاتا تھا۔

یہاں مسلمانوں میں سلاوٹ رنگریز اور قصائی افراط سے تھے۔ مرد دھوتی کرتا اور طرح دار رنگوں کے صافے باندھتے تھے۔ عورتیں تنگ پاجامہ اور ان گنت کلیوں کا بہت نیچا کرتا پہنتی تھیں۔ پیروں، گلے، ہاتھ اور کانوں میں چاندی سونے کا ڈھیروں زیور۔

مسلمان ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں لگتا تھا۔ جن کے ڈاڑھیاں تھیں وہ چڑھاتے تھے۔ کچھ مسلمان بچی ڈاڑھی رکھتے تھے اور شرعی پاجامہ پہنتے تھے۔

اگروال اور اوسوالوں کی گھر والیاں بڑی سی ٹولی میں نکلتی تھیں، سب کے آگے ایک عورت یا باندی ڈیرہ لیجئے کھلے منہ۔ ایک نہایت لمبی چادر اوڑھے ہوتی تھی جو تنبو کی طرح باقی خواتین کے اوپر تنی ہوتی۔ آخر میں پھر ایک باندی جسے ڈاوری کہا جاتا تھا اس چادر کو پکڑے ہوتی تھی۔ گھاگھرے کا نچلا کامدار حصہ اور پنڈلیوں کا نچلا حصہ نظر آتا تھا جو سونے یا چاندی کے تنگ کڑوں سے بھرا ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے دن تو خواتین پانچ پانچ سیر سونا پہن کر نکلتی تھیں۔

ہم لوگ بھی وہاں ان کی دیکھا دیکھی ساڑھی پر چادر اوڑھ کر نکلنے لگے تھے۔ راستہ میں ان کے قافلہ کا ڈولا مل جاتا تو ہم اس کے اندر گھس کر ساتھ چلنے لگتے۔ زیادہ تر حسین اور نوجوان ہی اس انداز سے جاتی تھیں: بچیاں ساتھ کڈ کڑے لگاتی چلتیں۔

جوان عورتیں بڑے بڑے بور پہنتی تھیں جو تاج کی طرح بے حد خوبصورت لگتے تھے گھونگٹ بور کے اوپر اٹھا رہتا تھا۔ باریک ترین ململ جو چھیس کی ململ کہلاتی تھی اس کے ڈیڑھ پاٹ کے دوپٹے چرمی ڈبی کے گل بوٹے۔ چوڑا سا کنارا۔ اس سے چوڑا پلو اور بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا کوئی گز بھر کے سرکم فرینس کا چرمی ڈبی کے کام سے بھرا گول بوٹا۔ چرمی ڈبی اس بندنی کے کام کو کہتے ہیں جو عورتیں چھنگلی کے ناخون کو نوک دار اور لمبا کر کے کپڑے کی چار تہہ جماتی ہیں اور پھر اسے دانت سے پکڑ کر جلدی سے ڈورا باندھ دیتی ہیں۔ جب یہ بندھائی ہو جاتی ہے تو رنگائی شروع ہوتی ہے قیمتی اوڑھنیاں بار بار باندھی اور مختلف رنگوں میں رنگی جاتی ہیں۔ کھلنے کے بعد ایک ایک بوندیں کئی کئی رنگوں کی قوس قزح پھوٹتی ہے۔

ایک اوڑھنی ہوتی ہے۔ باریک ململ کو ایک طرف ہلکا فیروزی دوسری طرف ہلکا دھانی رنگا جاتا ہے۔ اسے سمندر لہر کہتے ہیں۔ میں نے بہت پوچھا کوئی نہ سمجھا سکا کہ یہ معجزہ کیسے ظہور میں آتا ہے۔

باریک ململ کے دوڑخ کس طرح دو رنگوں میں رنگے جاتے ہیں۔ یہ ایک معجزہ لگتا تھا۔ چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں اور سارا خاندان آچکا تھا یا آنے والا تھا۔ ابا نے سب کو لکھ دیا تھا جو آئے گا اسے دونوں طرف کا کرایہ، مناسب جیب خرچ اور دو دو سادہ جوڑے ایک عدد جوتا دیا جائے گا۔ آپا دلّی سے طب کا کورس ختم کر کے آگئی تھیں۔ باجی دوسرے دن آنے والی تھیں۔ چھوٹی آپا پورے دنوں سے تھیں لہٰذا مجبور تھیں۔ اسحاق بھائی ذکیہ وغیرہ کو لے کر آنے والے تھے۔ بڑے ماموں کے اور جگنو کے آنے کی بھی خبر گرم تھی۔

ہم لوگوں کو نتیجے کا انتظار تھا۔ اماں بڑی شاندار دعوت کی تیاری کر رہی تھیں۔ پی پاڑے گھی کے کنستر آگئے تھے۔ آٹھ آنہ فی بکری کے بچے کے حساب سے درجن بھر خرید لیے گئے تھے۔

اور تو اور سوجت میں بجلی تھی۔ ہم اس نیک بخت انگریز کو دعا دیتے تھے جو ہمارے آرام کے لیے اتنی سہولتیں پیدا کرتا تھا۔ پھر ایک دن ننھے بھائی کا تار آیا۔

میں چنّی سیکنڈ ڈویژن سے پاس۔

"لے ہے شنا کا نتیجہ نہیں لکھا" اماں چڑھ گئیں "بڑا چھچھورا ہے یہ ننّھے!"

"فرسٹ ڈویژن دیکھ کر جل گئے ہوں گے" شمیم بولے اور اسی وقت جوابی تار دیا گیا کہ شمیم کا نتیجہ فوراً بھیجو۔

تیسرے دن تار آیا "ہفتہ کو پہنچ رہا ہوں" نتیجہ کا کوئی ذکر نہیں۔

جی جل کے خاک ہوگیا۔ شمیم کی وجہ سے خوشی مناتے بھی بُرا لگتا ہے۔ وہ بےحد پریشان۔ اماں کہہ کہہ کر کھانا کھلائیں۔

"ارے بس پرسوں آ رہا ہے ننّھے۔ نتیجہ کہاں تک چھپے گا۔"

ننّھے بھائی آئے تو چاروں طرف سے لعنتیں برسنے لگیں۔ وہ حسبِ عادت، ڈھٹائی سے مسکراتے رہے۔

"جوابی تار ہضم کر گئے۔"

"کہاں ہضم کیا؟ آنے کی خبر بھیج تو دی۔"

"اے ہے تمہارے آنے کی خبر کو بڑی جان جا رہی تھی۔ کوئی نتیجہ کیوں نہ لکھ دیا ساتھ میں۔"

"اتنے لفظوں کی گنجائش کہاں تھی۔"

"تو دو لفظ کے پیسے گانٹھ سے نہ نکلے"
"مگر شمیم کا نتیجہ تو سب کو معلوم ہی تھا، خود شمیم کو بھی معلوم تھا کہ فیل ہوجائیں گے۔"
"اے ہے خدا نہ کرے"
"اس میں خدا بے چارے کا کیا قصور ہے"
"اے کیا سچ فیل ہو گیا؟" اماں نے بڑی حسرت سے پوچھا۔
"فیل نہ ہوتا، دن رات ہُو حق۔ ناچ گانے، جاورے کے نواب زادوں کی مصاحبت! آگرے میں مجرے"
"بیکار جھوٹ بول رہے ہیں" شمیم منمنائے۔
"خیر ہم اور چنی تو پاس ہو گئے"
"اے غارت ہو اس کم بخت کا پاس ہونا کس کام کا۔ بلا سے یہ فیل ہوجاتی۔ شمیم پاس ہو جاتا"
"ارے واہ، کیوں؟" میں لڑ پڑی۔
"اُنہہ لڑکی ذات کو کون سی ڈگریاں لینی ہیں۔ مرد ذات کی تو زندگی خراب ہو گئی"
دعوت ملتوی ہو گئی۔ کسی نے بھی زور نہیں دیا۔ دل واقعی شمیم کے فیل ہوجانے سے بیٹھ گیا۔ اسے خاموش اداس دیکھ کر ساری خوشی اپنی کامیابی کی خاک میں مل گئی۔
ماموں، اسحاق بھائی مع چند بچوں کے۔ اس وقت ان کے سات بچے تھے۔ شاید تین کو لائے تھے منظر بھائی ان کی بیوی اور ایک بچی۔
گھر لبریز ہو گیا۔ کیا ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ پھر باجی بھی آگئیں۔ ان کے ساتھ عظیم بھائی کی جو بچی گودی تھی مدحت بھی تھی۔ نہایت تیز طرار تندرست۔ آتے ہی نہ جانے کیوں بڑی بن نزہت کو کھسوٹ ڈالا۔
میں نے دو دھموکے لگائے چڑیل کے۔
کیا لمبا دسترخوان لگتا تھا۔ ایک نے بجائے ہرنئے وارد ہونے والے کے نام سے دعوت ہوتی۔ ماموں کے تیسرے دن بمبئی سے جگنو بھی آ گئے۔ ماموں انھیں خط لکھ کر آئے تھے۔
میں اور جگنو بڑی ہوشیاری سے دور دور رہنے کی کوشش کرتے جو اس بھیڑ میں مشکل نہ تھا۔ بس ایک دفعہ نہ جانے کیسے سامنا ہو گیا۔

"پاس ہوگئیں"۔ جگنو ہنستے ہیں تو ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بالکل گم ہوجاتی ہیں۔
"ہاں" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ایف۔ اے میں داخلے کے فارم بھر دیے تھے پاس ہونے کی شرط تھی وہ پوری ہوگئی۔
"ہوں" وہ بے تکے پن سے زور سے ہنسے۔
اس کے بعد میں ادھر اُدھر چکر کاٹتی رہتی۔ جب دیکھتی جگنو بیٹھ گئے تو ان سے کافی فاصلہ رکھ کر میں لوگوں کے بیچ میں گھس کر بیٹھ جاتی۔ دو ایک بار انھوں نے میری طرف دیکھا بھی قطعی رومینٹک انداز میں نہیں بالکل سادگی سے مگر ہنسی روکتے ہوئے۔ جیسے وہ راز جو صرف میں اور وہ جانتے تھے انھیں مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔
ویسے مجھے کسی نے رومینٹک انداز میں دیکھا بھی نہیں تھا جیسا قصہ کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے تو پھر میں پہچانتی بھی کیسے؟
شمیم ایک دم بالکل نارمل ہوگئے۔ اور خود اپنے فیل ہونے کا مذاق اڑاتے۔
"اصل میں کئی سوال تو ایسے بچوں جیسے تھے کہ میں فوراً تاڑ گیا پنڈا اکزامنر مجھے الو بنا رہا ہے۔ ارے پانچ برس کا بچہ بھی جانتا ہے۔ میں نے لکھ دیا میاں کسی اور کو احمق بنایئے آپ اس سوال کا جواب اچھی طرح جانتے ہیں اور بھولے بن کے ہم سے پوچھ رہے ہیں"۔
"کیا سچ مچ تم نے یہی لکھ دیا؟"
"اور کیا جھوٹ موٹ! اور ایک سوال ایسے گدھے پن کا تھا، بھتنی کیا تھا سوال وہ"۔
وہ اب میرا نام مستقل "بھتنی" رکھ چکے تھے۔ میں بھی چڑھنے کی حد سے گذر چکی تھی بے خیالی میں یاد ہی نہ رہتا تھا کہ یہ میری بڑی بھیانک چڑھ تھی، جب کوئی "بھتنی" کہتا تھا تو میں اس کا منہ کپڑے کھسوٹ ڈالتی تھی۔ اب سوائے شمیم کے کوئی مجھے "بھتنی" یا "بھوت" نہیں کہتا تھا۔
"کون سوال؟"
"ہے بھوت سوال بھی یاد نہیں۔ تم نہایت گھپلے میں پاس ہوگئی ہو، پھر سے امتحان دو"۔
"مگر تم فیل ہوگئے"۔
"ہم تمھاری طرح گھپلے میں پاس ہونے کے بجائے شرافت اور ایمان داری سے فیل ہونا بہتر سمجھتے ہیں"۔
ایک دن بولے "ابا میاں چنی کو ایف اے میں اس سال نہ بھیجیے"۔

"کیوں" ؟

"اگلے سال جب ہم بھی پاس ہوجائیں گے تو ایک کلاس میں کتابوں کی بچت ہوگی"

"بات معقول ہے مگر یہ لڑکیوں کے اسکول میں اور تم لڑکوں کے بورڈنگ میں"

"کتابیں یہی رکھ لے میں دوستوں سے مانگ لیا کروں گا" شمیم بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے، مگر سب جانتے تھے مذاق بنا رہے ہیں، کیوں کہ وہ ایسی معصوم صورت بنا کر کہتے تھے کہ بجائے غصہ آنے کے ہنسی آجاتی تھی پھر بھی ابا کچھ سنجیدہ ہو گئے۔

"نالائق، ہمارا کتنا روپیہ خراب کرا چکا ہے"

"واہ ابیاں اولاد کے لیے اتنی بھی کنجوسی کیا" شمیم نے ایسی مسکین آواز میں کہا کہ سب ہنسنے لگے اور ابا میاں بھی سنجیدہ نہ رہ سکے۔

"بیگم آخر یہ نالائق کیا کرے گا"

"ارے ابیاں" وہ ابا میاں کو جلدی میں ابیاں کہا کرتے تھے "ہمیں بڑے سے بڑا عہدہ دلوا دیجیے دیکھیے پھر ہم کیسے ٹھاٹ جماتے ہیں۔ قسم سے گورنر ہی بنوا دیجیے۔ سارے خاندان کو ٹھاٹ کرا دیں گے"

"آپ اور گورنر!" ہر طرف سے قہقہے پڑنے لگے۔

"اس میں دانت نکوسنے کی کیا بات ہے۔ ارے گورنر کو کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔ بس ڈنر پارٹیاں اڑانا، جلسوں کی ان ویلنگ کرنا۔ اور موٹر میں گھومنا۔ قسم خدا کی ہم بے حد اچھے ڈنر کھا سکتے ہیں اور پارٹیوں کی تو نہ پوچھو۔" "بھوت ہم گورنر ہو گئے تو تمہیں اسکول کی ہیڈ ماسٹرنی فٹ بنوا دیں گے۔ اور یہ جُنبدھا سلوتری بیکار میڈیسن میں سر مار رہا ہے۔ جگنو تم فکر نہ کرو ہم گورنر بنتے ہی تمہیں اپنے گھوڑوں کا چیف سلوتری بنوا دیں گے۔ ٹھاٹ کرو گے یار" پھر ماموں کی طرف مڑے "مگر ہمارے لیے کوئی کچھ کرے جب نا۔ ماموں کا اتنا رسوخ ہے اپنے پاجی بیٹے کو ڈاکٹر بنوا رہے ہیں اور اپنی پیاری سگی بہن کے پیارے سگے بیٹے کو کوئی سپہ سالار یا جاگیردار، تعلقدار بھی نہیں بنوا دیتے۔ کیسا خون سفید ہو گیا ہے۔ لو وہ ظفر حسین جی سن ہی نہیں رہے ہیں ہماری بات۔ یہی تو مصیبت ہے"

"جی مہاراج کیا حکم ہے" ماموں نے نہایت ادب سے کہا۔

"یا ہمیں گورنر بنوایئے یا پھر مہاراجہ سے کہیے ہمیں گود لے لیں اور راج کنور کھچو کو عاق کر دیں۔ کیا اناڑی کی طرح پولو کھیلتا ہے"

"ہوں بات تو آپ نے بڑی کام کی بتائی۔ مگر مائی باپ تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ آپا کھانا نکال رہی ہیں اور پسندہ کی خوشبو کچھ زیادہ ہی بے ڈھب ہے۔ بس دو لقمے کھا کے تمہیں گورنر بنائے دیتے ہیں۔"

"کہاں چلے، کیا جا رہے ہو ماموں؟" باجی جو نہ جانے دلہن بھابی سے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں چونک کر بولیں۔

"ہاں۔ ذرا شنّا میاں کو ولی عہد بنوانا ہے۔ آپا، جلدی کرو بیٹے کے مستقبل کا سوال ہے۔"

"اے تو نکال تو رہی ہوں۔ دسترخوان تو بچھاؤ۔" سب کھسکنے لگے اور بیچ میں بہت سے ہاتھ دسترخوان بچھانے لگے۔

"ارے شنّا میاں؟" ماموں بولے۔

"جی ماموں۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتے جودھپور چلے چلو، کرایہ ہمارے ذمہ۔"

"ہم چلے جائیں گے۔ بلکہ ماموں سمجھو ہم پہنچ گئے، پھر؟"

"پھر ہم تمہارے لیے کوئی نوکری ڈھونڈیں گے۔"

"نوکری!" شمیم چیخ پڑے۔

"ہاں، یہ تمہارے ابا میاں تھیا بخش کیا نوکری نہیں کرتے؟"

"کیوں نہیں کرتے، ساری عمر نوکری ہی کی ہے بے چارے نے!"

"تو پھر تمہیں کیوں اعتراض ہے، بولو! تم ان سے اونچے ہو کیا؟"

"قد میں تو اونچے ہیں اور سر قد سے اونچا ہوتا ہے۔ اور عقل سر میں ہوتی ہے اس لیے عقل میں بھی اونچا ہونا پڑ رہا ہے۔"

"تو تم عقل میں بھی ان سے کم نہیں بلکہ اونچے نکلتے ہو؟"

"یہ تو گستاخی مگر عقل اللہ کی دین ہے اور اللہ میاں کو دھانسنا گناہ ہوگا۔ مگر ذرا آہستہ" ابا میاں غور سے سن رہے تھے۔

"کیوں؟"

"اب بڑھاپے میں ایسی دل شکنی کی باتوں سے طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ ابا میاں کا دل

ٹوٹ جائے گا۔"

ماموں سے اب زیادہ ضبط نہ ہوسکا شمیم کی سنجیدہ ایکٹنگ پر ہنس پڑے مگر پھر جلدی سے بولے "تو پھر طے ہے۔"

"جی بالکل نشچنت رہیے گروجی۔ مگر یہ تو پتہ چلے کہ کون سا عہدہ مناسب رہے گا میرے لیے۔"

"وہی چپراسی کا۔"

"شمیم تھوڑی دیر انھیں غور سے دیکھتے رہے پھر جلدی سے ایک رکابی اٹھا کر ان کے سر پر پنکھا کرنے لگے۔"

"ماموں آپ لیٹ جایئے۔" ماموں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ہاتھ سے رکابی لے لی اور بے طرح ہنسے۔

"ہائے میرے جان سے پیارے ماموں"۔ شمیم نے بڑے زور سے بین کے انداز میں ہانک لگائی۔

"ہے ہے کیا ہوا" اماں بوکھلا گئیں اور چمچہ کا کوفتہ اچھل کر دور گرا۔ شیرا نے لپک کر دانت مارے اور منہ جل گیا تو ییں ییں کرتا بھاگا۔ تھوڑی دور جا کر زور زور سے کوفتہ کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ اتنا کٹھنا لقمہ اس نے کبھی نہ چکھا تھا۔

"ہمیں چپراسی بنوایا تو سارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی ہماری گانٹھ سے کچھ نہیں جائے گا۔ خود ہی سر پکڑ کے روؤ گے۔ لو وہ رکابی ہی مارے گئے۔ ارے مہاراج رکابی تو ہمیں دے دو۔"

ماموں بے تحاشہ ہنس رہے تھے اور اماں کے سامنے رکابی پھیلائے کہہ رہے تھے۔

"اپا بیٹے کو اونچے عہدے پر پہنچانا چاہتی ہو تو دو کوفتے دو۔"

"دو کے بدلے چار لے، تیرا کھایا بھنیا کے پیٹ پچے گا۔"

اماں اپنے دونوں بھائیوں کو کتنا چاہتی تھیں۔

بڑے ماموں کے دونوں بیٹوں میں کتنا فرق تھا۔ بڑے بھائی مظہر ہمیشہ باپ کے ساتھ رہے۔ ماموں عجیب مزاج کے تھے۔ ان کی دوستی بڑے بڑے عہدے داروں سے بھی تھی مگر یارانہ سلاوٹوں، رنگریزوں اور قصائیوں سے تھا۔ ان کی صحبت میں جہاں ایک طرف ملک کے

مشہور کلا کاروں سے دربار میں واسطہ پڑتا تھا۔ دوسری طرف کنجڑیوں، نٹنیوں، سپیروں کے بھی رنگ جما کرتے تھے۔ ریاست میں رنڈیوں کا کوئی مخصوص کوچہ نہیں تھا۔ عموماً بال ودھوا جب جوان ہو جاتی تھیں تو کسی عہدے دار یا جاگیردار سے تعلق ہو جاتا تھا۔ جس پر ان کے عہدوں اور دولت کی وجہ سے کوئی انگشت نمائی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اور پھر یہ برسوں کا اصول چلا آرہا تھا۔ ستی کی رسم ختم ہونے کے بعد بیوہ کی شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا۔

عموماً بامنیاں بے حد حسین ہوتی تھیں۔ سب ایک چھاپ کے چالیس گز کے گھاگرے نہایت مختصر سی مختلف رنگوں کی چولیاں جن میں سے آدھا جسم دکھائی دیتا تھا اور باریک ململ کے سیاہ دوپٹے اوڑھتی تھیں۔ گھونگھٹ کا کونہ دانتوں میں دبائے جب پانی بھرنے تالاب پر جاتی تھیں تو لوگ بے نتھے بیلوں کی طرح بھکنے لگتے تھے۔ دوپٹہ ڈیڑھ عرض کا ہوتا تھا اور پیچھے ایڑیوں تک نکلتا تھا لیکن آگے کا کوئی پردہ نہ تھا۔ پتلی کمریں، ناف کی پیچ دار بھونری، نازک نازک دھول میں اٹے پیر اور کالے دوپٹے میں سے چمکتا چاند سا مکھڑا۔ سر پر تین چار گاگریں دھرے غول کی صورت میں نکلتی تھیں تو سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ کبھی کسی کو بول پھینکنے کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ سب جانتے تھے کہ وہ بڑے بارسوخ افسروں کے سایہ عاطفت میں رہتی ہیں۔

ان کے بچے راج گوے کہلاتے تھے۔ محل کی ڈاکٹرنیاں جناتی تھیں اور بچہ وہیں پلتا تھا۔ ناجائز بچوں کو مارنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ لڑکی کے ساس سسر یا والدین لڑکی کو کچھ کہتے تھے: بچہ جس کا جی چاہے محل میں پہنچا دے، کچھ انعام ہی ملتا تھا۔ پولیس وغیرہ کا کوئی جھگڑا نہیں اٹھتا تھا۔ ان بچوں کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی تھی۔ ان کے الگ اسکول تھے اور ملٹری کی ٹریننگ کے بعد راجہ گولا پلٹن میں بھرتی ہو جاتے تھے۔

یہ پلٹن عموماً مہاراج کی سال گرہ یا کسی شادی کے موقع پر نکلتی تھی اور اس میں ایک ایک جوان مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ انگریز اسٹاف ان کی ٹریننگ پر مقرر تھا۔ راج گوے کے معنی ہیں مہاراجہ کے بیٹے یا متبنّیٰ (بے پالک)۔

اس قسم کی لڑکیاں بھی محل میں بڑے لاڈ سے پالی جاتی تھیں اور مہارانی کی ڈاوڑیاں کہلاتی تھیں، کہنے والے کہتے تھے، ان کی آپس میں نہ شادی ہو سکتی ہے نہ تعلق کیوں کہ کون جانے شاید آپس میں ان کا بھائی کا رشتہ ہو۔ راج گولوں اور ڈاوڑیوں کی شادی کا کبھی کوئی قصہ نہیں سُنا۔ ویسے عموماً بیوہ لڑکیاں اغوا بھی ہوتی تھیں، کسی کے ساتھ بھاگ بھی جاتی تھیں، سنا تھا کراچی

میں ان کی بڑی مارکیٹ تھی۔ وہاں کے وڈیرے جوان تندرست لڑکیاں بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ اور وہاں سے وہ مرکر ہی نکلتی تھیں۔

جودھپور کا شاہی شمشان بہت شاندار تھا۔ اونچا پھاٹک جس کے قریب کی دیوار پہ ہزاروں ہاتھوں کے چھاپے تھے۔ اکثر بہت چھوٹے نشان بھی دیکھے جو چار پانچ برس کی بچیوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ بہت دھندلے پڑ چکے ہیں۔ جب راجہ پھونکے جاتے تھے تو رانیوں کے ساتھ ڈاوڑیاں بھی پھونکی جاتی تھیں اور اندر داخل ہونے سے پہلے لال رنگ میں ہاتھ ڈبو کر دیوار پہ چھاپ چھوڑ جاتی تھیں۔

مظہر بھائی جودھپور کی آزاد اور رنگین فضا میں پلے تھے۔ خوب موٹے اور سرخ چقندر تھے۔ بے حد نازک نقشہ تھا۔ بڑی بڑی رومینٹک آنکھیں، ننھا سا دہانہ، موتی جیسے دانت۔ لیکن بیحد زہر لگتے تھے۔ شادی سے پہلے بھی اکیلے میں دبوچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ننھی ننھی بچیوں تک کو ٹٹولتے تھے ان سے سب لڑکیوں کی روح فنا ہوتی تھی۔ شادی کے بعد انھوں نے ٹھنڈی سانسیں بھرنا میٹھی میٹھی نظروں سے تکنا، اور ہولے سے ہاتھ دبانا نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی بیوی ان کی اس عادت سے نہایت غصہ ہوا کرتی تھیں۔ بے حد روزہ نماز کی پابند اور گھنٹوں وظیفہ پڑھتی تھیں۔ بے حد نازک اور حسین تھیں۔ بڑے ماموں کی سالی تھیں۔ بڑی بہن سے دو برس چھوٹی تھیں۔ یعنی بڑی ممانی کافی کمسن تھیں۔ بے حد خوبصورت ہوتیں اگر ان کے چہرے پر ہردم انجانی سی وحشت اور خوف نہ طاری رہتا۔ دونوں کے گز گز بھر لمبے بال تھے۔ مگر دونوں کچھ کبیدہ خاطر سی رہتی تھیں اور صبح گھنٹوں قرآن کی تلاوت کیا کرتیں۔ بچے حلق پھاڑ پھاڑ کر روتے رہتے اور ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔

جگنو صورت شکل میں بالکل بڑے بھائی کی الٹ تھے۔ دبلے لمبے اور بھدّے نقشے کے چھوٹی آنکھیں، بڑے موٹے ہونٹوں کا دہانا اور نیگرو جیسے مہین گھونگروالے بال۔ مزاج میں بھی قطعی مختلف لڑکیوں میں قطعی رومینٹک دلچسپی نہیں لیتے۔ جیسے لڑکیاں مظہر بھائی سے کتراتیں وہ لڑکیوں سے کنّی کاٹتے اور عموماً نہایت محفوظ لڑکیوں کے بیچ میں جم جاتے۔

قریب دو ہفتہ ہنگامہ رہا۔ بنگلے سے ملحقہ کچہری تھی یعنی بہت بڑا سا مردانہ ڈرائنگ روم کورٹ روم بنا دیا گیا۔ باقاعدہ کٹہرے لگا کر ملزم کے لیے باقی حصہ میں دری بچھی ہوئی تھی اور ڈائس پر جج کی کافی شاندار سی کرسی تھی۔ توشہ خانہ میں درجنوں نواڑی پلنگ موجود ہی تھے مع دری اور تکیوں چادروں کے کیوں کہ گارڈ کے آنے پر اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ صحن میں بڑے اہتمام سے چارپائیاں

اور بستر بچھ گئے۔ الگ الگ خاندان کے گروہ سے بنا دیے گئے۔ پھر جس کا جی چاہا ادھر چارپائی گھسیٹ لے گیا۔ کچھ لوگ چوکے پر جم گئے۔ جو باقی بچے وہ باہر کے احاطے میں چلے گئے۔ امّاں اور ابّا چھت پر سوتے تھے۔ بہوئیں سخت خفا تھیں کہ بڈھے میاں بیوی کیا مزے سے خلوت میں سو رہے ہیں۔ باقی پلٹن کو میدان میں ڈال دیا ہے۔ خصوصاً مظہر بھائی کی دلہن بڑی پریشان تھیں کہ مظہر بھائی ناغہ کے عادی نہ تھے۔

رات کا کھانا کھا کر ہم لوگ کورٹ روم میں چلے جاتے وہاں بجلی کے پنکھے لگے تھے اور ریگستان میں راتیں تو کافی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

شمیم اپنے فیل ہونے کا غم بالکل بھول گئے تھے اور کورٹ روم میں جج کی کرسی پر ایک تولیہ سر پر ڈال کر بیٹھ جاتے اور سب پر مقدمے چلانے لگتے۔

"آرڈر، آرڈر، آرڈر"۔ وہ موگری میز پر مار کر چیختے۔ "ورنہ سب کو اسی وقت سزائے حبس دوام عرف کالا پانی کی سزا ہو جائے گی"۔ "مجرم نمبر ایک۔ بڑے ماموں عرف ظفر حسین عثمانی کو مابدولت کی خوشنودی کا مژدہ سنایا جائے کیوں کہ انھوں نے ہمیں مہاراج کے منہ بیٹے فرزند بنانے کا پکّا وعدہ کیا ہے۔ اگر مہاراج اس خوش نصیبی پر انکار کرنے پر تل گئے تو کوئی اور آرام دہ عہدہ ہمارے لیے طے سمجھا جائے۔ ہم اس جاں نثاری کے سلسلہ میں چھتر پیلس جو زیر تعمیر ہے اس نیک نہاد ماموں کو بخشتے ہیں۔ کیوں کہ مہاراج کی گود میں بیٹھ کر ہم پوری حکومت جودھپور کو اپنی مٹھی میں لے لیں گے۔

"کھما کھنشرین مہاراج کے لیے پالک!" ماموں نے ہاتھ جوڑ کر ادب سے کر دیے۔

"مگر ان کے نالائق اور کپوت جگنو عرف اطہر حسین عثمانی سے مابدولت بہت ناراض ہیں۔ یہ گھوڑوں کا ڈاکٹر کہتا ہے بدہضمی زیادہ کھانا ٹھونسنے سے ہوتی ہے۔ یہ نالائق اتنا نہیں جانتا کہ ہم کم کھائیں گے تو ہماری ماں جس کے پیروں کے نیچے جنت ہے کتنی دکھی ہوگی۔ وہ ایک پتی ورتا ماں ہے اس کے دکھ سے پتی یعنی ہمارے پوجیہ پتا کو بھی دکھ ہوگا۔ ہم اپنے ماتا پتا کا دل توڑنے سے پہلے ہیضہ سے مر جانا پسند فرمائیں گے۔ باجی ہمیں گھونسا دکھا رہا ہے! سپاہیوں اس کا فوراً سر تن سے جدا کر دو اور ۔۔۔۔"

بلّنو پھینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ سب انھیں روک رہے تھے۔

اسے پکڑ لو سپاہی۔ ورنہ ہم اسے کورٹ کی بے عزتی کے جرم میں ۔۔۔ اچھا جانے دے بھئی

تو سزا نہیں لیتا تو چولہے میں جا۔ مگر ہم منے بھائی کو نہیں چھوڑیں گے۔ منے بھائی عرف عظیم بیگ چغتائی عرف مشہور مزاح نگار پیشہ وکالت اور بچہ بازی۔ اس کی بیوی عرف دلہن بھابی ہر دو سال بعد بچہ داغ دیتی ہے۔ خیر ہم صرف ایک شرط پر معاف فرما سکتے ہیں کہ یہ علیگڑھ یونی ورسٹی پر مقدمہ دائر کریں کہ ہمارے ساتھ جو بے ایمانی کی گئی ہے، یعنی ہماری فرسٹ پوزیشن مار کر ہمیں فیل کر دیا گیا ہے اس کا ازالہ کرے اور ہم سے معافی مانگے۔"

کیا زمانہ تھا بات بے بات ہنسی آتی تھی اور جس انداز سے شمیم ابا کی نقل کر رہا تھا ہم لگ ہنسی کے مارے بے دم ہوتے جا رہے تھے۔

"اور مجرمہ چُنی عرف عصمت خانم چغتائی جس میں سے لفظ خانم اس نے ڈکار لیا ہے۔ نہایت ناخلف گستاخ اور بے شرم ہے کہ بڑے بھائی کے نمبر اپنے نمبروں میں جوڑ کر خود پاس ہو گئی اور ماہ دولت پر فیل ہونے کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ پرانے قرضوں کا تقاضہ بند کرکے ماہ دولت کو فی الفور دس روپیہ ادھار دے۔ انشاء اللہ ہم قیامت کے روز ایک کے ستر ہزار ادا کر دیں گے۔ بدنصیب کیسی کوتاہ اندیش ہے۔ ذرا بھی عاقبت کی فکر نہیں، بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے" شمیم مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہوں گے "ہم اس کے بزرگ ہیں اور جلد ہی کانا کھترا عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا تلاش کرکے اس کے ہاتھ پیلے کرکے مردار کا منہ کالا کر دیں گے۔"

میں نے جوتی پھینک کر ماری جو ٹھیک ان کی چھاتی میں لگی۔

"گستاخ سیدھی جہنم میں جائے گی۔ ہاں اور یہ مجرم۔۔۔" انھوں نے انگلی اٹھائی اور سناٹے میں رہ گئے۔ سامنے ابا میاں کھڑے تھے۔ ان کی ہنسی ہمیشہ مونچھوں میں غائب ہو جاتی تھی لیکن آنکھیں قہقہہ لگاتی تھیں۔

"باپ رے" شمیم نے جلدی سے تولیہ اتاری اور بڑی مری ہوئی آواز میں بولے۔

"حکم دیا جاتا ہے کہ ماہ دولت کی چونکہ۔۔۔ گھگی بندھ چکی ہے لہٰذا کچہری برخاست۔" اور شمیم غڑاپ سے پچھلے دروازے سے غائب ہو گئے۔

"اس پاجی کا کیا مستقبل ہوگا؟" ابا فکر مند مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ محفل جو قہقہہ زار بنی ہوئی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "اس کھلنڈرے ڈھونچی کا کیا بنے گا۔"

"سرکار فکر نہ کیجئے اس سال میرے پاس جودھپور بھیج دیجئے۔ میں سور کو بیل ڈالوں گا ضرور پاس ہو جائے گا۔" عظیم بھائی بولے۔

"یہ پاس ہونے والا آسامی نہیں۔" بڑے ماموں بولے۔ "میں اسے کسی محکمہ میں لگا دوں گا۔"

ماموں خود پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن ان کے چچا، دادا کالے میاں فوج میں رسالدار ہو گئے تھے۔ جودھپور کی شہریت ملی ہوئی تھی۔ بڑا رسوخ تھا۔ ہم سب مارواڑی باشندے بن چکے تھے۔ مہاراج امید سنگھ جی ہر ماہ بڑے ماموں کو دربار میں درشن دیتے تھے۔ یہ بھی خبر تھی کہ انھیں بھی پیر میں سونے کا کڑا ملنے والا ہے۔ ریاست میں جن خاندانوں کو سونے کا کڑا مل جاتا تھا ان کی عورتیں پیر میں سونا پہن سکتی تھیں ورنہ پیر میں سونا پہننا سخت جُرم تھا۔ عظیم بھائی کو وکالت کی اجازت، وسیم بھائی کو محکمہ خاص میں نوکری، مظہر بھائی کو بھی پولیس میں نوکری اور اسحاق بھائی کو تھانہ داری دلوا چکے تھے۔ ماموں کا بڑا رسوخ تھا۔ ہاں چھوٹے ماموں کو بھی ایکسائز انسپکٹر بنوا دیا تھا اور جگنو کو وظیفہ دلوا دیا تھا ڈاکٹری پڑھوانے کے لیے۔

جودھپور میں کبھی ہندو مسلم سوال نہیں اٹھا۔ مسلمان ہمیشہ معتبر عہدوں پر فائز رہے۔ فوج میں پولیس میں بہت کھپے تھے۔ جودھپور کے مسلمان بڑے صلح پسند میاں بھائی کہلاتے تھے۔ کوئی خاص محلہ مسلمانوں کا نہیں تھا۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید، محرّم پر جھگڑا تو دور کی بات، برابر حصّہ لیتے تھے۔ دیوالی پر امّاں دیا ضرور جلواتی تھیں۔ انھیں پکّا یقین تھا کہ لکشمی دیوی کا ان پر سایہ ہے، انھیں کے چرنوں کے صدقے گھر میں دن بدن خوش حالی بڑھ رہی ہے۔ پنشن کے بعد آگرہ اور علی گڑھ میں کافی درگت بن گئی تھی اور اب پنشن کے علاوہ جج کی تنخواہ نے پھر ہاتھ کھول دیے تھے۔ سانبھر میں تو نمک کی جھیل اور ریت کی وجہ سے ہریالی نام کو نہیں تھی سوجت کافی سرسبز تھا۔

نہ جانے کب برقع غائب ہو گیا۔ باہر نکلتے وقت ہندو عورتوں کے رواج کے مطابق سب شریف گھرانوں کی بیویاں چادر اوڑھتی تھیں۔ سلاوٹ رنگریز چھیپے میں پردہ نہیں تھا۔ عورتیں گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ کچھ کرتے تنگ پاجامے پر باہر نکلتے وقت پشواز پہن لیتی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں گھونگھٹ نہیں نکالتی تھیں۔ سینے پر دوپٹہ ڈالنے میں ہاتھ بندھ جاتے ہیں لہٰذا گھونگٹ کے باوجود دوپٹہ سر پر ڈال کر پیٹھ پر لٹکتا رہتا تھا۔ زمین پر نہ رلے اس لیے ایک کونا نیفے میں اڑسا رہتا تھا۔ لہنگا چولی کے ساتھ بھی دوپٹہ پیچھے ہی پڑا رہتا تھا۔ مارواڑی خواتین کا لباس نہایت بھڑک دار رنگ کا ہوتا تھا۔ مہینوں رنگ کھلا رہتا تھا۔ ایک جوڑا جب تک تار تار نہ ہو جاتا بدلا نہیں جاتا تھا۔ عورتیں تال پر بالر کپڑے اتار کر دھوتیں اور ریت پر پھیلا دیتیں۔ مرد گزرتے تو پیٹھ کر بھی نہ دیکھتے نہ عورتوں کو رتی بھر

پردہ ہوتی عورت کا جسم کوئی عجوبہ نہیں تھا مرد کے لیے۔ سات آٹھ سال کے لڑکے لڑکیاں تب تک ننگے پھرتے۔

لڑکی کی شادی ہوجاتی تھی تو بور باندھنا ضروری ہوجاتا تھا۔ چوٹی بڑے حساب سے باندھی جاتی ہے تیل ڈال کر جوئیں وغیرہ نکالنے کے بعد تو تین ایک دوسرے کی چوٹی گوندھتی تھیں۔ بیچ کی مانگ نکال کر پہلے آگے کے تھوڑے بال دونوں طرف سے کر بور کی ڈوری کے ساتھ ایک مینڈھی گوندھی جاتی پھر باقی کے دونوں طرف کے بالوں کی مینڈھیاں گوندھی جاتی ہیں۔ پھر ان سب کو سمیٹ کر گدی سے اونچی چوٹی گوندھی جاتی ہے۔ مارواڑ میں عورتوں کے بال بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس چوٹی پر کلاوہ یا کالا ڈورا خوب کس کر لپیٹا جاتا ہے اور سونا سا بنا لیا جاتا ہے۔ ایک بال بھی ہفتہ دو ہفتہ باہر نہیں نکلتا۔ پھر جب بدبو ناقابل برداشت ہوجاتی اور سر میں جوئیں کلبلانے لگتیں تو نہان ہوتا۔

بڑے ماموں، منظر بھائی، بڑی ممانی، بھابی جان اور بچے اردو سے زیادہ اچھی مارواڑی بولتے تھے۔ آہستہ آہستہ سب کی زبان پر مارواڑی الفاظ چڑھنے لگے تھے۔ علی بخش اور شیخانی بوا کے علاوہ سب نوکر، چپراسی، چوبدار مارواڑی بولتے تھے۔ اماں مارواڑی سمجھتی تھیں بولتی نہیں تھیں۔

مارواڑ میں عورتوں کی آوازیں بے انتہا سُریلی ہوتی ہیں۔ چار عورتیں جمع ہوئیں اور سر جوڑ کر گھونگٹ کاڑھے گانا شروع کر دیتی ہیں۔ آس پاس کی عورتیں جمع ہونے لگتی ہیں اور کیا آوازوں کا آرکسٹرا شروع ہوجاتا۔ لفظ تو پلے نہیں پڑتے مگر آواز کا زیر و بم بے چین کر دیتا ہے۔ سُروں میں غضب کا سوز اور اداسی، ایک عجیب سی تنہائی کی پکار، میٹھا میٹھا غم۔ پنجاب کے گانے چہکتے ہیں سرسبز کھیت اور میدان، گھنے جھنڈ، چھل چھل کرتی ندیاں، رم جھم بارش، پنجابی گانوں میں قلانچیں بھرتی ہے۔ مگر ریگستان میں تھوہڑ کے جھنڈ، میلوں ریت ہی ریت، سپاٹ چٹانیں۔ ببول اور بھٹ کٹیا کے اِکا دُکا پودے۔ اور پھر ریت —— ریت —— ریت —— پانی کی بے مروتی نے دلوں میں کیسے دہکتے خشک گھاؤ ڈال دیے ہیں۔ سامنے پیا پتھر توڑ رہے ہیں پر سجنی پی کو پکارے ہی جا رہی ہے۔ لگتا ہے اصلی پیا پانی ہے عورت مرد بچے ڈھور ڈھنگر پیڑ پکھیرو سب کا پیا پانی ہی تو ہے۔ مور بے انتہا ہیں ان کی پکار میں بھی بلا کا درد ہے۔ ٹیٹری بھی سسکیاں بھر بھر کے پکارتی ہے "بنی ہٹ، مُنی ہٹ"۔

چلچلاتی دھوپ میں سپیرے نکلتے ہیں۔ سانپ کی جھولی اور بین سنبھالے۔ سانپوں کے درشن کراتے وقت سپیرا پیر میں گھنگروؤں کے گچھے باندھے پٹاری کے چاروں طرف ناچتا ہے سپیرن ڈھول پر

تھاپ دیتی ہے۔ ناگ دیوتا جھومتے ہیں سپیرا نہ جانے تلوے میں کیا لگاتا ہے کہ کھڑاؤں بغیر کھونٹی کے تلوے سے چپک جاتی ہے یا کچھ کھڑاؤں پر لگاہے کہ تلوے سے چپک جاتی ہے۔ ڈھول کی گمک، بین کا جادو، گھنگرووں کی چھم چھم، جیسے بادل گرج رہے ہیں۔ کھڑاؤں بجلی کی کڑک کو ماند کیے دیتی ہے۔ بس کوئی دم میں دیوتا پھل کر رو پڑیں گے۔ دھرتی سیراب ہو جائے گی مگر یہ بارش کانوں کے ذریعہ جسم کے روم روم کو سیراب کر دیتی ہے۔ حلق اور بھی خشک ہو جاتا ہے۔

کٹھ پتلی والا ہر پندرہواڑے پابندی سے آتا ہے۔ پتلی دے کر سائی کا روپیہ لے جاتا ہے۔ ایک عدد چارپائی ایک لالٹین، اسٹیج سج جاتی ہے کھیل وہی پرانا، مگر ابا کو تو مارواڑی گانے سننے کا شوق ہے۔ پنیاڑی، ڈھولا، مانڈ، کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ مگر گانے چلتے ہی رہتے ہیں، جی ہی نہیں بھرتا۔

ابا کسی کھیل تماشے والے کو نہیں لوٹاتے۔ بندر والا، بازی گر، کبوتریاں تنگ پاجامے چھوٹی سی چولی پہنے، ربڑ جیسے جسم والی "کبوتریاں" یعنی نٹنیاں کیسے جسم کو مروڑتی ہیں کہ لگتا ہے اب ٹوٹا چٹاخ سے۔

اور مہینے میں ایک دفعہ تماشہ والے ضرور آتے۔ صبح طے کر جاتے اور سرے شام آکر اسٹیج سجاتے۔ ایک پانچ چھ گز کا دبیز کپڑا دو بانسوں کی مدد سے میز کی طرح تان دیا جاتا۔ اس کپڑے پر ایک دنیا موجود ہے تخت پر بیٹھا راجہ، پانی بھرتی حسینائیں، بنسی بجاتے راس رچاتے کنہیا جی، سودا بیچتے سوداگر، بھالو والے، بندر والے، چوڑی چندری بیچنے والے، پھل پھول باغ فوارے تیر کمان تانے لکشمن جی، گرز اٹھائے پونچھ میں آگ کا شعلہ، ہنومان جی لال جیبھ سے خون ٹپکتا منڈ مالا گلے میں دھارن شنکھ گدا کنول دو دو دھاری، راکشس کے سر پہ پیر جمائے کالی ماتا۔ نوکا میں پتوار سنبھالے مانجھی۔ ارے ایک کونے میں لاٹ صاحب بھی ہیں، منہ میں چرٹ دبائے۔ کیا نہیں اس چھ گز لمبے سوا گز چوڑے کینوس میں۔

باہر احاطے میں آس پاس کی خلقت جمع ہو جاتی ہے مونڈھوں پر ابا کے ساتھ عمائدین شہر کچھ عہدے دار سارا پولیس کا عملہ، چھت پر خواتین۔ ابا تو جلدی اٹھ آتے پھر کچھ اور بزرگ بھی چل دیتے محفل میں کسی کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔ چپکے سے چوروں کی طرح کھسک لیتے اور رات بھر دو نوجوان پیروں میں گھنگرو باندھے بین بجاتے ناچتے۔ ڈھول ہمیشہ عورت ہی بجاتی اور ساری رات گھونگٹ میں سے موسیقی کے دھارے بہتے۔ باقاعدہ کہانیاں گائی جاتی ہیں۔ سوال جواب چلتے ہیں۔

وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا۔ میں نے سوچا کچھ دن کے لیے جودھپور ہو آؤں منے بھائی بلا گئے تھے۔ دلہن بھابی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ کچھ کپڑے بھی خرید لوں گی۔

منے بھائی دن بھر وکالت میں سر کھپاتے، صحت ذرا غنیمت ہو گئی تھی۔ دمہ کی شکایت بھی غائب ہو چکی تھی۔ وہ رات لو دیر تک لکھتے۔ صبح جب وہ کچہری چلے جاتے تب میں جاگتی۔ دلہن بھابی چٹ پٹ کچھ ناشتہ دیتیں اور رات کی لکھی ہوئی کہانی مجھ سے پڑھوا کر سنتیں۔ وہ ان دنوں "شریر بیوی" لکھ رہے تھے۔ اس میں بہت سی باتیں انھوں نے زندگی سے لی ہیں۔ باقی افسانہ نگاری ہے۔ دلہن بھابی سن کر بہت غصہ ہوتیں "یہ سب جھوٹ ہے"۔ اور ایک دن منے بھائی سے لڑ پڑیں اور مسودہ جلانے کی دھمکی دی۔ انھیں بے انتہا ہنسی آئی۔ سمجھانا چاہا کہ بے وقوف یہ کہانی ہے مگر وہ کہاں مانتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ مسودہ کورٹ اپنے ساتھ لے جاتے۔ جو لکھ چکے ہوتے وہ شاہد بھائی کو دہلی بھیج دیتے۔ بڑی چراغ پا ہوئیں۔ پورے دن سے تھیں مگر بے حد پھرتیلی تھیں۔

ایک دن صبح مجھے منے بھائی نے جگایا۔

"اٹھو!"

"ابھی سے، تھوڑی دیر میں اٹھوں گی۔" میں کروٹ لے کر پھر سونے لگی۔

"ارے ہمارا بیٹا نہیں دیکھو گی؟"

"رات بھر تمہارے نیمنے بیٹے لاتیں مارتے رہے۔ یہ تجو اور چھبا بہت بد ہیں۔ میں انھیں نہیں سلاؤں گی اپنے ساتھ۔ دونوں گھس پڑتے ہیں۔"

"ارے نیا والا بیٹا!"

"نیا۔ ہیں۔ کیا بچہ پیدا ہو گیا؟"

"ہاں چلو دیکھ لو۔"

"رات تک اچھی بھلی سوئیں دلہن بھابی اور صبح بیٹے سے بچہ دے دیا۔"

"رات کو تکلیف تھی۔ چھوٹے خاں کو بھیج کر نرس کو بلوالیا اور۔۔۔"

"آواز بھی نہیں نکلی۔"

"بھئی ایکسپرٹ ہو گئی ہے ہماری خانم ہمیں بھی نہیں جگایا۔"

"تیسرا بیٹا، پانچواں بچہ، بے حد پیارا۔ گول مٹول۔" دلہن بھابی لیٹی ہنس رہی تھیں۔

راجپوتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اس لیے ہر وقت راجپوتی آن بان کا ذکر رہتا تھا۔

منّے بھائی نے تجّو کا نام موہن سنگھ، چھبّا کا سوہن سنگھ، اور نو وارد کا نام فوراً مکھن سنگھ رکھ دیا۔ وہ تھا بھی مکھن ملائی جیسا نرم سفید۔ وہ کبھی ان کے اصلی نام نہیں لیتے تھے اور موہن مکھن اور سوہن ہی پکارتے تھے۔ بہت پیار آتا تو موہنیا، سوہنیا اور مکھی، یا مکھو کہتے تھے۔ آج بھی صرف مکھو کا نام رہ گیا ہے۔ دونوں بڑے اب زعیم اور رجیم کہلاتے ہیں۔

ہم دس بہن بھائیوں میں سے دو کے اولاد نہیں ہوئی۔ آٹھ نے انتیس بچّے پیدا کیے جن میں سے تیرہ پاکستان چلے گئے، سولہ ہندوستان میں رہ گئے۔

عظیم بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ پارٹیشن کے بعد ایک یہاں رہ گئے اور چار پاکستان چلے گئے۔ ہم چاروں بہنیں ہندوستان ہی میں رہیں۔

چار بھائیوں میں سے تین کا پاکستان میں انتقال ہو گیا بس ایک بھائی ہیں مجھ سے چھوٹے۔ ہندوستان میں بھی ایک بھائی ہیں مجھ سے بڑے۔

مگر میں مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہیں ہم دسوں زندہ ہیں اور ہم اب بھی چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔

ایک بہن کا ہندوستان میں انتقال ہو گیا۔

باجی، میری پیاری باجی امّاں، جنھوں نے مجھے پونے دو برس کی عمر سے سنبھالا تھا۔ ان کا رنگ صاف تھا میرا سانولا، ورنہ لوگ سمجھتے تھے میں ان کی بیٹی ہوں۔

# سونے کا اگالدان

منّے بھائی جاورے میں خاندان سے دور پہلی مرتبہ گئے تھے۔ میرے پاس کئی خط آچکے تھے کہ فوراً آؤں۔

میں چھٹیاں ہمیشہ ان کے یہاں گذارا کرتی تھی۔ جب ابا میاں سانبھر میں جج تھے تب بھی میں سانبھر تھوڑے دن رہ کر جودھپور چلی جایا کرتی تھی۔ اس دفعہ منے بھائی نے اتنا اصرار کیا کہ میں سیدھی ان کے ہاں پہنچی۔ انھوں نے کوشش کر کے آگرہ سے ننھے بھائی کو ریونیو سیکریٹری کے عہدے پر بلوالیا تھا۔ نواب جاورہ عظیم بھائی کو بہت مانتے تھے۔ نہ جانے کیا جوڑ توڑ کر کے یہ ثابت کر دیا گیا تھا کہ نواب صاحب سے ہمارا کچھ ننہال سے رشتہ نکلتا ہے۔

میرے پہنچتے ہی منے بھائی نے شکایت کی ننھے بھائی کو اتنا اچھا عہدہ ملا ہے مگر سب پٹرا کیے دے رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو حسب قاعدہ تین بار جھک کر سلام کرنے پر اڑ گئے۔ بہت سمجھایا کہ بھئی دربار کے کچھ قاعدے ہیں وہ تمہارے لیے کیسے بدلے جا سکتے ہیں۔ بہت ہی سمجھایا اور شوکت آپا بھی جان کو آگئیں تو نیم راضی ہو کر ٹال گئے۔ سب سمجھے شاید مستقبل کے خیال سے رویہ بدل دیں گے مگر جب دربار میں حاضر ہوئے تو اونچی آواز سے السلام علیکم کہا اور اس سے پہلے کہ نواب صاحب بیٹھنے کی اجازت دیتے، بیٹھ گئے۔ مجبوراً نواب صاحب کو وعلیکم السلام کہنا پڑا اور بیٹھنے کا حکم بھی بعد میں ہی دے پائے کیوں کہ وہ بیٹھ چکے تھے اور وہ بھی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بے تکلفی سے حسب عادت گھٹنا ہلا رہے تھے۔ دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ منے بھائی کا خون خشک ہو رہا تھا۔

نواب صاحب تھے تو چھوٹے سے نواب۔ اٹھارہ لاکھ سالانہ کی ریاست تھی جس میں سے چودہ لاکھ ان کی اپنی ذات پر خرچ ہوتا تھا۔ باقی ریاست کی بہتری پر جو لہ آنہ فی فرد کے برابر پڑتا تھا۔ سوائے محل اور شہزادوں کے بنگلوں کے سب مکان کچے کھپریل یا چھپر کے تھے۔ ان کے بڑے بھائی چیف منسٹر تھے ان کا بنگلہ بھی شاندار تھا۔

عام طور پر نواب صاحب کو شاہ کہا جاتا تھا۔ جس حصہ میں محل تھا وہ کسی دوسرے ہی ملک کا ٹکڑا نظر آتا تھا۔ پکی سڑکیں، بجلی کے کھمبے، لق و دق پارک، سوئمنگ پول، جشن خانہ، غرض کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کتوں کا بہت شوق تھا اور ایک انگریز ڈاکٹر اور پرسنیز مقرر تھے جو بہت شان سے بنگلوں میں رہتے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ میں سالگرہ اور دوسرے جشن کے موقعوں پر فوج کے پرے بھی جمتے تھے۔ نواب صاحب کے آنے جانے پر توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔

ریل دو بار دن اور رات میں ٹھہرتی تھی۔ ایک بوسیدہ سا پلیٹ فارم تھا۔ اندھیرا گھپ، ایک ٹوٹی سی اندھی لال ٹین تنہا روشنی کا ذریعہ تھی۔ نواب صاحب کی اپنی اسپیشل محل تک آتی تھی جس کے لیے علاحدہ لائن بنی تھی۔ یہ ٹرین ریاست کے عجائبات میں سے تھی اور مہمانوں کو حسن سیری اور پرانی عمارتوں کے ساتھ دکھائی جاتی تھی۔ بیحد خوبصورت سفید اسپیشل جس پر سنہرے پھول بوٹے بنے تھے لگتا تھا سیدھی بکنگھم پیلس سے چلی آ رہی ہے۔ اندر محل کے نہایت خوبصورت صوفے اور کرسیاں تھیں۔

ادھر دو سال سے لکھنؤ میں رشیدہ آپا نے کچھ ایسا اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کمیونزم سے نیا نیا معاشقہ ہوا تھا۔ جب کہ شان و شوکت دیکھ کر سب عش عش کرنے لگتے میں اندر ہی اندر سلگتی۔ سارا مزہ کرکرا ہو چکا تھا۔ نوابوں اور راجاؤں کا انگریز حاکموں سے گٹھ جوڑ۔ نواب صاحب کے سب بیٹے زیادہ تر ولایت میں پڑھتے تھے، پڑھتے کیا خاک وہاں گل چھرے اڑاتے تھے۔ صرف دو جڑواں صاحبزادے علی گڑھ بھیجے گئے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا تو شمیم جو میٹرک کا تیسری بار امتحان دے رہے تھے، ان لڑکوں کی صحبت میں ناچ گانے کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ یہ لڑکے ایک شاندار کوٹھی میں اپنے عملے کے ساتھ بس ہلڑ مچایا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے زبردست عطیہ یونیورسٹی کو دیا تھا۔ اس لیے ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس وقت یونیفارم لازمی سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ صاحبزادے جن کا نام منے میاں اور پیارے میاں تھا۔ جارجٹ کے زردوزی کام کے کرتے

ریشمی چست پاجامے اور کامدار جوتے پہنے کلاس میں کبھی ٹھمکتے آجاتے۔ ان کے ساتھ سازندے بھی کوارٹرس میں رہتے تھے۔ روز ناچ گانے کا پروگرام جمتا یونیورسٹی کے نکمے اور چاپلوسی میں ماہران کی درباری پر تعینات رہتے۔

نواب صاحب کے سب سے بڑے دو بیٹے ولایت میں تھے بعد میں یہ جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ قاعدے سے ان میں سے جو چند منٹ بڑا تھا اسے ولی عہد مانا گیا تھا۔ جس پر وہ بڑے بیٹے جو ولایت میں تھے بہت برافروختہ تھے۔ انھوں نے ایک انگریز عورت سے شادی کرلی تھی اور دو بچے بھی تھے۔ جڑواں صاحبزادے کچھ چھٹنکی قسم کے تھے عورتوں سے قطعی دلچسپی نہیں تھی خوب سجتے اور میک اپ کرتے تھے۔ نواب صاحب عجیب چکر میں تھے۔

ادھر انگریز بیوی نے کچھ طنابیں کھینچیں اور نواب صاحب پر گورنمنٹ نے پچھلے دروازے سے زور ڈالا تو نواب صاحب نے پرانا گزٹ ملغ کر کے نیا جاری کیا جس کی رو سے بڑے بیٹے کی ولی عہدی پکی ہوئی۔ جب ولی عہدی کی پوزیشن پکی ہوگئی تو وہ ولایت سے مع انگریز بیوی اور بچوں کے واپس آئے۔ ان کے چھوٹے بھائی تو پہلے ہی واپس آگئے تھے شادی کے بعد دو بچے ہو چکے تھے۔ بڑے شریف انسان مانے جاتے تھے اور اپنی بیوی پر جان چھڑکتے تھے۔ انھیں کوٹھی، موٹر، عملے کے علاوہ کوئی عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔ شاید کوئی فوجی قسم کا تھا۔ وہ بڑے سکون سے اپنے چھوٹے سے پیارے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔

مگر ولی عہد سے لوگ ذرا خائف تھے۔ انھوں نے آتے ہی پوری ریاست کی جانچ پڑتال شروع کر دی تھی۔ اور فوج کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے بھی کافی مرعوب کن ثابت ہوئے تھے۔

میں جیسے ہی جاورے پہنچی ایک دھوم مچ گئی۔ بی اے پاس اور وہ بھی مسلمان لڑکی، ایسا جانور کبھی ریاست میں دکھائی نہیں پڑا تھا۔ نواب صاحب نے فوراً مجھے سو روپیہ ماہوار پر گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹرس کا عہدہ دے دیا۔ ایک پرانے محل نما بنگلے میں لڑکوں کے اسکول سے کچھ بنچیں اور ڈیسک منگوا کر ڈلوا دیے گئے۔ ایک بلیک بورڈ اور ہندوستان کا پرانا سا نقشہ مہیا کر دیا گیا۔

میں پہلے تو بہت بدکی اور جودھپور بھاگنے کی دھمکی دی مگر منے بھائی پیچھے پڑ گئے۔

"نواب صاحب نے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ تمہارا تقرر ہو چکا بس آج کل میں آرڈر تمہیں بھی مل جائے گا۔ اب تم انکار کرو گی تو غضب ہو جائے گا۔ نواب صاحب کے حکم کو ٹالنا۔ ....."

"ارے واہ، بھئی مجھے ایسے نوکری نہیں کرنا۔"

"اب تو تقرر ہو گیا"، ننھے بھائی نے چھیڑا۔

ہمارے دور کے رشتہ کے نانا سرفراز علی خاں دوڑے ہوئے آئے۔ ان کی پوتی نواب صاحب کے ایک چہیتے بیٹے سے منسوب تھی، بلکہ نکاح ہو چکا تھا۔ بس ایسے ہی کسی دعوت میں چھ برس کی بچی کو دیکھا اور پسند فرمالیا۔ دوسرے دن اپنے بارہ برس کے بیٹے سے نکاح کر دیا۔ بچی کی تقدیر جاگ اٹھی۔ کیا بھاری جوڑے اور جڑاؤ زیور چڑھایا۔ نواب صاحب عجیب درویش منش ہیں۔ ان کی پہلی شادی دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان میں ہوئی تھی جو مغل شہزادے سکندر بخت کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے مجھے رشتہ کئی بار سمجھایا گیا مگر ذہن سے اتر گیا۔

یہ بیوی نہایت حسین اور گوری چٹی تھیں۔ کوئی چندہ پندرہ برس کی بیاہ کر آئی تھیں۔ نواب صاحب نے ان کا گھونگھٹ پلٹا اور فوراً چھوڑ دیا۔ انھیں گوری رنگت سے اُبکائی آتی تھی پھر انھوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ دی۔ وہ کنواری آئی تھیں اور کنواری ہی رہیں۔

نانا نے سمجھایا مصلحت اسی میں ہے کہ اس وقت عہدہ قبول کر لوں اور موقع پا کر جانا چاہوں تو کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

پچیس تیس لڑکیاں مختلف قد اور عمر کی جمع کر دی گئیں۔ زیادہ تر شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور کچھ نہیں بس انگریزی پڑھنا اور بولنا سیکھنے کا شوق تھا۔

سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کیا مسخری کلاس تھی۔ سجی بنی لڑکیاں بڑی مہذب بڑی پیاری، بڑے ادب سے بیٹھتیں۔ میں انھیں کچھ زبانی کچھ بلیک بورڈ کی مدد سے انگریزی لکھنا اور بولنا سکھاتی۔ بڑی دلچسپ کلاس ہوا کرتی تھی کسی لڑکی کو نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ بس ننھی بی، پیاری بی، گوری بی، اچھی بی، سجی بی، سب بیبیاں تھیں۔ ایک بڑی ہوشیار نازک اندام خوبصورت سی لڑکی تھی، بڑی پٹاپٹ بولا کرتی تھی۔ اس کا نام شہزادی بیگم تھا۔ سب سے ہوشیار مہذب اور شوقین تھی۔

بڑے مزے آتے۔ چیف منسٹر کی بیٹیاں بڑی شریر مگر پیاری تھیں۔ میں نے کبھی ان سے گھر

چلی جاتی تو بڑا لطف آتا۔ پکنکوں کے پروگرام بنتے گانے بجانے ہوتے۔ غرض عیش ہی عیش۔ ولی عہد کے چھوٹے بھائی منی میاں کی دلہن کو بھی شوق چرایا کہ انگریزی پڑھیں گی۔ روز موٹر مجھے لینے آتی اور میں رات کا کھانا انھیں کے ساتھ کھا کر لوٹتی۔ وہاں بھی پڑھائی وڑھائی خاک نہیں بس گپتیں۔ لونڈیوں کے ناچ گانے کشتیاں نقلیں شرارتیں۔ ہاں تھوڑی انگریزی بولنے کی مشق۔ منی میاں کی بیوی سے محبت ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ بڑی نازک مگر بھرے جسم کی نہایت شفاف چکنی جلد بالکل سفید نام کو سرخی نہیں۔ سیاہ بھونرا بال اور سیاہ چمکتی آنکھیں۔ ہلکے پھلکے رنگوں کے لباس اور صوفیانہ زیور۔ دو ایک بار منی میاں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بڑے ہنس مکھ اور دھیمی آواز سے بولتے تھے۔ میں بڑی احتیاط کیا کرتی تھی۔ مگر کبھی منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جو نوابوں کے رہن سہن پر چوٹ ثابت ہوتی تو سب چپ سناٹے میں رہ جاتے بات آگے نہ بڑھ پاتی۔

ایک دن منی میاں نے بڑی حسرت سے کہا۔

"جی چاہتا ہے ریاست سے باہر جاؤں، کوئی نوکری کروں۔"

"پھر کون سی چیز مانع ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی چیز نہیں۔ باہر بھی یہی دنیا ہے۔ برٹش سرکار کوئی عہدہ دے دے گی۔ کیا فرق پڑے گا۔"

"تو ولایت۔"

"ولایت میں بھی کوئی فرق نہ پڑا،" وہ بڑی حسرت سے بولے۔

"آپ کو کس چیز کی کمی ہے؟"

"خدا کے فضل سے کسی چیز کی نہیں۔"

"پھر؟"

"بس یکسانیت، اکتاہٹ۔"

"کبھی آپ نے ریاست کا دورہ کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"بس خول میں بند...۔"

منی میاں کچھ کبیدہ خاطر ہوئے۔ اور اتنے میں کھانے کا دسترخوان لگ گیا اور بات ٹل گئی۔

لتنے کھانے ایک دسترخوان پر میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ایک ایک نوالہ بھی دیا جائے تو بدہضمی ہو جائے۔ اور پھر اتنا اتنا بھر دیتے ہیں پلیٹوں میں۔ چھ سات قسم کی تو روٹیاں ہی ہوتی تھیں۔

میری موجودگی میں ایک جشن نواب صاحب کی سالگرہ کا منایا گیا۔

"نذر گذارنی ہوگی" منے بھائی نے کہا۔

"تو میں نہیں جانے کی" میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"ارے واہ لتنے مالدار کو اور مال دو۔ اور مہینے کا آخر ہے میرے پاس تو پیسے بچتے ہی نہیں۔"

منے بھائی نے ایک اشرفی اور گیارہ روپیہ دلھن بھابی کو میری نذر کے لیے دیدیے کہ عین وقت پر دے دیں۔

نواب صاحب سفید ریشمی چست پاجامہ اور شربتی شفان کا کارچوبی کام کا کُرتا اور جھلملاتے ہار پہنے زربفت کی چوکی پر بیٹھے تھے۔ عورتیں نذرانے کر پہلے سلام کرتیں پھر رومال پر روپیہ اشرفیاں رکھ کر پیش کرتیں۔ وہ روپیوں کو ہاتھ لگاتے اور پاس کھڑا مصاحب نذر لپک لیتا۔

میں نے دلہن بھابی کے دیے ہوئے رومال کو سامنے بڑھایا۔ نواب صاحب خاموش غور سے مجھے گھورتے رہے اور میں ڈری کہ انھوں نے اب ڈالا مجھے اپنے حرم میں۔ پھر انھوں نے ہاتھ لگایا اور مصاحب روپیے اچک لے گیا۔ اشرفی پڑی رہ گئی مگر اس سے قبل کہ میں اشرفی دبا کر سرک جاتی چیل نے پھر جھپٹا مارا اور میں اپنا سا منھ لے کر رہ گئی۔

نواب صاحب کی ایک سے ایک بدصورت بیویاں جواہرات میں غرق جھما جھم ساڑیاں پہنے چائیں چائیں بول رہی تھیں۔ صرف بڑی بیگم خاموش بیٹھی تھیں۔ ذرا بھرے جسم کی بے حد حسین بے انتہا گوری یا شاید آبنی کرتلوں میں وہ زیادہ ہی سفید لگ رہی تھیں۔ میں ہرایک کے زیورات گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔

نہ جانے کیسے پتہ چلا اور نوکر نے جلدی سے سونے کا اگالدان نواب صاحب کے سامنے پیش کر دیا اور انھوں نے اس میں پیک تھوک دی۔ ہر بیوی کے ساتھ چند لونڈیاں اگال دان خاصدان سنبھالے لگی ہوئی تھیں اور نہ جانے کیسے انھیں تھوک آنے کا پتہ چل جاتا تھا کہ

جست سامنے کردیں۔

اتنے میں ولی عہد تشریف لے آئے۔ لمبے قد کے سانولے نوجوان ان کے ساتھ ایک لال لکڑ میم یعنی ان کی انگریز بیوی تھی۔ لمبا ریشمی گاؤن اور گلے میں سچے موتیوں کا ہار۔ کانوں میں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ بال بھی نہایت سرخ انگارہ اور سبز آنکھیں۔ کافی بھیانک اور بوڑھی سی لگ رہی تھی۔ ایک دم حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نواب صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ولی عہد اور ان کی بیوی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نہ جانے کدھر چلے گئے۔ کیونکہ ان کے اٹھتے ہی محفل اکھڑ گئی۔

صرف بڑی بیگم جیسے کہیں دور سنسان جگہ کھوئی ہوئی تھیں۔

ہندوستان پر حکومت کرنے والوں کی ہم قوم بھی کسی حاکم سے کم نہ تھی۔

کسی زمانے میں انگریز بھی ہندوستانی لڑکیوں سے شادی کرتے تھے اور بڑے بڑے نوابوں راجاؤں تک نے بڑوں کو بیٹیاں دی تھیں۔ نچلے طبقے کے انگریز بھی شادیاں نہ کرتے تو تعلقات تو پیدا کر ہی لیتے تھے مگر انگلینڈ کی کنواریوں پر بری بیت رہی تھیں۔ نوآبادیات کے حصول کے چکر میں ملک کا بچہ بچہ پردیس سدھار رہا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی کو چھوڑ کر کوئی نیٹو عورت سے دل لگا بیٹھا تھا انگریز عورت اس نیٹو سے ٹکر لینے پر تل گئی۔ اور بیویاں اور شوہر کی متلاشی کنواریاں نکل پڑیں ساجن کی تلاش میں۔ انھوں نے نیٹو عورتوں کے وجود کے خلاف سخت احتجاج کیا اور حاکموں کو مجبور کیا کہ اس قسم کے میل جول پر پابندی لگائی جائے۔ دوغلے بچوں کی دونوں ہی ملکوں میں مصیبت آگئی۔ وہ اپنے کو انگریز بچہ گردانتے تو انھیں سوسائٹی ہضم کرنے کو تیار نہ تھی۔ نیٹو سے وہ خود کو برتر سمجھتے تھے اس لیے جواب میں انھوں نے بھی حقارت دی۔ یہ یوریشین یا انگلو انڈین ذہنی طور پر ایک مفلوج سا طبقہ بن گئے انھیں سیاہ فام عیسائیوں سے ذرا اوپر مگر گوروں سے نیچے جگہ ملی۔

مکمل گورے اور کالے ہمیشہ انھیں عجوبہ ہی سمجھتے رہے۔ ہندوستان کالے گورے کی تفریق سے پاک تھا۔ یہاں سانولا رنگ سراہا جاتا تھا۔ مگر ان لوگوں کو یہاں بھی ہضم کرنا دشوار ہو گیا۔

انگریز بیوی ولی عہد کا زور بازو تھی۔ اور ولی عہد نے اپنے قدم جمانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

سالگرہ کے جشن کے سلسلے میں فوجی پریڈ ہوئی پولو کا میچ ہوا جس میں ننھے بھائی جو اس کھیل میں مشاق تھے درد سر بن گئے انھوں نے ولی عہد کو گیند نہیں لینے دی اور خود گول پر گول کرتے رہے۔ ننھے بھائی کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ درباری بوکھلا رہے تھے۔ نواب صاحب زیر لب مسکرا رہے تھے۔

اور ننھے بھائی میدان میں جمے ہوئے تھے کئی بار انھیں ساتھ والوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگران کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا کہ بجائے تعریف کے لوگ انھیں احتیاط کرنے کی صلاح کیوں دے رہے ہیں۔ ننھے بھائی کی کامیابی کو کوئی نہیں سراہ رہا تھا میدان میں سناٹا تھا اور ولی عہد کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ کئی بار انھوں نے جھلا کر ننھے بھائی پر حملہ بھی کیا مگر انھیں پتہ بھی نہ چلا اور وہ بچ نکلے۔ نواب صاحب نے کھیل بند کرنے کا حکم دے دیا۔

ننھے بھائی کے لیے یہ کامیابی کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی اور انھیں تالیوں کی آواز کی غیر موجودگی کا قطعی احساس نہ ہوا۔ اب دوسرا کھیل شروع ہوا۔ ایک لمبے بانس کے سرے پر ایک مٹی کی ہانڈی لٹکا دی گئی جس میں پانچ اشرفیاں تھیں اور نشانہ لگانے والے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ننھے بھائی نے ساری عمر اگر کوئی قابل تعریف کام کیا تھا تو نشانہ بازی، دس برس کی عمر سے وہ شکار مار کر لا رہے تھے۔

ولی عہد کا نشانہ خالی گیا مصلحتاً سب نے نشانہ خالی دیا۔ بھلا ننھے بھائی نے کون دربار جھیلے تھے تڑ سے گولی ماردی۔ ہنڈیا ٹوٹ گئی اشرفیاں بکھر گئیں۔ کوئی بات نہیں کسی نے کچھ نہ کہا اور پھر سے مقابلہ شروع ہوا۔ دوسری ہانڈی ٹانگی گئی۔ پھر ننھے بھائی نے اڑادی لیکن مارے غصہ کے ولی عہد سر سے پیر تک کانپ رہے تھے۔ ان کے دو فائر خالی جانے کے بعد ننھے بھائی نے پھر ہانڈی توڑ دی۔

پھر ہانڈی بدلی گئی۔ ایک صاحب نے آکر چپکے سے کہا۔

"یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں چغتائی صاحب"

"کیوں؟ کیا کیا ہم نے"

"صاحب کیا آپ سمجھتے ہیں ہمارے نشانے آپ سے کم ہیں؟"

"تو لگاتے کیوں نہیں؟"

"کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر سال صرف ولی عہد ہی ہانڈی توڑتے ہیں"

"تو اس سال بھی توڑیں کون روکتا ہے؟"

"افوہ۔ قبلہ آپ تو ... چہ سنیے۔ ولی عہد چار پانچ جتنے فائر کریں آپ چپ رہیے۔ گولی چلائیے بھی تو ایسے کہ نشانے پر نہ لگے"

"ارے واہ کیوں؟"

"دیکھیے چغتائی آپ کو یہ کیوں بڑی بھاری پڑے گی۔ وہ صاحب غرائے۔

ولی عہد نے تین فائر کیے۔ ہانڈی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ننھے بھائی نے زندگی میں کبھی عاقبت اندیشی کا مظاہرہ ہی نہیں کیا وہ تو آگے پیچھے دیکھنے کے قائل ہی نہ تھے۔ اور ہانڈی کے پرخچے اڑ گئے۔

منے بھائی چکرا کر کرسی سے نیچے گرے ننھے بھائی سارا مقابلہ بھول کر لپکے۔ انھیں بچے کی طرح اٹھایا اور کسی سے پوچھے گچھے بغیر گھر لے آئے۔ پیچھے ایک آدمی دوڑ دوڑ کر کہہ رہا تھا۔

"نواب صاحب کا حکم ہے جج صاحب کو فوراً ٹھہرا لیجیے۔"

ننھے بھائی نے کچھ سنا ہی نہیں وہ انھیں گھر لے آئے۔

پھر جو چورن بنا ہے تو خدا کی پناہ۔

رات کے کھانے کے بعد منے بھائی عموماً کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے کہ چپقلش شروع ہو جاتی پھر وہ ایسے پھندے مارتے کہ گرما گرمی اور پھر خاصی جنگ عظیم چھڑ جاتی۔ بڑے ماموں ان لڑائیوں کو "جنگ عظیم" کہتے تھے کیوں کہ عظیم بیگ ہی ان لڑائیوں کو کنڈکٹ کرتے تھے۔

خود منے بھائی انھیں "چورن" کہتے تھے۔ کیونکہ بحث مباحثہ میں اتنا جوش پیدا ہوتا تھا کہ واقعی بھوک لگ آتی تھی۔ کھانا ہضم ہو جاتا تھا۔

"جس دن چورن نہیں بنتا کھانا چھاتی پر دھرا رہتا ہے" وہ بڑی سنجیدگی سے کہتے تھے۔ یہ لڑائیاں اتنی مضحکہ خیز اور دلچسپ ہوتی تھیں کہ واقعی جس دن کسی مہمان کی مروت میں نہ ہو پاتیں تو بڑا بوجھ سا لگتا تھا۔ ان لڑائیوں میں بچوں کو زبان پر دھار رکھنے کا موقع ملتا تھا اور کبھی کوئی بچہ بڑا اچھا ہوا جملہ لگا دیتا تو لوگ پیار میں چپتیں اور شاباشی بھی ملتی۔ نئی بہوئیں اور داماد اس چورن سے بہت حواس باختہ ہوتے تھے۔ اور کافی عرصہ بعد اس کے عادی ہو پاتے تھے۔

"ننھے بھائی تم میری اور چغتائی کی نوکری بھی ختم کروا دو گے۔" منے بھائی نے شکایت کی۔

"کہو تو ہم وہاں آگے سے چلے جائیں۔" ننھے بھائی بولے۔

"ہرگز نہیں میں گر کے مرکے بھی نہیں جاؤں گی۔" شوکت آپا نے فیصلہ کیا۔

"ننھے بھائی نواب صاحب ہم لوگوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں جیسے ہی جب ولایت سے انجینئرنگ پاس کر کے آئے گا تو اسے ریاست کا چیف انجینئر بنائیں گے ہم سب کا مستقبل کافی روشن ہو سکتا ہے۔"

نہ جانے منے بھائی (؟) دم کیوں نواب صاحب پر لٹو ہوئے تھے۔ یہ وہی "کھرپا بہادر" کے مصنف تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں نواب رام پور اور نواب جاورہ کے حالات لکھے تھے۔ نواب صاحب ان سے پھر بھی خفا تھے انھیں "کھرپا بہادر" کا کیا پتہ ہوگا۔ جاورہ میں انھوں نے جو نئی کتاب لکھی تھی یاد نہیں کیا نام تھا، وہ نواب صاحب کے نام معنون کی تھی۔

"بھئی میرے مستقبل کی فکر نہ کی جائے۔" میں نے اکڑ دکھائی۔ "میں چھٹیوں میں جاؤں گی تو پھر نہیں واپس آؤں گی۔"

"بیوقوف ہو کتنی خاطر ہوتی ہے تمہاری، کچھ نہیں کرنا پڑتا مفت کی تنخواہ ملتی ہے۔ آرام سے موٹر میں گھومتی ہو۔ صاحبزادیاں تمہاری گرویدہ ہیں نواب صاحب فرشتہ ہیں۔ ناشکر گزار ہو۔"

اور میں نے سوچا مفت بیٹھ کر تنخواہ لینی تھی تو کسی موٹے آسامی سے شادی میں زیادہ منافع رہتا۔ پھر لوگوں کو مجھ پر ترس بھی نہ آتا کہ بے چاری کی شادی نہیں ہوئی خود نوکری کرتی ہے۔

سب سمجھاتے رہے اور ننھے بھائی اس کان سُن اس کان اڑاتے رہے آج تک سوائے شوکت آپا کے کوئی ان پر حکم نہ چلا سکا۔ مگر اس معاملے میں شوکت آپا بھی بے بس نظر آرہی تھیں۔

ولی عہد کا معاملہ ٹھنڈا نہ پڑا تھا کہ ننھے بھائی نے حد کردی۔ ریاست میں شیر اور گھڑیال مارنے کی مناہی تھی بہت سخت جرم تھا۔ ننھے بھائی اتوار کو گئے اور یہ لمبا گھڑیال مار لائے۔ منے بھائی کے ہوش اڑ گئے۔ شوکت آپا ماتم کرنے لگیں۔ دلہن بھابی کو بھی اب میاں کی نوکری کے لالے پڑتے نظر آئے بہت سمجھایا۔

"ارے بھائی گھڑیال مارنے کا موقع ملے تو کیا ہم چھوڑ دیتے اور بھاگے بھاگے نواب صاحب کے پاس جاتے کہ چلو گھڑیال مارو۔"

"خدا کے لیے ننھے میاں" شوکت آپا رونے لگیں۔ واویلا کا آخر کچھ اثر ہوا۔

ننھے بھائی فوراً گھڑیال لے کر نواب صاحب کے پاس گئے۔

"میں نے اپنی جان بچانے کے لیے مارا، میں بُری طرح گھر گیا تھا ورنہ ہرگز قانون شکنی نہ کرتا، آپ کی خدمت میں پیش کرنے لایا ہوں۔"

نواب صاحب انھیں اتنا نرم دیکھ کر پھولے نہ سمائے، اور ان کا قصور معاف کردیا۔

مگر دوسرے دن ولی عہد تمام محکموں کا معائنہ کرنے نکلے تو سیدھے ننھے بھائی کے اوپر نازل ہوئے۔ نہ جانے کب سے کھیلے ہوتے چلے آرہے تھے۔

"میں تو ابھی آیا ہوں، اور پھر میں نے نواب صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میں ریونیو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ مانے ہی نہیں تقرر کر دیا۔ اور میں جتنا اس گھپلے کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور الجھتا جاتا ہے۔ میرے ہاتھ میں کوئی فیصلہ نہیں۔ چیف منسٹر کے احکامات چلتے ہیں۔"

ولی عہد پھنکارتے ہوئے چلے گئے۔ اسی وقت ایک حکم نامہ آیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست کے حدود سے نکل جائیں ورنہ قانون کی زد میں آجائیں گے۔

شوکت آپا کے تو ہاتھ پاؤں کا دم نکل گیا۔ مگر ننھے بھائی نے دو گھنٹے میں سامان سمیٹ ڈالا، سامان تھا بھی کتنا۔ مانگے کی چیزوں سے کام چلا رہے تھے۔ شوکت آپا بہت جان کھاتی رہیں انھوں نے پلنگ تک بنوا کے نہ دیئے تھے۔

ننھے بھائی کے جانے کے بعد نواب صاحب منے بھائی پر اور مہربان ہو گئے ان کے علاج کے لیے طبیب شاہی کی خدمات پیش کیں۔ منے بھائی صدمہ سے ایک دم نڈھال ہو کر بالکل صاحب فراش ہو گئے۔ ساری ساری رات کھانستے گذر جاتی۔ ایک دم نقاہت اتنی بڑھ گئی کہ بات منھ سے نہ نکلتی۔ طبیب کی دوا الٹا اثر کر رہی تھی۔ پیتے ہی پسینے چھوٹ کر بے ہوش ہو جاتے۔ دلھن بھابی جاگتیں کبھی میں، مگر مجھے نیند بے طرح ستاتی، بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔ منے بھائی پیاس کی وجہ سے بے تاب ہو کر پکارتے مگر آواز نہ نکلتی اور دم گھٹنے لگتا تب دلھن بھابی بے چین ہو کر جاگ اٹھتیں۔ دوا دیتیں تو وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپتے۔

ایک دن رات کے دو بجے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی کھولا تو بوڑھے نانا جلدی سے اندر آئے اور کہا "لالٹین بجھا دو۔"

تھوڑی دیر تاریکی میں وہ سہمی سہمی سانسیں لیتے رہے پھر کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی سے بولے۔

"جو کہتا ہوں سنو اور سوال نہ پوچھو۔ صبح نواب صاحب سے اجازت لے کر دلھن تم منے کے ساتھ میرج کے سینی ٹوریم چلی جاؤ۔"

"بچے" دلھن بھابی بولیں۔

"یہ بنّی دیکھے گی یعنی میں" اور پھر کوئی خطرے کی بات نہیں۔ بس۔"

"منے بھائی آپ چلے جایئے، میں بچوں کی دیکھ بھال کر لوں گی۔" میں نے سہم کر کہا۔

"مگر نانا رات کو چھپ کر یہ بات کیوں کہنے آئے؟" دلھن بھابی نے پوچھا۔

نانا نے کہا تھا "کچھ سوال نہ کرو بس چلے جاؤ" میں چکر میں پڑ گئی ۔

ہم بڑی دیر تک پریشان رہے ۔ میں حسب دستور اسکول گئی ۔ رات کو منی میاں کے ہاں جانے کے لیے انتظار کرتی رہی مگر ان کی موٹر نہ آئی ۔ نہ جانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی تھی ۔ منے بھائی نے نواب صاحب کو عرضی دی تھی کہ "مجھے میرج جانے دیجئے ۔ اپنی بہن اور بچے آپ کے زیر سایہ چھوڑ جا رہا ہوں ۔"

نواب صاحب نے اجازت دے دی اور وہ اسی شام میرج روانہ ہو گئے ۔ نواب صاحب کا سفارشی خط بھی لے گئے ۔ میں حسب معمول دوسرے دن اسکول گئی وہیں منی میاں کی بیگم کی گاڑی آ گئیں وہ بڑے پیار سے ملیں ، کچھ خاموش سی تھیں ، لونڈیاں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ۔ کیوں ؟

مجھے واپسی پر بڑی وحشت ہو رہی تھی ۔ میں کبھی اس طرح اکیلی نہیں رہی تھی ۔ نوکر بھی نیا اور عجب الّو سا تھا ۔ نہ جانے کیوں میں سب بچوں کو ایک کمرے میں جمع کر کے بڑی دیر تک جاگتی رہی ۔

وہی نانا خیریت پوچھنے آئے ، مجھ سے کہنے لگے "بچے سو رہے ہیں مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔"

میں ان کے ساتھ بڑے کمرے میں آ گئی جہاں منے بھائی کا خالی پلنگ ابھی تک بچھا تھا اور دواؤں کی بو آ رہی تھی ۔

"تم بڑی خوش نصیب ہو بیٹی میں تمہارے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں ۔" نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر میں نے بڑی سادگی سے پوچھا ۔

"کیسی خوش خبری نانا ؟"

"تمہیں نواب صاحب اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں ۔"

میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ ایسا ہی کچھ معاملہ ہوگا ۔ مگر چپ رہی ۔

"ان کے صاحب زادے ولایت میں زیر تعلیم ہیں ۔ نواب صاحب شادی کے بعد تمہیں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج دیں گے ، ولایت ۔"

میں پھر بھی چپ رہی کیونکہ بولتی تو نانا کا منہ خشک ہو جاتا ۔

"پرسوں جمعہ کا مبارک دن طے فرمایا ہے حضور نے ۔"

"میری والدہ اور بھائیوں کو ..."

"انھیں تو اس رشتہ پر فخر ہوگا۔ نواب صاحب کہتے ہیں وہ تار سے اطلاع دے دیں گے۔ تم فکر نہ کرو بیٹی ہم موجود ہیں۔ صاحبزادے آئے ہوئے ہیں، نکاح کے بعد ..."

میں دانت بھینچے خاموش بیٹھی رہی۔

"ایک پنتھ دو کاج ان کا خیال ہے نزہت بٹیا کا نکاح بھی اگر چھوٹے صاحبزادے شبو میاں کے ساتھ ہی ہو جائے تو ..."

"مگر اس کے والدین؟"

"حضور ہمارے مائی باپ ہیں۔ انھیں رعایا کا نکاح پڑھانے کا حق ہے۔"

"ذرا سوچو بیٹی تمہارے والد کے انتقال کے بعد اگر تم چاہو تو اپنے خاندان کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہو۔ نواب صاحب بڑے دریا دل ہیں۔ تم پھوپھی بھتیجی راج کرو گی۔ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تم جاورہ کی بہتری کے لیے بہت کچھ کر سکو گی۔ تمہیں معلوم ہے میری پوتی شاہ بانو کا بھی حضور نے مہربان ہو کر بلے صاحب سے نکاح پڑھوا دیا تھا۔ تم نے اس کے چڑھاوے کا زیور تو دیکھا ہی ہوگا۔ ریاست جاورہ کے جواہرات کا بڑی بڑی ریاستیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ایک ایک موتی کبوتر کے انڈے کے برابر ہے۔ نکاح کے بعد تمہارے بڑے بھائی کا قصور معاف کر کے واپس بلا لیا جائے گا۔ منے کی تنخواہ میں اضافہ ہو کر انھیں محل میں رہائش کا موقع ملے گا۔ نواب صاحب ولی عہد سے زیادہ خوش نہیں ان کی انگریز بیگم نے بہت پیر پھیلانا شروع کر دیے ہیں۔ تمہارے والد سرکاری آدمی تھے اور تم جیسی تعلیم یافتہ بہو سے حضور کی پوزیشن مضبوط ہوگی۔"

"تمہارے خاندان کو جاگیریں ملیں گی۔ تم خوش ہو نا بیٹی؟"

میں نے فرماں بردار بیٹی کی طرح سر جھکا دیا۔

نانا چلے گئے۔ میں پتھر کا بت بنی دواؤں کی بدبو میں بسے ہوئے اجاڑ کمرے میں نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ شاہی محل، سونے چاندی کے اگالدان، خاصدان، کبوتر کے انڈے کے برابر سچے موتی، فرش پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

اور انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم کا زریں موقع۔

مگر اس کے ساتھ ایک عدد اجنبی نواب زادہ! اُف!

عظیم بھائی کے کمرے سے ایسی وحشت ہو رہی تھی کہ دو پلنگوں پر ہم سب کھچ پچ سو گئے۔

ہر بچہ میرے پاس لیٹنے پر مصر تھا۔ ماں باپ کے جانے کے بعد وہ میرے وجود میں پناہ لے رہے تھے۔ اگر میں باتھ روم بھی جاتی تو روتے پیٹتے دوڑتے۔ غصہ بھی آتا اور آنسو بھی۔ غصہ حالات پر آنسو اپنی اور بچوں کی بے بسی پر۔

پرسوں یعنی جمعہ کے مبارک دن یہ کھنڈر نما بنگلہ چھوڑ کر ہم محل میں منتقل ہو جائیں گے۔ وہاں اطلس و دیبا کے پردوں میں چھپی گنگا جمنی مسہریوں پر نرم گرم گدّوں پر کیسی میٹھی نیند آئے گی۔ میں نے کبھی سونے کے اگالدان میں نہیں تھوکا۔ جاتے ہی پہلا کام کروں گی کہ غلاموں کو حکم دوں گی۔

"سونے کا اگالدان حاضر کیا جائے۔" اور جب اگالدان حاضر کیا جائے گا تو بڑی شان سے پھٹاک سے تھوک دوں گی۔

پھر؟ پھر کیا کروں گی؟

"پھر؟" ہزاروں گدّوں کے نیچے دبے ہوئے مٹر کے دانے کی طرح چبھنے لگی۔

پھر دھوم دھام سے برات آئے گی۔

دلہن بنوں گی۔

دولہا کے قدموں کی چاپ سُن کر دل دھڑکے گا۔

پھر جب دولہا گھونگھٹ اٹھائے گا۔

اُف میرے حواسوں کی گھگی بندھ گئی۔ میں نے جنسیات پر کوئی مدلل کتاب نہیں پڑھی تھی۔ پالٹیکس، اکنامکس، تاریخ، جغرافیہ، ناول، ڈرامہ، پوئیٹری، سب ہی چبایا تھا مگر ہمارے کالج میں پریکٹیکل جنسیات پر نہ کوئی کتاب تھی اور نہ آپس کی بات چیت میں کوئی حسین نقشہ کھینچتا تھا۔

مجھے کرپوان کی لڑکی منگیا نے بتایا تھا کہ بہت ہی بری چیز ہے شادی۔ دولہا بہت حرامی پن کرتا ہے اور پھر ساری عمر کرتا ہے۔ ایک دفعہ عظیم بھائی بمبئی تلاش معاش میں گئے تھے وہاں سے جو خط لکھتے تھے وہ دلہن بھابی مجھ سے پڑھواتی تھیں یا نیّر سے کیونکہ چھوٹی آپا جو ان کی ہمراز تھیں بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ اس میں کچھ جملے ایسے ہوتے تھے جن کا مطلب دلہن بھابی سمجھ کر لال ہو جاتی تھیں ہم پوچھتے تو کہتیں، بس آگے پڑھو۔ کبھی کھسر پھسر سنائی دے جاتی ایک بیوی دوسری سے کہہ رہی ہیں۔

"بس انہیں تو گندی باتوں کے سوا کسی بات سے دلچسپی نہیں۔ ہر دم جان کو لگے رہتے ہیں۔" یہ وہ اپنے شوہر نامدار کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔

ایک دم شاہی محل کی دیواریں میرا دم گھونٹنے لگیں۔ یہ نواب لوگ طلاق کے قائل نہیں بس زہر دلوا دیتے ہیں۔ اگر عورت چیں چپڑ کرے اور میری تو کسی سے ایک گھڑی نہیں بنتی۔ میں کسی کو خدائے مجازی کیسے مانوں گی۔ برسوں ہوئے نماز بھی پڑھنا چھوڑ دی علی گڑھ تک نماز روزے کا دستور چلا۔ آئی ٹی کالج میں تو عیسائی مذہب پر شدت سے زور دیا جاتا تھا اور چیپل پابندی سے جانا ہوتا تھا۔ ہائے خدائے مجازی اور وہ بھی نواب زادہ۔ کیسے نگلا جائے گا۔ اور نزہت، بھولی بھالی سہمی ہوئی سی رہتی ہے جھینگر تک سے ڈر جاتی ہے۔

اور پھر سونے کا اگالدان: ایسا لگا میں خود بڑا سنہرا اگالدان ہوں اور اس میں تھوکا میرے حلق میں آرہا ہے۔

میں نے نوکر کو جگایا کہ جاکر منّے بھائی کے تانگہ والے سے تاکید سے کہہ دے کہ صبح پانچ بجے تانگہ لے کے آجائے۔ دوگنا کرایہ دوں گی۔ پھر جلدی جلدی دو ٹرنکوں میں سامان ٹھونسا۔ میرا ٹرنک تو تیار تھا ہی وہاں الماریوں میں کپڑے سجانے کا فیشن تو تھا نہیں۔ نزہت مکھن اور مینو کے کپڑے جتنے ملے بھر لیے شکر ہے دھوبی کپڑے دے گیا تھا اور کل میلے کپڑے لینے آنے گا۔ میرے پاس روپے بھی کم تھے۔ اپنا کرایہ نزہت کا ادھا ٹکٹ مکھو چار برس کا تھا۔ گھپلا چل جائے گا عمر سے چھوٹا لگتا ہے اور مینو تو گیارہ مہینے کی ہے۔ ٹھیک سے کھڑی بھی نہیں ہوپاتی۔ ان دو کو نہیں چھوڑ سکتی مجھ سے بہت ہلے ہوئے ہیں۔

تجو، چھبا غافل سو رہے تھے نزہت کو چپکے چپکے جگایا۔ اُسے کچھ نہیں بتایا کہاں جا رہے ہیں۔ پانچ بجے اسٹیشن پر پہنچ کر ٹکٹ لیا۔ میں نے مکھن کو اور نزہت نے مینو کو سنبھالا اور سوار ہوگئے۔ دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ جب رتلام کا اسٹیشن آیا تو جان میں جان آئی۔ نزہت عجیب نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔ میں اس سے آنکھ ملاتے کترا رہی تھی۔ اسے کیا بتاؤں کیسے بتاؤں۔

"پھوپھی جان تجو اور چھبا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"دادا سے کہہ دیا ہے وہ انھیں لے جائیں گے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ وہ چپ ہوگئی۔

ایسا لگتا تھا بنا پتوار کے ناؤ پر سوار ہوگئی ہوں اور پیندے میں سوراخ ہے۔ عجیب دم گھونٹ احساس تھا۔

بعد میں پتہ چلا دادا سے کسی نے جاکے کہا گھر خالی پڑا ہے۔ دو بچے چوکھٹ پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ نوکر گھر کا صفایا کر کے تڑی ہوگیا۔

دادا بچوں کو گھر لے گئے اور اماں کو جو دھچور تار کر دیا۔

میں نے چپ سادھ لی۔ آج تک طے نہیں کر پائی کہ میرے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تھا۔ اور آگے ان تین بچوں کے ساتھ کون سا راستہ کھول پاؤں گی۔

مگر نہ جانے ضدی دل کیوں بار بار کہتا تھا۔ ارے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دنیا میں ایسی کوئی مصیبت نہیں جس کا حل نہ ہو۔

# اُلٹے بانس بریلی

جاورہ سے بریلی پہنچی تو کوئی اسٹیشن پر لینے نہیں آیا تھا۔ میں جن حالات میں جاورہ سے فرار ہوئی تھی تار دینے کی مہلت کہاں تھی۔ مہمانوں میں صرف باجی رام پور سے آئی تھیں۔ چھوٹی آپا حیدرآباد سے آنے والی تھیں مگر دولہا بھائی کو چھٹی ہی نہ مل سکی اس لیے وہ نہیں آ رہی تھیں۔ جودھپور سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ ابھی شادی میں چھ سات دن باقی تھے نیّر مایوں بیٹھ چکی تھی۔ گو انتظار تھا کہ رسم بعد میں سب کے آنے کے بعد ہو گی۔

میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ عظیم بھائی اور دلھن بھابی میرج ٹی بی ہسپتال میں ہیں اور میں دو بچوں کو گھر میں سوتا ہوا چھوڑ آئی ہوں۔ دل بہت پریشان تھا بچوں کی طرف سے۔ آپا کو عظیم بھائی کی بیماری اور بچوں کی تنہائی کے بارے میں ان کی شادی میں ناشادی پھیلانے سے کیا فائدہ۔ مگر جب سوچتی تو دم ٹوٹنے لگتا، ایسی وحشت ہوتی کہ جی چاہتا واپس لوٹ جاؤں مگر واپسی کا خوف اور بھی بھیانک تھا۔

نیّر مجھے کبھی منھ فق سوچ میں ڈوبا دیکھتی تو اسے مجھ پر بڑا ترس آتا۔

"ہائے بہن دیوانی ہو جگنو بھائی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔"

"ارے ہٹاؤ تمہیں شادی کی پڑی ہوئی ہے۔ میں یہ تین بچے کیسے سنبھالوں گی۔"

"کیوں لے آئیں انھیں۔ اور اس گھٹنوں چلتی مینو کو لانے کا کیوں شوق چرایا؟"

"بس تم تو جانتی ہو میں تھوڑی سی پاگل ہوں۔"

"دلھن ممانی اور ماموں جان کیوں نہیں آئے؟"

اُف کمبخت! جی چاہا ایک گھونسا لگاؤں مگر ضبط کر گئی۔

"انھیں چھٹی نہیں ملی۔ ہاں تمہارے دولھا میاں آگئے۔"

"آگئے" بنیز شرمائی۔ "کہتے ہیں ساتھ لندن لے جائیں گے۔" مخمل کی واسکٹ پر سلمے کے پھول ٹانکتے ہوئے کہا۔ اور آنکھوں سے لڑیاں بہنے لگیں۔

"کیوں، لندن جانا نہیں چاہتیں؟"

"لو جانا کوئی اپنے بس کی بات ہے۔"

"کیوں تم انکار کر دو۔ دو سال بعد تو آہی جائے گا۔"

"ان کا وہاں اکیلے دل نہیں لگتا اس لیے تو بیچ پڑھائی میں شادی کر رہے ہیں۔"

"تم خود بھی جانا چاہتی ہو۔ ارے مزے رہیں گے۔"

"میں وہاں مزے کرنے کے لیے تھوڑی جارہی ہوں۔"

"پھر تو بی۔ اے کر ہی ڈالو تمہاری سسرال میں سبھی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ رشتہ کی بہن بی اے بی ٹی ہیں۔ سگی بہنیں تو بس گھر میں ہی پڑھیں اور انھیں زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں پسند بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس کہتے ہیں۔ کوئی نوکری تو نہیں کرنا۔"

"مگر بدر النساء باجی اور۔۔۔"

"وہ ان کی ددھیال والیاں ہیں۔ ننھیال میں بس گھریلو تعلیم امور خانہ داری سینا پرونا بس بہت ہوتا ہے۔"

"چڑیل تو اتنی ذہین ہے تھوڑے ہی نمبروں سے تو تھرڈ پوزیشن میٹرک میں لے آئی تھی پوری یونیورسٹی میں۔ رضی کو تو فخر کرنا چاہیئے اسے تو کبھی فرسٹ ڈویژن بھی نہ ملی ہوگی مت کر باجی سے شادی۔"

"اے بس لگیں بکنے۔ خدا کے لیے منہ سے بھی یہ بات نہ نکالنا۔ ولایت پاس اور پھر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اتنی بڑی جائیداد کا مالک لاکھوں میں ایک ہے۔ اور مجھ میں کیا دھرا ہے۔ ایک سے ایک لڑکی خاندان میں آس لگائے بیٹھی ہے۔"

نیز بے حد جاذب نظر چمپئی رنگ نازک نقشہ معصومیت کا مجسمہ نازک دبلی پتلی جو کپڑا پہن لیتی کھل اٹھتا۔ وہ سب کچھ تھی جو میری تمنا تھی کہ میں ہوتی۔

اور پھر کتنی فرماں بردار بزرگوں کے آگے سر جھکانے والی۔ کھانا پکانے میں مشاق سینے پرونے میں اس کا جواب نہیں۔ کس قدر جاں فشانی سے اس نے اپنا چہرہ سنوارا تھا۔ ایسا کارچوب کا مدانی اور کرنھائی

کا کام کہ بڑے بڑے کاریگر عش عش کرائٹھیں۔ جو دیکھتا تھا اس کے سگھڑپے کے گن گانے لگتا۔ سارے محلے میں اس کے سگھڑاپے کی دھوم مچی تھی۔ مجھ پر ایک دم احساس کمتری پہاڑ بن کر ڈھے پڑا۔

"تم کب کروگی شادی؟" اس نے میرا اترا منہ دیکھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔ جی چاہا بتادوں اگر سر میں کیڑے نہ بھرے ہوتے تو آج شاید اس وقت میں لال جوڑا پہنے گھونگھٹ نکالے بال بال موتی پروئے کبوتر کے انڈے برابر ہیرے کا جگنو پہنے اپنے نواب دولھا کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے بیٹھی ہوتی۔

مگر مجھے ایک دم ہنسی آگئی، میرا اور گھونگٹ کا کیا جوڑ۔ میں نے بات کا رخ موڑا۔

"ابا نے لکھا تھا یہاں کوئی مسلم اسکول ہے لڑکیوں کا وہاں ہیڈ مسٹرس کی ضرورت ہے۔"

"اے ہے پھر نوکری کی جھک سوار ہوگئی۔ شادی نہیں کروگی؟"

"کروں گی بھئی۔"

"کب۔"

"بس تمہارے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں تو جھٹ اپنی برات چڑھوالوں گی۔"

نیر کا منہ پھول گیا۔ اماں ٹھیک کہتی ہیں بے تُکا بجار ہوں۔ اس نے گھڑی دیکھی اور مغرب کی نماز کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بالشت سے مخمل کی صدری ناپنے لگی کتنی پتلی تھی نیر کی کمر.....

دوسرے دن باجی بڑے دولھا بھائی اور مدحت آگئے۔ اور تیسرے دن ممانی جان مع اختر جمیلہ کے آگئیں۔ اسی شام کو اماں بھابی وسیم بھائی اور ان کا بچہ حکیم آگئے۔

اماں نے کھاجانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور میری سٹی گم ہوگئی۔

"نامراد تو چچا کو چھوڑ کے آگئی۔" انھوں نے اکیلے میں پکڑہی لیا۔

"اماں کسی سے کہنا نہیں، سرفراز چچا ملے تو وہ تمھیں بتائیں گے۔ نواب صاحب منے بھائی کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔"

"اے کیا بک رہی ہے۔"

"قسم سے سرفراز چچا نے چپکے سے بتایا، اور نزہت کو حرم میں ڈالنے والے تھے۔ اور مجھے بھی۔"

"اے موئے نواب کو باوے کتے نے کاٹا ہے جو تجھے حرم میں ڈال کے عذاب مول لیتا، میری بات یاد رکھیو تیری بڑی مٹی خراب ہوگی۔"

"اُنھ ہونے دو میری ہی تو مٹی خراب ہوگی۔"

"خاندان کی ناک کٹے گی۔"

"ابا گئے۔ بڑے ابا بھی رخصت ہوئے، پھوپھی بادشاہی سے جھگڑا ہے۔ خاندان میں اب ناک کون سی بچی ہے۔"

"ماموں کسی گنتی میں نہیں۔"

"ارے ماموں سینکڑوں میل جودھپور میں، ان کی ناکیں میری چھریوں تک کہاں پہنچیں گی۔ ہاں اماں منے بھائی کے بارے میں آپا کو نہ بتانا۔"

"اے میں کوئی دیوانی ہوں۔"

نیر کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ آپا نے نزہت مکھن اور مینو کے جوڑے راتوں رات سی ڈالے۔ میں نے ایک سفید شفان کی ساڑی خرید کے اس پہ جھپا جھپ نیر سے ٹھپا اور کرن ٹنکوالی۔ شادی میں بڑے مزے آئے۔ میں قطعی ساس بننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ویسے اختر جمیلہ بھی ساس ہی تھیں۔ سالیوں میں مرگھلی سی نزہت اور تنیا مرچ آٹھ برس کی مدحت تھی۔ لہٰذا ہم نے قطعی سالیوں کا رول سنبھال لیا اور دولہا والوں کی خوب خبر لی۔ رضی کو بھی ناکوں چنے چبوا دیے۔ سمدھنوں کے ساتھ سمدھن بن جاتے اور دولہا اور اس کی بہنوں کے ساتھ سالیاں بن کے ناطقہ بند کرتے۔ نیر کے بھائی مجیب جمیلہ پہ نہ جانے کب سے دانت لگائے بیٹھے تھے۔ دجہیست میں ہم نے لڑکوں کو بھی اندر بلا لیا جھٹ بول کر کہ اجازت ہے۔ ویسے خاندان کا معاملہ تھا زیادہ پردے کا سوال نہیں تھا پھر تو بہت سے لڑکے در آئے اور ان اس شان سے کھیلا گیا کہ جواب نہیں اور چوتھی کے دن تو ہاتھ پیروں کی خیر منائی پڑی بزرگوں کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کی نہ فرصت اور نہ ارادہ۔ بڑی بوڑھیاں بے حد خفا مگر پبلک قطعی بزرگوں کے بس میں رہنے کو تیار نہ تھی جب سکون ہوا اور مہمان رخصت ہوگئے تو الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی مگر گزشتہ رات اور دن اودھم میں ایسا گذرا تھا کہ ڈانٹ نے لوری کا کام کیا اور ذرا سستانے کو گاؤ تکیے پر سر ٹکایا تھا کہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔

شادی میں گرلز اسکول کے منیجر کی بیگم بھی ملیں۔ انھوں نے کہا مہینہ بھر سے اسکول کھلا ہوا ہے۔ مگر ہیڈ مسٹرس کا تقرر نہیں ہوا ہے لوگوں کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہیڈ مسٹرس رکھی جائے اس لیے بس شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی آجایئے۔

تیسرے دن خود منیجر صاحب آئے اور بات طے ہوگئی۔ سو روپیہ مہینہ کوٹھی میں جتنے کمرے چاہوں لے سکتی ہوں۔ بڑا ہوا اسکول ہے دو قدم پر، بس بیچ میں ایک دیوار ہے۔ میں نے اسی دن جاکر چارج لے لیا۔ ہاں ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ چوتھی کے دوسرے دن بھابی نے ایک عدد بچی دے ڈالی ہم لوگ

جاگے تو معلوم ہوا بچی پیدا ہوگئی۔ بھابی نے چوں بھی آواز نہ نکالی۔ اُف بھابی نری گائے ہے نہیں گائے تو بہت اُڑاتی ہے۔ جب تک مہمان رہے میں اسکول سے سیدھی گھر آجاتی۔ جاورے کے اسکول کی اور بات تھی۔ یہاں باقاعدہ آٹھویں تک اسکول تھا۔ میں نے نزہت کو ساتویں میں داخل کرلیا اور منّھو کو پہلی میں۔ دو چار اور چھوٹے لڑکے بھی آتے تھے۔

نزہت اور منّھو نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ ماں باپ کہاں ہیں اور مینو تو بولنا ہی نہیں جانتی تھی۔ یں چھٹیاں عظیم بھائی کے ہاں ہی گذارتی تھی اور پھر جاورہ میں ساتھ رہا تھا۔ بچے میرے گھرے میں ہی سوتے تھے۔ باپ ہمیشہ کے بیمار اور ماں تیماردار۔ بچے ماں باپ سے زیادہ میرے قریب تھے۔

کبھی سوتے میں مکھن چونک کر رو دواتی۔ کو پکارنے لگتا۔ ماں کو دلھن امّی کہتا تھا۔ میرا دل کانپ اٹھتا مگر کیا کرسکتی تھی۔ اماں نے نزہت کو لے جانا چاہا تو میں نے انکار کردیا اور جھوٹ بول دیا کہ منّے بھائی نے کہا ہے اس کی پڑھائی کا نقصان ہوگا۔

"تین بچوں کو سنبھال لوگی۔" میرا خیال تھا وہ مینو اور مکھن کو لے جائیں گی۔

"میں نے کہا ہاں۔

"پھر بیچ میں واویلا نہ مچانا۔ میں کسی کو لینے نہیں بھیجوں گی۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی اگر پڑی تو میں خود ہی پہنچا جاؤں گی۔ منّے بھائی تو اچھے ہوکر آجائیں۔"

شادی کا ہنگامہ ختم ہوگیا مہمان رخصت ہوگئے آپا نے کھانا پکانے کے لیے ایک لڑکا دیدیا۔ بریلی میں کس بلا کی غربت تھی کوڑیوں میں نوکر ملتے تھے۔ دن میں تین چار ماما اور بچی دفتر میں حاضری دیتے۔ مگر اسکول کی ایک غریب مائی تھی میں نے اسے کوٹھی میں جگہ دے دی۔ مہتر وغیرہ تو تھے ہی ایک چپراسی بھی تھا۔

مجیب اور حبیب بھی واپس علی گڑھ جاچکے تھے۔ نیر کی خوب دعوتیں ہوئیں اور وہ بھی آنسو بہاتی انگلینڈ سدھاری۔ میں نے آپا سے کہا۔

"میرے پاس آجاؤ آپا۔ یہاں بس منا (یعنی ان کی ساس) ہیں جو صبح برقع سر پہ ڈال کے پڑوس میں نکل جاتی ہیں۔ سارا دن اکیلی رہتی ہوں۔"

پہلے تو ٹال گئیں پھر میں نے نزہت کو لگادیا ان کے پیچھے۔ وہ نزہت کو بہت چاہتی تھیں۔ دلھن بھابی تو نادان تھیں۔ آپا اور اماں نے نزہت کو پالا تھا۔ آپا راضی ہوگئیں۔ کچھ بستر ساتھ تھے، میں

نے اور خریدنا چاہے مگر آپا کے پاس درجنوں دریاں اور چادریں تھیں سارے برتن بھی انھیں نے دیے۔
میں تنخواہ انھیں دے دیتی ضرورت ہوتی ان سے پیسے مانگ لیتی۔ وہ ضرور اپنے پاس سے بھی خرچ کرتی ہوں گی۔ مہینے کے آخر میں جب میں نئی تنخواہ دیتی تو وہ کچھ بچے ہوئے روپے پکڑا دیتیں، جو بہت ہوتے تھے۔ اور میں اِدھر اُدھر خرچ کر دیتی۔ خرچ کی مجھے زیادہ عادت ہی نہیں تھی۔ پاس ہی ایک سینما ہال تھا کافی اچھا والا۔ منیجر کی لڑکی اسکول میں پڑھتی تھی۔ بہت منع کرنے پر بھی وہ ہر نئی فلم کے ٹکٹ بھجوا دیتے تھے سو روپے بہت ہوتے تھے۔

مجھ سے پہلے جو ہیڈ مسٹرس تھیں وہ کافی بزرگ اور تجربہ کار تھیں حالاں کہ انٹر پاس تھیں لیکن بہت سال کا تجربہ تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ منیجر صاحب نے انھیں اسکول نہیں چھوڑنے دیا۔ مسز مارکس بڑی سخت تھیں اور مجھے ہیڈ مسٹرس صرف اس لیے بنانا پڑا تھا کہ اسکول کو چندہ دینے والوں کا اصرار تھا۔ منیجر صاحب نے مجھے بتا دیا تھا۔

"مسز مارکس بہت خفا ہیں ذرا ان سے ہوشیار رہیے گا۔ انسپکٹریس آف اسکولز مس فلپس سے ان کے بڑے گہرے تعلقات ہیں، عیسائی ہیں نا۔"

نہ جانے میری کون سی رگ ٹیڑھی ہے کہ کوئی مذہب کا اڑنگا لگائے تو بہت جی جلتا ہے قاعدہ سے اسکول کی بہتری کے لیے مسز مارکس کو ہیڈ مسٹرس ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ عیسائی تھیں۔

عجب ضدی طبیعت ہے بد قسمتی سے کہ میں کوئی اچھی رائے بھی دے تو اس کا اُلٹا کرتی ہوں۔ خدا جانے کیوں؟ میں نے مسز مارکس سے چوکس رہنے کے بجائے ان سے بے حد ادب سے بات کی۔ وہ آئیں تو میں کھڑی ہو گئی۔ وہ گھبرا گئیں سمجھیں شاید میں غصہ میں کھڑی ہو گئی ہوں اور اب ان پر رعب جھاڑوں گی۔

"بیٹھیے"۔ میں نے کہا۔

وہ منہ پھلائے بیٹھ گئیں۔

"مسز مارکس، آپ جانتی ہیں نہ مجھے ہیڈ مسٹرس بننے کا تجربہ ہے نہ میں آفس روٹین سمجھتی ہوں۔ آپ کی اور میری تنخواہ برابر ہے یہ زیادتی ہے خیر آپ کا فنڈ جمع ہے اور میں یہاں مستقل رہنے والی نہیں ہوں۔ میرے پیر میں چکر ہے میرا ارادہ اگلے سال ٹریننگ کے لیے باہر جانے کا ہے یہ اسکول آپ کا ہے آپ نے اسے زندگی دی ہے۔ آپ سب کچھ جانتی ہیں میں کچھ نہیں جانتی، میں جھوٹی شان کی قائل نہیں اور میں نے خود کو کبھی کسی مغالطے میں نہیں رکھا۔ اگر آپ میری مدد نہیں کریں گی تو یہ اسکول نہیں چل سکے گا اور میں استعفیٰ دے کر چل دوں گی۔ جودھپور میں میرا خاندان ہے مجھے خوشی سے قبول کرے گا اور کوئی دروازہ نہ ملا تو شادی

بھی خاندان میں کروں گی مگر میں اپنی زندگی فی الحال اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہوں۔ میں گئی تو دوسری مسلمان ہیڈ مسٹرس آجائے گی۔ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

مسز مارکس سناٹے میں رہ گئیں۔ میری آواز میں خوشامد یا نرمی کے بجائے تھوڑی سی دھمکی شامل تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا میں کیا بک رہی ہوں۔

"کسی نے میرے خلاف کان بھرے ہیں آپ کے۔" وہ ذرا کھری آواز میں بولیں۔

"مسز مارکس اگر میرے کان کسی کا کہا سننے کے عادی ہوتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی میں اپنی رائے خود قائم کرنے کی عادی ہوں۔"

"سنا ہے آپ کافی تجربہ کار اور غصہ ور ہیں۔ ہیڈ مسٹرس رہ چکی ہیں کسی ریاست میں۔"

"ہیڈ مسٹرس اور ریاست کے گرلز اسکول میں۔ ایک سال سے بھی کم۔"

"مجھے اس اسکول سے لگاؤ ہے .... لڑکیوں کی تعلیم کی میں شدت سے حامی ہوں۔"

"خاص طور سے مسلمان لڑکیوں سے آپ کو تو زیادہ ہی ہمدردی ہوگی کیوں کہ وہ ہر قوم سے پیچھے ہیں۔"

"یہاں کرسچین لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔"

"مسز مارکس کم سے کم ہم عورتوں کو یہ ہندو مسلم کرسچین کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ میں نے جو بھی علم حاصل کیا ہے وہ کرسچین ٹیچرس نے ہی بخشا۔ ہمارے ملک کے زیادہ تر اسکولوں کی بنیاد عیسائی استادوں نے رکھی۔ اور میرے استادوں نے کبھی میرے ساتھ دوسرے فرقہ کی طالبات سے مختلف برتاؤ روا نہیں رکھا۔ علم کی دولت بانٹتے وقت انھوں نے مجھے صرف طالب علم سمجھا۔ اس اسکول میں بھی زیادہ عیسائی استانیاں۔ دو ہندو ہیں دو مسلمان۔ ایک میں اور ایک رضیہ بیگم جو سلائی وغیرہ سکھاتی ہیں۔"

اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری استانیوں سے میرا منیجر صاحب نے تعارف کرا دیا تھا۔ اس دن ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ میں نے اپنا کھانا گھر سے نہیں منگوایا۔ سب کے کھانے چکھے۔

"آپ تو بالکل ہیڈ مسٹرس نہیں لگتیں۔" مس لال جو سب سے کمسن اور تیز تھی بولی۔

"منیجر صاحب اور چپراسی کے سامنے فرسٹ کلاس ہیڈ مسٹرس لگتی ہوں۔ اور یہاں لڑکیوں کے سامنے میں کچھ لگنے کی کوشش نہیں کرتی۔"

"بہت ڈرتی ہیں آپ سے لڑکیاں۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں لڑکیوں سے ڈرتی ہوں اس لیے چہرے پر رعب طاری کر لیتی ہوں

سیلنٹ ڈیفنس میں یہاں نئی اور بات ہے سب کے سامنے میں آپ سے بھی ڈروں گی اور رعب طاری کروں گی ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ کلاس میں معائنہ کرنے آویں تو ذرا ہوشیار رہیے گا۔ اگر آپ اسی طرح ہنس دیں تو شامت آجائے گی "مس لال بری طرح ہنس رہی تھی چپ ہوئی۔ اس دن سے مسز مارکس نے مجھے تمام رجسٹروں کا اندراج سمجھایا۔ مجھے زیادہ تو دوسری ٹیچر جانتی تھیں۔ جاورے میں ایک رجسٹر تھا اس میں لڑکیوں کے نام لکھے تھے۔ دو کمرے تھے ایک میں سب چھوٹی بڑی امیرزادیاں اور کچھ افسروں کی بیٹیاں صاحبزادیاں بنچوں پر بیٹھتی تھیں۔ ایک میز کے پیچھے کرسی پر میں بیٹھتی تھی۔ دوسرے درجے میں نیچے کلاس کے کلرکوں وغیرہ کی نسبتاً غریب لڑکیاں بیٹھتی تھیں جنھیں ایک بڑی بی قرآن کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔

عجب مسخرہ طریقہ تھا تعلیم کا۔ کچھ کو انگریزی حروف یاد تھے۔ کچھ لکھنا بھی جانتی تھیں کچھ تھوڑے انگریزی کے جملے بھی بول لیتی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی چھٹی جماعت کا کورس پڑھ رہی تھی دو عیسائی لڑکیاں تیسری چوتھی کی پڑھ رہی تھیں میری سٹی گم ہو جاتی تھی کسی کو گنتی بھی نہیں آتی تھی۔

مگر سب کو انگریزی بولنے کا شوق تھا تو بس میں انگریزی بولنا سکھاتی تھی۔ نہایت بدشوق اور کند ذہن لڑکیاں تھیں صرف ایک لڑکی بلا کی ذہین اور طرار تھی شہزادی بیگم بڑی ہنس مکھ کلی طرح کھلتی ہوئی شکل۔ بے حد سج دھج کے آتی تھی۔ خوب گوٹے کے کپڑے، جھکے، گلوبند، جوڑے ہر وقت پہننے کی عادی تھی۔ زیادہ تر کی منگنیاں ہو گئی تھیں چند کے نکاح بھی ہو گئے تھے رخصت کی منتظر تھیں۔

شکر خدا کا کہ مجھ سے بہت ڈرتی تھیں۔

بریلی کی لڑکیاں ان سے لاکھ درجہ بہتر تھیں اور انھیں پڑھنے کا بھی شوق تھا مجھے پڑھانے سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

منیجر صاحب بھی میری کافی مدد کرتے تھے۔ اور پاس ہی جو لڑکوں کا اسکول تھا اس کے ہیڈ ماسٹر صاحب بہت ہی خلیق انسان تھے انھوں نے ایجوکیشن پر بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں۔

ایک دن منیجر صاحب نے کہا "انسپکٹرس مس فلپس معائنہ کرنے آرہی ہیں؟"

میں قطعی متاثر نہ ہوئی تو جل کر بولے۔

"میں نے کیا عرض کیا آپ نے سنا؟" وہ جب غصہ میں ہوتے تھے تو بڑے ادب سے بولنے لگتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے نہایت مخمس انداز میں کہا۔

"ارے صاحب انسپکٹرس آرہی ہیں اور آپ ..." مارے غصہ کے وہ نیلے پڑ گئے۔

"تو آنے دیجیے۔"

"بس! آپ بھی حد کرتی ہیں!"

"آپ اطمینان رکھیے ..."

"خاک اطمینان رکھوں۔ اور اگر گرانٹ بند ہو گئی تو ..."

"منیجر صاحب کیا اسکول میں آپ نے کچھ بدانتظامی دیکھی، کلاسوں میں غل۔ کورس کرٹ۔ لڑکیوں کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی ہے ایک بنچ پر دو کو بٹھانا پڑتا ہے۔ گھڑوں میں میں خود روز پانی بدلواتی ہوں۔"

"یہ کمبخت دفتر ..."

"کیا برائی پیدا کر دی میں نے دفتر میں۔"

"اوہ آپ سمجھتی نہیں۔ آپ کے پاس کچھ تصویریں ہیں۔"

"نمائش میں کھنچوائی تھیں۔"

"افوہ وہ آٹھ آنے کی چار والی دوا بھی نہیں۔ کچھ سینریاں کیلنڈر۔ اچھا آپ فکر نہ کیجیے میں بھجوا دوں گا۔ اور گلدان وغیرہ۔"

"یہاں بھی پھول بہت کھلتے ہیں جو گلدان ہوں گے آپ سے مالی کے لیے کہا ..."

"مالی! ... یعنی مالی! آپ کو معلوم ہے یہ اسکول کیسے چلا رہا ہوں اس کے پیچھے میری وکالت ٹھپ ہو گئی۔ در در بھیک مانگوں یا مؤکلوں سے سر ماروں۔ میری بیوی الگ میرا بھیجا چاٹتی ہے۔"

"تو پھر آپ نے رضیہ بیگم کو بے کار اسکول میں کیوں ٹھونس رکھا ہے۔ وہ کرتی کیا ہیں سر پکڑے بیٹھی رہتی ہیں۔"

"آپ ... آپ بھی رضیہ بیگم کا طعنہ دے رہی ہیں۔ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی میرا خیال تھا تعلیم یافتہ عورتوں کو ... خیر جانے دیجیے جو جی چاہے کہیے۔ میں نے جرم کیا۔ رضیہ کے میاں نے اولاد نہیں ہوئی تو کمبخت کو طلاق دے دی۔ کیا اسے رنڈی بن جانے دیتا۔ آپ ہی بتائیے اس کا کہاں ٹھکانہ ہے کوٹھی کے ایک کونے میں پڑی ہے ... پینتیس روپیہ مہینہ میں اپنی جیب سے بھرتا ہوں۔ بیوی ہزاروں گالیاں دیتی ہے۔ محلہ والے ناک میں دم کرتے ہیں، وہ بدبخت سر پکڑ کے نہ بیٹھے گی تو کیا ناچ رچائے گی۔" ان کی بڑی بڑی خوفناک آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "اور لوگ کہتے ہیں وہ بدکار ہے۔ آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ وہ بدکار ہے اس کے پاس مرد آتے ہیں۔ میں چھپ چھپ کر آتا ہوں۔"

میرا دم گھٹنے لگا۔

"منیجر صاحب ایک بار مجھ پر بھروسہ کیجیے مس فلپس کو آنے دیجیے اس کے بعد یہ معاہدہ سال بھر کا ... میں نے دراز سے اپنا تقرری کا غذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ اپنے پاس رکھیے اسے پھاڑ دیجیے گا۔ بس ..... ؟"

منیجر صاحب کے جانے کے بعد مجھے رضیہ بیگم کا خیال ستانے لگا۔ ہندوستان کی تمام رضیہ بیگمیں میری نظروں کے سامنے گھوم گئیں میرا خون کھولنے لگا در و دیوار پر غصہ آنے لگا۔

یہ وکیلوں کو گرلز اسکول بنانے کا خبط کیوں ہوتا ہے۔ پاپا میاں (شیخ عبداللہ بانی علیگڑھ گرلز کالج) نے بھی اپنی زندگی کا سرمایہ گرلز اسکول کے پیچھے لگا دیا۔ اب یہ عبدالشکور کو بھی وہی مرض لاحق ہو گیا۔ انھیں انعام میں لعنت اور پھٹکار کے سوا کیا ملتا ہے۔ یہی ایک طریقہ قوم کو ان کا احسان ماننے کا آتا ہے۔

میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھا کہ آج جمعہ ہے آدھے دن اسکول ہو گا۔ بڑا کرم ہو گا جو دس منٹ کے لیے مل جایئے۔ بے چارے فوراً آ گئے۔ انھوں نے مالی کو حکم دیا کہ بیس پچیس اچھے پھولوں والے گملے لا کر دو رویہ سجا دو، چھ سات گلدانوں میں پھول لگا کر کل صبح ہی سب کلاسوں میں پہنچا دینا اور اسٹور سے کچھ نقشے کچھ سینریاں لا کر دفتر میں ابھی سجا دو اور ہاں ایک اچھا سا قلمدان بھی لیتے آنا اور میز پوش بھی ہرا دالا یہاں اس میز پر لگا دینا۔ یہ کام تو ابھی کر دو۔ مالی اور چپراسی کے جانے کے بعد بولے۔

"ایک دستہ براؤن پیپر کا منگا کے ان رجسٹروں پر چڑھوا دیجیے۔ بہت بدرنگ ہو رہے ہیں۔ کوئی فکر کی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سب ٹیچرز جٹ گئیں مسز مارکس رجسٹر چیک کرنے لگیں کہ خانہ پری میں تو کہیں لاپروائی نہیں ہوئی۔ آفس خوب ٹھاٹ دار لگنے لگا کلاسوں پر بھی رونق آ گئی اور پھولوں کے گملوں سے تو بہار آ گئی۔

مس فلپس نہایت سانولی پر بے انتہا پرکشش بھرے بھرے جسم کی بردبار خاتون تھیں ناک نقشہ نہایت سبک اور آنکھیں بے انتہا ذہین اور جگمگاتی ہوئی۔ انھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں اجنتا کی بلیک پرنسس یاد آنے لگی۔ میرا دل بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسکول کی ابتر حالت منیجر صاحب کی جدوجہد، مسز مارکس اور ٹیچرز کا خلوص لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی اور ان کی مجبوریاں دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ میں نے اس وقت باقاعدہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا مگر زبان ہمیشہ سے چلتی تھی۔

جب مس فلپس جانے لگیں تو آہستہ سے مجھے قریب بلا کر کہا۔

"آج شام کو میرے ہاں ایک پارٹی ہے، آنا پسند کریں گی؟"

"ضرور ...."

"میں سید سے کہوں گی وہ آپ کو لیتے آئیں گے یہی کوئی پانچ بجے"

سید صاحب ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کوئی کتاب منگوائی انھوں نے کہا ان کے پاس نہیں لائبریری میں ملے گی۔ میں لائبریری کا ممبر نہیں سید صاحب جو آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں ان سے کہیے وہ آپ کو بھی ممبر بنوا دیں گے۔

میں نے چپراسی کو پرچہ دے کر سید صاحب کے پاس بھیجا وہ خود ہی چلے آئے۔

نہایت رومینٹک شکل کے انگلینڈ ریٹرنڈ یاد نہیں کس اچھے عہدے پر تھے۔ ان کی بیوی چھوٹی بی، بے حد بھولی سی صورت کی بڑی ہنس مکھ بیوی تھیں دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ اکثر آنے لگے۔ بے حد گپیں مارتے۔ ہم دونوں قریب پارک میں ٹہلنے بھی جاتے۔ ولایت میں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس نے دل توڑ دیا، بے حد غمگین اشعار یاد تھے، آنکھوں میں رس بھر کے عجیب طرح سے شعر پڑھتے تھے کہ لگتا تھا مجھے مخاطب کر رہے ہیں۔ کبھی رومینٹک سا ظالم والم چپکا کر کہہ جاتے۔ میں نے قطعی نوٹس نہیں لیا کیونکہ اول تو مجھے ان سے عشق عاشقی کا رشتہ جوڑنے سے دلچسپی نہیں تھی، دوسرے مجھے آہیں بھرتے شعر پڑھتے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے عاشق مزاج لوگ زہر لگتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں جب عشق چلتا تھا تو ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور شعر تو میں نے اپنے ماموں، چچا اور بھائیوں کو پڑھتے ہی نہیں سنا۔ ہاں بڑے ابا خود شاعر تھے ہم تو سمجھتے نہیں تھے۔ ان کی موجودگی میں تو بھائی میاں ان کے شعر کان دبا کر سن لیتے تھے ان کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیتے تھے۔

"بہت بور کرتے ہیں بھائی صاحب اور وزن سے گرے ہوئے غلط شعر کہتے ہیں"۔ بس بڑے ابا کے بعد سب شاعروں کو انھیں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔

ایک دن بولے۔

"کبھی کسی سے عشق کیا ہے"

"سینکڑوں دفعہ"۔ میں نے ڈینگ ماری۔

"ایں؟"

"کیوں کیا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے جو کیا؟"

"ایک لڑکی سے کیا، زندگی میں ایک بار"

"بس، ایک دفعہ؟ پھر اور عشق نہیں کیے؟"

"کمال ہے سچا عشق زندگی میں ایک ہی بار کیا جاتا ہے ... محترمہ!"

"کیا سچ زندگی میں صرف ایک بار ہی بولا جاتا ہے؟"

"کیا اتنی بحث کرتی ہو۔ اُف سارا موڈ خراب کر دیا۔"

"سوری!"

اتنے میں نوکر نے آکر کہا کھانا تیار ہے بیوی بلاتی ہیں۔

"چلو آج تمہاری پسند کا گوبھی گوشت پکا ہے تم بھی چلو۔"

"نہیں آپا انتظار کریں گی۔"

"بھولا ان سے کہہ آئے گا کہ ہمارے ہاں کھاؤ گی۔" بھولا میرے گھر کی طرف چل دیا۔

"مجھے بھی ایک بے حد زنانے کا عشق ہو گیا تھا۔"

"اچھا۔ کب؟"

"کوئی دس گیارہ برس کی عمر میں۔"

"اوہ پپی لو۔"

"ارے نہیں تیرہ چودہ برس کی عمر تک چلا۔"

"اچھا۔ اُف کیا حالت ہوتی تھی۔"

"نہ پوچھیے۔ شعر تو سمجھ میں آتے نہیں تھے پر جو شعر ابھی آپ پڑھ رہے تھے۔ وہی دل پر بیتتی تھی۔"

"اور محبوب۔"

"بائیس تیئس برس کا تھا، مغل شہزادہ بے حد سجیلا سنہری بال گچھے کے گچھے، نیلی آنکھیں تھاہ جھیلیں کہ انھیں جھانکنے والا بس ڈوبتا ہی چلا جائے۔ کیا گھوڑے پرتن کے بیٹھتا تھا اور بازہ پھلانگتا تو کلیجہ منہ کو آجائے۔ ایک بات بتاؤں کسی سے کہیں گے تو نہیں ...؟"

"نہیں۔"

"میں اسے دیکھ دیکھ کر گھنٹوں رویا کرتی تھی۔ دل دھائیں دھائیں دھڑکتا تھا۔"

"اور اس کا کیا حال تھا؟"

"اُسے خبر بھی نہیں تھی۔"

"ہت تیری کی، لعنت ہے۔ تم نے حالِ دل کہا کیوں نہیں؟"

"ارے بڑا غصیل تھا۔ مجھ سے بارہ پندرہ برس بڑا۔ چپتیں لگایا کرتا تھا۔"

"بھلی مانس اظہار عشق تو کیا ہوتا۔"

"ارے آپ نہیں جانتے ایسا جناتی غصہ تھا ہم سب بچے اس سے کانپتے تھے۔ اظہار عشق۔ ہنہ وہ زور کا جھانپڑ مارتا کہ دانت حلق میں جا گرتے۔ ویسے خوابوں میں بڑا نرم پڑ جاتا تھا۔ ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ کبھی میرا گھونگٹ اٹھاتا۔ کتنی بار آرسی مصحف کے وقت بیچ میں قرآن رکھا ہوتا اور آئینے میں اس کی نیلی نیلی آنکھیں مسکرائیں! اُف سارا جسم پسینے میں ڈوب جاتا۔"

"پھر؟"

"پھر وہ چوتھی بار جب میٹرک میں فیل ہوا تو بمبئی بھاگ گیا۔ سنا کسی ہیروئن سے شادی کر لی۔"

"کیا نام تھا؟"

"شاہزادہ میرزا داؤد بیگ برلاس!"

"پھر ملاقات ہوئی؟"

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہوئی، مگر میرا دل کہتا ہے مرنے سے پہلے ایک بار ضرور وہ گہری گہری نیلی جھیلیں وہ ریشمی بال وہ چوڑا سینہ۔ بس ایک بار اس کے شانے پر سر رکھ کر صرف دو بوند بہا دوں گی اور کہوں گی۔ ارے کیا کہہ سکوں گی؟"

"قبلہ بھائی صاحب، چلیے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس دن سے سید صاحب مجھے ہمیشہ بھائی صاحب کہتے تھے۔

جب گھر پہنچے تو سید صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے مجھے روکا مگر میں باورچی خانہ میں چلی گئی۔ چھوٹی بی چولھے کے پاس جھکی کچھ کر رہی تھیں مجھے دیکھ کر کچھ بوکھلا گئیں پٹے میں کچھ پکڑے تھیں۔ وہ جلدی سے چھپا دیا۔ میں نے سلام کیا تو روکھا سا جواب دے کر منھ پھیر لیا۔

میں سمجھ گئی ان پر کیا بیت رہی ہے۔ میں ان کے شوہر کے ساتھ پارک میں گھوم کر قہقہے لگاتی چلی آ رہی ہوں۔

"چھوٹی بی!" میں نے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر پکارا۔

"جی۔" وہ منھ موڑے رہیں۔

"اوہو، آج آپ میرا بہت ادب کر رہی ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولیں۔

"یہ چمٹے میں پکڑے کیا جلا رہی تھیں ؟"

"کچھ ... کچھ نہیں "

"چھوٹی بی ۔ایک راز کی بات ہے کسی سے کہیں گی تو نہیں "

"راز کی بات ۔کیسا راز ؟ "

"آپ کے میاں کو عشق ہو گیا ہے "

وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگیں ۔

"اور آپ کچھ نہیں کہتیں ؟ "

"کیا کہہ سکتی ہوں ۔میں ان سے کہہ چکی ہوں دوسری شادی کر لیں ۔بچہ میرے نصیب میں نہیں "

"مگر آپ کے بچہ ہوا تو تھا ۔جیا نہیں تو اس میں آپ کا کیا قصور ۔آپ بانجھ نہیں ۔مجھے ان عورتوں سے سخت نفرت ہے جو سَتی درتا بن کر میاں کی شادی کرا دیتی ہیں ۔میری باجی کے بھی بچہ نہیں ہوا انھوں نے بھتیجی گود لے لی ۔آپ کوئی بچہ کیوں گود نہیں لے لیتیں "

"لیکن اگر انھیں کوئی دوسری پسند آگئی ہے تو "

"تو آپ ان سے طلاق لے لیجیے "

"ہائے اللہ ، کیا دیوانوں جیسی باتیں کرتی ہو "

"اگر عورت ایک مرد سے زیادہ شوہر نہیں رکھ سکتی تو مرد کو بھی ایک سے زیادہ عورت رکھنا حرام ہے "

"کیا جہالت کی باتیں کر رہی ہو ۔مردوں کو چار ... "

"میں اپنے میاں کو ہرگز چار نہیں کرنے دوں گی ۔فوراً طلاق لے لوں گی "

"اس کی پہلی بیوی ... " وہ ہکلائیں ۔

"جس کے پہلی بیوی ہو گی اس سے شادی میں حرام کاری سمجھتی ہوں "

"مگر انھیں تو اس سے محبت ہے ۔میں انھیں دکھی نہیں دیکھ سکتی "

"مت جی چاہتا ہے تمہارا منہ توڑ دوں ۔کیا پرانی سڑی باتیں کر رہی ہو ۔اگر تم کسی اور مرد پر عاشق نہیں ... " چھوٹی بی غصے سے لال ہو گئیں ۔"تو طلاق لے لو "

"تاکہ وہ اطمینان سے شادی کر سکیں "

اُف یہ کیا کہہ گئیں ۔میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا ۔میں نے چپ کر چمٹا اٹھایا اور اس میں چپکا

تعویذ لے کر آگ پر رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے یہی ہو گا کہ جوں ہی تعویذ جلے گا آپ کی نامراد رقیب بھسم ہو جائے گی۔"

تعویذ جل کر راکھ ہو گیا اور میں بھسم نہیں ہوئی۔

"دیکھا چھوٹی بی بی میں بھسم نہیں ہوئی۔"

"تعویذ گنڈے والے ٹھگ ہوتے ہیں۔"

"نہیں، یہ بہت پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی بی کیا تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو کیا میں اندھی ہوں تم مجھ سے اتنے پیار سے بولتی ہو، میرے لیے خربوزے کی برف بناتی ہو آج میری پسند کے دہی کے پسندے بنائے ہیں۔ سچ بتاؤ کیا یہ اپنے میاں پر احسان کرنے کے لیے کرتی ہو یا ...؟" مجھے غصہ آنے لگا۔ "اگر میں کسی مرد سے کھلے دل سے ملتی ہوں قہقہے لگاتی ہوں تو وہ مجھے ایسے کیوں دیکھنے لگتا ہے جیسے ... جیسے۔ اوہ تمہیں کیا بتاؤں مجھے مردوں سے بے تکلفی سے ہنسنے بولنے میں کوئی عذر محسوس نہیں ہوتا۔ میرا اتنا بڑا خاندان ہے بہت سے نوجوان لڑکے ہیں۔ ہم آپس میں لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں بحثیں کرتے ہیں۔ اس لیے یہ تو میری عادت ہے۔ مجھے ذہین حاضر جواب دلچسپ مرد بہت پسند ہیں۔ تیز طرار منہ پھٹ لڑکیوں سے بھی میری بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔ مس فلپس کے لائے فرینڈ پرتھوی سنگھ سے میری جملہ بازی چلتی ہے۔ وہ میری ٹیگ پلنگ کرتا ہے میں اس کی۔ مس فلپس قہقہے لگاتی ہے۔ ان سے میری ایک دن پرتھوی سنگھ کے بارے میں بات ہوئی کہنے لگیں۔ بڑی پتی ورتا بوراں پڑھ بے زبان عورت ہے۔ پرتھوی بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ ہماری بڑی دلچسپ قسم کی دوستی ہے۔ لوگ جو چاہیں سمجھیں میں پروا نہیں کرتی۔"

"ارے مس فلپس تو اس کے سنگ سوتی ہے۔"

"انھو آپ کی بلائے آپ نے سنگ تو نہیں سوتی۔ اور چھوٹی بی کیا ثبوت ہے۔ جب سید صاحب چلے جاتے ہیں تو آپ چھوٹے خال کے ساتھ ..."

انھوں نے چولھے میں سے چیلا اٹھایا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"ارے بھئی کیا آج بھوکا ہی مارنے کا ارادہ ہے۔" سید صاحب نے ہانک لگائی۔

کھانا بے حد مزے کا تھا۔ میرے دماغ میں خاندانی بدذاتی کا کیڑا رینگا۔

"ارے سید صاحب آپ کو معلوم ہے پرنسپل صاحب بے چارے ... چہ چہ۔"

"کیا ہوا انھیں؟"

"بال بچوں والا آدمی، بیوی کا پاؤں بھر بھاری ہے۔ اور بے چارہ ... چہ چہ ... سمجھ میں نہیں آتا

کیا ہوگا غریب روز میرے پاس آکر روتا ہے ۔"

" کون صدیقی، کیا باتیں کر رہی ہو۔ وہ تو ... مگر روتا کیوں ہے ۔"

" آپ کو نہیں معلوم .... مگر آپ کو معلوم بھی ہو تو، خدا قسم کیا چکر ہے آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

" کیا بکواس کر رہی ہو جانے ۔"

" آپ بنیے مت جیسے آپ کو پتہ ہی نہیں عشق اور مشک، کہیں چھپتا ہے۔ مگر یہ محترمہ دیکھنے میں کیا بھولی شکل کہ توبہ، مگر سینے میں دل نہیں پتھر۔" میں نے شکایتاً چھوٹی بی کو گھورا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

" تم ..... تمہارا دماغ تو سلامت ہے۔ میں ....." چھوٹی بی غصہ سے آگ بگولہ ہو گئیں:

" اُفوہ تو تمہارا کیا قصور تمہاری صورت کسی کو لوٹ دے گی تو اس میں تمہارا کیا قصور اور ستم یہ کہ تمہیں پتہ بھی نہیں کہ صدیقی صاحب نیم پاگل ہو رہے ہیں۔"

" کس نے کہا؟ " سید صاحب کے حلق میں نوالہ اٹکنے لگا ۔

" بے چارے خود روز حال دل سنانے آتے ہیں۔ دیکھیے سید صاحب شریف آدمی ہے۔ زبان سے یا اشارے کنایہ سے کبھی کسی کو پتہ چلنے نہ دیا۔ وہ ایک نیک پارسا اور مقدس خاتون کو بدنام نہیں کرنا چاہتے ۔"

" تم سے خود صدیقی نے کہا ۔"

" ہاں روز آتے ہیں شام کو ۔" بے چارے مجھے ایجوکیشن کے متعلق مختلف نوٹس دینے آتے تھے۔

" ہاں دیکھا تو ہے کئی بار۔ مگر ..." وہ بھنائے ۔

" دیکھیے سید صاحب وہ شریف آدمی ہیں۔ اگر آپ غنڈہ گردی پر اتر آئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔"

" مگر آپ گواہ ہیں ۔"

" میں ؟ .... بھئی میں صاف مکر جاؤں گی۔ اگر آپ نے پوچھ کچھ کی حماقت کی تو فساد کھڑا ہو جائے گا۔ میں تو جھینپ اں ہوتے ہی اڑ جاؤں گی اگر بات پھیلی تو آپ کی ہی بدنامی ہوگی ۔"

سید صاحب کا منہ فق تھا۔ مگر چھوٹی بی کے چہرے پر ناگواری کے بجائے عجیب سا تاثر تھا۔ کچھ حیرت کچھ بناوٹی غصہ!

اس دن کے بعد نہ جانے کیا بات تھی کہ سید صاحب میں اور چھوٹی بی زیادہ وقت ساتھ ہی گذارتے۔ ہم دونوں بکواس کرتے رہتے وہ ہماری خاطریں کرتی رہتیں۔ آپا بھی جب وہ اکیلے

آتے تھے تو بے حد کھری باتیں کرتی تھیں۔ چھوٹی بی کے ساتھ آنے لگے تو بیحد نرم پڑ گئیں۔

میں جب بریلی سے علی گڑھ جانے لگی تو خوب دعوتیں ہوئیں جن میں صدیقی صاحب، سید صاحب اور چھوٹی بی بھی شریک ہوئے۔

میں نے کبھی کسی کو اس پھلجھڑی کی تفصیل نہیں بتائی جو میں نے بغیر کسی ارادہ کے بے ساختہ چھوڑ دی تھی۔

# تالے

میری ضیا سے ملاقات عجیب افسانوی انداز میں ہوئی، جب کہ اس قسم کے افسانوں کی حدوں کو میں اپنی دانست میں پار کر چکی تھی ظفر قریشی جن سے یونہی اچنتی ہوئی ملاقات شاہد احمد دہلوی کے ہاں ہوئی تھی۔ جودھپور جانے کے لیے میں پہلے علی گڑھ پھر وہاں سے دہلی جاتی دو چار دن وہاں رہ کر جودھپور روانہ ہو جاتی۔ انھیں معلوم تھا کہ میں لکھنؤ میں پڑھ رہی ہوں وہ اکثر کتابیں بھیجا کرتے کسی اچھے مضمون کا تراشہ بھی بھیج دیا کرتے۔ انھوں نے میرا پتہ نہ جانے کسی انگریزی میگزین میں چھپوا دیا۔

میرے پاس بہت سے خط آنے لگے نہایت واہیات قسم کی تصویریں اور مغلظات۔ میں نے انھیں ڈانٹ بتائی کہ میرا پتہ فوراً بدلوائیں اور کوئی جھوٹا پتہ لکھ دیں۔ پھر میں نے خود ہی اس میگزین کو اپنا نہایت پیچ دار غلط سلط پتہ بھیج دیا اور اس طرح ان خطوط سے میرا پیچھا چھوٹا اور ظفر قریشی سے بھی خط و کتابت بند ہو گئی۔

اس بات کو سال سے زیادہ گزر گیا میں جاورہ سے بریلی آگئی تھی کہ ایک دن مجھے ایک نہایت خوبصورت لفافہ میں بے حد عمدہ ٹائپ کیا ہوا بڑا مہذب سا خط ملا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو شعلہ طور کی ایک جلد ملی۔ میں نے شکریہ کا ایک خط لکھ دیا۔ ضیا کے خط روز آنے لگے ان میں شاعروں کا ذکر ہوتا، خاص طور پر جگر مراد آبادی اور مجاز کا کہ وہ ان کے بڑے عزیز دوست ہیں اور جگر صاحب پیر و مرشد۔ پھر انگارے کے بارے میں ہماری خط و کتابت ہوتی رہی۔

میں بھی ہفتہ میں دو خط لکھنے لگی، ہماری خط و کتابت انگریزی میں چلتی رہی۔

کچھ دن بعد انھوں نے لکھا کہ انھیں بریلی میں کچھ کام ہے دو دن ٹھہریں گے اگر میں انھیں اسٹیشن پر مل جاؤں تو ساتھ لنچ کھائیں گے۔ مگر ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے کیسے ؟

ضیا نے بڑی سادگی سے لکھا کہ وہ گیارہ بجے کی گاڑی سے پہنچیں گے اور فرسٹ کلاس کے ڈبے سے سرمئی سوٹ میں اتریں گے ان کے ہاتھ میں اخبار ہوگا۔ اور گر میرے ہاتھ میں گلاب کا پھول ہوگا اور میں فیروزی ساڑی پہنے ہوں گی تو ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔

میں نے اسی سال اپنا پہلا ڈرامہ "فسادی" لکھا تھا جو ساقی کے سالنامے میں خاصے اہتمام سے چھپا تھا اور ایک کہانی "نیرا" بھیج چکی تھی ساقی کے لیے، تیسری کہانی "گیندا" قریب ختم تھی۔ نہ جانے میں نے کیوں لکھنا شروع کر دیا تھا اور میں سمجھتی تھی کہ شاہد صاحب چوں کہ عظیم بھائی کے دوست ہیں مروت میں چھاپ دیتے ہیں لیکن جب ان کے تقاضے کے خط آئے تو میں نے اور لکھنے کی کوشش کی اور چوں کہ "گیندا" میں نے "نئے ادب" کو بھیج دی تھی جو ان دنوں شاید لکھنؤ سے نکلتا تھا۔

ایک تو کام کی ذمہ داریاں پھر پارٹیاں، دعوتیں، سینما۔ کتنے ہی چکر تھے پھر پڑھنے کی عادت کہ رات کو بغیر کتاب ہاتھ میں پکڑے نیند ہی نہیں آتی۔ آج بھی میں خواہ رات کے کتنے بج جائیں خواہ لکھنے کا کام جاری ہو سونے سے پہلے دانت مانجھ کر کوئی کتاب ضرور پڑھتی ہوں چاہے وہ میرے نواسے کی کامک ہی کیوں نہ ہو۔

پھر بھی مجھے لکھنے میں ایسا ہی لطف آنے لگا جیسے پڑھنے میں آتا ہے۔ ہمارا سارا خاندان ہی باتونی ہے اور میرا نمبر کچھ زیادہ بولنے والوں میں آتا ہے۔ لکھتے وقت مجھے ایسا لگتا جیسے پڑھنے والے سامنے بیٹھے ہیں ان سے باتیں کر رہی ہوں اور وہ سن رہے ہیں۔ کچھ میرے ہم خیال ہیں کچھ معترض ہیں کچھ مسکرا رہے ہیں کچھ غصہ ہو رہے ہیں۔ کچھ کا واقعی جی جل رہا ہے۔ اب بھی میں لکھتی ہوں تو یہی احساس چھایا رہتا ہے کہ باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ باتوں میں قصے سناتے ہیں ویسے ہی میں بھی کسی واقعہ کو سنا رہی ہوں۔ جیسے لوگ ساتھ میں اپنی رائے بھی چپکاتے جاتے ہیں ویسے میں بھی کہانی کے کرداروں اور واقعات پر رائے زنی کرتی جاتی ہوں۔

یہ لیجیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میرے پاس کوئی نیلی ساڑی نہیں تھی اور صرف شناخت کے لیے نیلی ساڑی خریدنا حماقت معلوم ہوا۔ اور گلاب کے پھول اسکول کے باغیچے میں نہایت بھونڈی قسم کے کھلے تھے۔ پھول پکڑے ملکہ نورجہاں تک احمق لگتی۔ اور گیندے کے پھولوں کی خوشبو سے سر میں

درد ہونے لگتا تھا۔ آپا کی کیاری میں بڑی سیوا کے بعد دو مرگھلے پیارے کاسنی رنگ کے کسی انگریزی نسل کے پھول کھلے تھے۔ اول تو انھیں توڑنا جان پر کھیلنے سے کم نہ تھا۔ آپا صبح شام ان کو وضو کا متبرک پانی پلاتی تھیں۔ دوسرے وہ توڑنے کے بعد اگر گلدستے میں پانی ڈال کر نہ سجائے جائیں تو دو منٹ میں نڈھال ہو کر گردن ڈال دیتے تھے۔ اب میں آتنی بھی نشے میں چور نہ تھی کہ گلدان لے کر ہیرو کی جستجو میں اسٹیشن کا پلیٹ فارم ناپتی۔ مگر فرسٹ کلاس سے جو سرمئی سوٹ پہنے اخبار ہاتھ میں لیے اترا اسے دیکھ کر میں نمک کا تھمبا بن گئی۔ بالکل ہوبہو جگنو، وہی بیحد گھونگھر والے ڈھیروں بال، چی چی سی آنکھیں، کھلا دہانہ، گورا گندمی رنگ۔ پر آخری بار جگنو کو دیکھا تھا تو دبلے تھے بس جسم بھر گیا تھا، بیحد سلیقے سے۔

میں ایسے سناٹے میں انھیں دیکھ رہی تھی کہ ضیا مسکراتے ہوئے سیدھے میری طرف بڑھے۔

"آداب عرض"

"آداب عرض" نہیں یہ جگنو نہیں، ضیا تھے۔ جن کی مسکراہٹ میں عذر نہیں اعتماد تھا۔ ہم دونوں فوراً بے تکلفی سے باتیں کرتے ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے نیلی ساڑی اور گلاب کے پھول کی روداد سنائی تو ضیا نے اتنی زور سے قہقہے لگائے کہ پلیٹ فارم پر لوگ چونک پڑے۔ اتنے اونچے قہقہے صرف ابّا میاں کی محفلوں میں ان کے دوست احباب لگایا کرتے تھے۔ یا بہت سال ہوئے ایسا قہقہہ میں نے اپنے باورچی خانہ میں سالن بھونتے ہوئے سنا تھا اور قہقہہ نمبر ۵ انڈس کورٹ سے آرہا تھا جس کے باورچی خانہ کی کھڑکی میرے سامنے تھی۔ اس قہقہہ نے کتنی پرانی یادیں جگا دیں۔ بمبئی میں لوگ دل کھول کر اس دھماکے سے نہیں ہنستے کہ پڑوسی چونک پڑیں۔

مجھے تجسس نے بہت اکسایا تو نمبر ۵ جس میں راج بیدی رہتے ہیں جانا پڑا۔

"ارے بھئی راج یہ تمہارے ہاں کون اتنے جاندار قہقہے لگا رہا ہے۔" میں نے ہولے سے پوچھا۔

اور قہقہہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ گورا چٹا۔ گھنے سیاہ بال، بھرا ہوا جسم۔

"یہ موہن راکیش ہیں۔" ساریکا کے ایڈیٹر۔

"خوب اپنی آمد کی اطلاع آپ پاس پڑوس والوں کو اس انداز سے دیتے ہیں۔" اور موہن راکیش نے پھر شاہی قہقہہ لگایا۔ ایسا لگا میں انھیں برسوں سے جانتی ہوں۔

اُف میں ضیا کے ذکر پر یوں کی تی کیوں کاٹنے لگتی ہوں؟

لنچ ہم نے اسٹیشن کے ریسٹوران میں کھایا۔ پھر تانگہ میں بیٹھ کر ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ لائبریری میں جا بیٹھے۔ ضیا کو ہزاروں شعر از بر تھے میر، ذوق، غالب، سودا، اقبال، جوش، جگر، اختر شیرانی، مجاز کے اشعار مجھے

نہایت معمولی باتیں حرف بہ حرف یاد رہتی ہیں خصوصاً مکالمے بار بار کانوں میں گونجا کرتے ہیں لیکن اشعار بڑی مشکل سے یاد رہتے ہیں ان کے معنی یاد رہ جاتے ہیں۔ میں انھیں معنی یاد دلاتی۔

"وہ کیا شعر ہے غالب کا ہوتا ہے تماشہ۔۔"

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے"

ضیا فوراً شعر ہی نہیں پوری غزل سنا دیتے۔

"اور وہ مریم کا بیٹا، کیا ہے وہ۔۔۔" میں نہایت غیر شاعرانہ انداز میں پوچھتی۔

"ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی"

"اور وہ جنت سے نکالے جانے پر۔۔۔" میں نہایت پھوہڑ پن سے پوچھتی۔

"نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے"

میں نے اپنی یادداشت پر خود کو شاباشی دی۔

اسکول کالج میں بیت بازی میں کوئی پارٹی مجھے لینے پر رہنی خوشی راضی نہیں ہوتی تھی کیونکہ مجھ پر آکر ہمیشہ پارٹی کی ہار ہوتی تھی۔

"آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟" وہی ترپ کا اکا۔ جی چاہا وہی جواب دوں! ہزاروں مرتبہ میں بے انتہا زود اثر ہوں۔ بڑی شدت سے حملہ ہوتا ہے۔ چند گھنٹوں کی صحبت میں ہی ایسا لگ رہا تھا برسوں سے ضیا کو جانتی ہوں اور اس جنم بھر جانتی رہوں گی۔ اگلے جنم کا کیا بھروسہ۔ خاندان والوں اور دوست احباب کا اندازہ ہے کہ موجودہ جنم کے اطوار دیکھتے ہوئے بندریا بلی کے روپ میں اگلا جنم ہوگا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مجھے ان دونوں جانوروں سے ہمیشہ انس رہا ہے اور زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی کچھ صفات کام آجاتی ہیں۔ بندر کی چالاکی اور بلی کا انداز مدافعت۔

میں نے یونہی داؤد بھائی کا ذکر کیا۔

"بچالو" انھوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

"بالکل یہی رائے سید صاحب کی ہے۔"

"کون سید صاحب، وہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر۔"

"آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں بہت اچھا گاتے ہیں۔"

"تو بس رات کا کھانا ان کے یہاں۔"

"نہیں، آج کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جائے گا۔ ہاں تو بس اور کوئی بھرپور محبت، کوئی دل کا داغ، کچھ ٹھنڈی آہیں۔ وہ آپ کے کزن جن کا آپ نے کئی خطوں میں ذکر کیا، وہ بمبئی میں ڈاکٹر ہیں۔"

"اوہ جگنو۔"

"ہاں ہاں، ان سے تو بچپن سے لیلیٰ مجنوں والا معاملہ رہا ہوگا۔"

"خاک۔"

"اندھیرے اجالے پکڑ دھکڑ، دو چار میٹھے پیار۔"

"کبھی نہیں۔"

"آپ کے چہرے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"نہیں، اس وقت جھوٹ کا موڈ نہیں بلکہ مجھے تو شکایت ہے۔"

"بڑا بد مذاق آدمی ہے۔ آپ کو اس سے محبت ہے؟"

"یہ بھی پتہ نہیں۔ میں آج کل سائیکالوجی پر بہت پڑھ رہی ہوں۔ اور خود اپنی انالی سس کر رہی ہوں۔"

"کچھ پتہ چلا۔"

"یہی کہ بہت بچپن سے دماغ میں یہ بیٹھ گیا کہ جسمانی پیار گندہ ہے۔"

"اف وہ، مگر اب تو بچپن گیا، اور . . ."

"پھر ایک اور بھوت سوار ہو گیا کہ سب کہتے ہیں تعلیم پا کر لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں میں یہ ثابت کرنے کی دھن میں لگی ہوں کہ یہ غلط ہے۔"

"اور ذہنی چوکیدار بٹھا دیے ہیں۔"

"ہاں اور ان کو بڑی تنخواہ دے رہی ہوں۔"

"آپ کو کبھی کسی نے پیار نہیں کیا۔"

"ایک دفعہ ایک چھوٹے سے بدذات کزن نے کیا تھا۔"

"گال پر۔"

"نہیں ہونٹوں پر۔"

"کیا محسوس ہوا۔"

"سنانے میں رہ گئی، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُف مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔"

"پکڑ لیا۔ ہاتھ ملاؤ"

"کیا پکڑ لیا؟"

"یہ ڈرامہ سازی جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں مکر رہی ہوں۔"

"میں کہاں مکر رہی ہوں۔"

"کیا اب بھی جسمانی پیار کو گندہ سمجھتی ہو۔"

"نہیں بلکہ اسے ایک ذہنی بیماری سمجھتی ہوں جو ماحول کی پیداوار ہے۔ میں نے بہت عورتوں سے پڑھنے کے بعد، تجربہ کے لیے سوال کیے۔ آج تک مجھے کوئی ایسی عورت نہیں ملی جس نے اقرار کیا ہو کہ جسمانی ملاپ میں اسے لذت ملتی ہے۔ سب یہی کہتی ہیں کہ ان کے شوہر ان کی جان کو لگے رہتے ہیں۔"

"بدنصیب شوہر۔" ایک دم ضیا کا چہرہ اتر گیا۔ "پھر اگر شوہر دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا کیا قصور۔ ایسی بیویوں سے تو رنڈیاں اچھی۔"

"مگر مجھے رنڈی نے بتایا کہ اسے اس فعل سے گھن آتی ہے۔ گاہک کو بھانے کے لیے وہ ایکٹنگ کرتی ہے۔"

ضیا اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

"خدا کے لیے یہاں سے چلو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

ہم باہر نکلے تو ایک دم موڈ بدل گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک مداری کھڑا دونوں ہاتھوں میں دو گڑیاں پکڑے تماشہ دکھا رہا تھا۔

"اختوں نے پکائیں بڑیاں، بختو نے پکائی دال۔"

"اختو کی بڑیاں جل گئیں۔ بختو کا برا حال، جھگڑے لال پڑیں گے جھگڑے لال۔۔۔"

وہ دونوں گڑیوں کو آپس میں لڑانے لگا۔ چاروں طرف کھڑے بچے کلکاریاں مارنے لگے۔ مجھے بھی بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ بار بار دہراتا اور گڑیوں کی اتنی دلچسپ کشتی دکھاتا کہ دیکھنے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ضیا نے جیب سے پانچ روپیہ کا نوٹ نکالا اور بازیگر کو دے کر جلدی سے مجھے گھسیٹ کر قریب کھڑے تانگے میں بیٹھ گئے۔ بازیگر ہکا بکا کبھی نوٹ کو کبھی ضیا کو دیکھتا رہ گیا۔

ہم ایک سینما گھر میں گھس گئے انگریزی کی کوئی فلم تھی۔ یاد نہیں کون سی تھی ضیا کا ہاتھ بار بار کرسی کے ہتھے پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ سے چھو جاتا اور پردہ سیمیں پر دھند چھا جاتی ضیا کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے ملائم لمبی لمبی انگلیاں سڈول بادامی ناخن میں نے اتنے خوبصورت ہاتھ صرف ایک انسان کے دیکھے تھے، جگنو کے۔

"تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنے۔" میں نے ضیا سے پوچھا۔

"بس بنتے بنتے رہ گیا۔ شاعری کے چکر میں سائنس چھوڑ کر آرٹس لے لیا۔"

"ڈاکٹروں کی انگلیاں لمبی ہونی چاہئیں آپریشن میں سہولت ہوتی ہے۔"

"کیا جگنو کی انگلیاں لمبی ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ؟" ہم نہ جانے کیسے ایک ہی دن میں آپ سے تم پر اتر آئے تھے۔

"تم نے۔"

"ارے میں نے تو جگنو کا ذکر بھی نہیں کیا۔"

"پھر میرے ہاتھ دیکھ ڈاکٹر کیوں یاد آئے ؟ تمہارے اوپر جگنو سوار ہے۔"

"اُفوہ قطعی نہیں۔ ہم ساتھ پلے بڑھے بچپن میں میں اسے اپنا ساتواں بھائی سمجھتی تھی بہت دن بعد معلوم ہوا کہ وہ بڑے ماموں کا لڑکا ہے۔"

"یہ بھائی بنانے والی عادت نہایت فرسودہ ہے۔ جو عورتیں مردوں کو بہت بھائی بھائی کہتی ہیں سخت آوارہ ہوتی ہیں۔"

"میں نے تمہیں تو بھائی نہیں کہا۔"

"ذرا بھائی کہہ کے تو دیکھو۔" ضیا نے میرے گلے پر انگوٹھا رکھ کر آہستہ سے دبایا پھر ہاتھ سرک کر گال پر آ گیا۔

"شی !" کسی نے ہماری کھسر پھسر سے چڑھ کر کہا اور ہم فرماں بردار بچوں کی طرح فلم دیکھنے لگے جس کا آگا پیچھا غلط ملط ہو گیا تھا۔

فلم کے بعد ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گئے۔ بریلی کا بہترین ہوٹل۔ نہ جانے کیا نام تھا۔ کھانے کے درمیان سیاست چھڑ گئی ضیا پکے پاکستانی ہیں کھری کانگریسی، کچھ ہلکا گلابی رنگ بھی رشیدہ آپا کی صحبت میں جھلکنے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ملک آزاد ہوگا تب کانگریس سوشلزم ہی لاگو کرے گی۔ کیونکہ گاندھی جی تو عام انسان کے رہنما ہیں۔ وہ ہریجنوں کو جینے کا حق دلائیں گے بُنائے، انہوں نے بھنگیوں

کی بستی میں سب کے ساتھ کھانا کھایا ان کے ساتھ بڑے بڑے لیڈر تھے۔ یہ انگریز چلے گئے تو ہندوستان بہشت بریں کا نمونہ بن جائے گا۔ مسٹر جناح ملک کا بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے تعلقدار اور نواب ان کے ہمنوا ہیں۔ لکھنؤ میں جب سے گاندھی جی کے درشن کیے تھے بیرونی مال استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میری کھدر کی ساڑیاں بالکل ریشم کی لگتی تھیں۔ مگر جاڑوں ہی میں پہنی جا سکتی تھیں۔ ملک کے بٹوارے کا خیال انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ضیا مجھے عجیب نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ غلط احساس نہیں کہ میں تمہیں بہت دن سے جانتا ہوں۔"

"کیسے جانتے ہو؟"

"مجاز نے ذکر کیا تھا۔ تم اس سے ملنے گئی تھیں۔ اور کافی متاثر ہوئی تھیں۔"

"اوہ، ہاں تین سال ہوئے جب میں علی گڑھ میں تھی تو صفیہ کے ساتھ ملی تھی۔"

"بہت پسند ہے مجاز۔"

"بہت۔"

"شادی کا ارادہ ہے؟"

"کیا جسے پسند کیا جائے اس سے شادی بھی کی جائے؟ مجھے تو جگر صاحب بھی بے انتہا پسند ہیں نیاز فتح پوری سے بے انتہا عقیدت ہے بطرس میری جان ہیں۔"

"اور جگنو؟"

"جگنو بھی۔"

"جان ہیں؟"

"یہ تو ان کی شان میں گستاخی ہوگی نہیں جگنو کے لیے دل میں الگ ہی خانہ ہے۔"

"دل ہے کہ کبوتروں کی کابک؟"

"ہر دل کبوتروں کی کابک ہوتا ہے۔ مختلف خانوں میں ماں باپ بھائی بہن یار دوست استاد ادیب اور شاعر —— میرے دل میں تو ایک خانہ اُدا یعنی ہمارے پرانے باورچی کے لیے بھی ہے جب چھوٹی تھی تو باورچی خانہ میں ان کے پاس گھس کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ ہانڈی بھونتے۔ اس میں سے گردہ نکال کر مجھے کھلاتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹکیاں گھی اور نمک ڈال کر میرے لیے پکاتے تھے اور دوسرے بچوں سے چھپا کر

مجھے کھلاتے تھے۔ سب بھائی بہنوں رشتہ داروں کے لیے الگ ڈبے ہیں۔ کوئی نیچے کوئی اوپر اور کافی اوپر ایک خانہ میری پہلی سہیلی منگیا، کہ چوان کی بیٹی کے لیے تھا۔"

"تھا سے کیا مطلب؟"

"اس کا بیاہ ہو گیا تو بہت دور ہو گئی۔ پھر مجھے کچھ بیچ سمجھتی تھی، بڑی بہنوں سے کھسر پھسر کرتی تھی۔ کہتی تھی تم کنواری ہو تم سے کیا بات کریں۔ بڑی اکڑتی تھی۔"

ضیا مسکرانے لگے۔

"ذرا سوچا ان سب سے شادی کر سکتی ہوں، اور خدا جانے ابھی کتنے نئے خانے پیدا ہوں گے۔ کون کون آن بسے گا۔"

"اس کا مطلب ہے ابھی گنجائش ہے؟"

"قطعی۔"

"باقاعدہ عرضی دینی پڑے گی۔"

"نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ عرضی نامنظور ہو جائے۔ کوئی رشوت سفارش کا دخل نہیں۔"

"خیر گنجائش تو ہے، اس لیے ناامید نہ ہونا چاہیے۔ اوپر کے خانے میں یا نیچے۔"

"بیچ میں بھی۔ ہاں تو مجاز نے ذکر کیا تھا میرا؟"

"اس کے علاوہ تمہارے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے ذریعہ سے بھی۔"

"ارے آپ ان سے مل چکے ہیں، کہاں؟ دہلی میں۔"

"ملاقات نہیں ہوئی۔ دراصل ایسا ہوا کہ ایک دفعہ یعنی چند مہینے ہوئے میرے والد نے شادی کے لیے اشتہار دیا تھا تو چغتائی صاحب کا بھی خط آیا تھا تم اس وقت ان کے پاس ہی تھیں۔"

"اوہ تو وہ جناب تھے۔ ہاں مجھ سے بھی انھوں نے ڈپٹی کلکٹر کا ذکر کیا تھا۔ نام نہیں بتایا تھا۔"

"اشتہار میں نام تھوڑی تھا۔ بڑے بڑے تعلقداروں کے خط آئے۔"

"دولہاؤں کی اتنی قلت ہے ہندوستان میں، اور پھر ڈپٹی کلکٹر تو راجہ ہوتا ہے۔ اگر رشوت لے تو کیا کہنے ہیں۔ رشوت لیتے ہو؟"

"ابھی تک تو موقع نہیں ملا۔"

"رشوت مت لینا۔"

"اگر کسی نواب زادی سے پالا پڑا تو ٹھاٹ باٹ کیسے بھگتے جائیں گے۔"

"بس تو گھر داماد بن جانا"

"اس کے بیٹے ...."

"ارے کسی اچھے سے تھانیدار سے پار لگوا دینا۔ کسی ڈاکو کو چھوڑ دینا صفایا کر دیں گے"

"تمہارے والد ڈپٹی کلکٹر تھے"

"بقول شمیم، میرے والد اس معاملہ میں نہایت نکمے تھے"

"یہ شمیم صاحب؟"

"قطعی صاحب نہیں، مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے نہایت مزے دار انسان ہیں، میرے نمبر پانچ بھائی۔ چار دفعہ میٹرک کا امتحان دیا۔ محکمہ تعلیم کی بدقسمتی اور بے ایمانی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ اکثر کسی لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کرنے کے پلان بناتے رہتے ہیں۔ فی الحال تو ناکامی سے ہی سابقہ پڑ رہا ہے۔ ہاں تو نے بھائی نے خط لکھا تھا۔"

"کہ وہ خود جج ہیں جاورہ اسٹیٹ میں، بڑے بھائی ریونیو سکریٹری ہیں اور نواب صاحب سے کچھ دور کا رشتہ ہے۔ ان کی عنایات شامل حال رہیں گی"

"نواب صاحب کی عنایات سے جان بچا کر ہم جاورہ سے فرار ہوئی۔ پچھلے چند مہینوں میں بس تختہ الٹ گیا۔ نھے بھائی کو چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ اور بڑے معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ منے بھائی کو ڈاکٹر غلط دوائیں دے رہا تھا، وہ میرج ٹی۔ بی ہسپتال بھاگے۔ اور استعفیٰ دے کر اب جودھپور آگئے ہیں۔ بالکل بستر سے لگ گئے ہیں"

"ایسی صورت میں تمہارا وہاں رہنا ..."

"صورت کچھ زیادہ ہی مکروہ ہونے لگی۔ نواب صاحب نے مجھے اور میری گیارہ برس کی بھتیجی کو اپنی بہوئیں بنانے کا فیصلہ صادر کیا"

"اوہ، تو یہ ٹھاٹ ہیں آپ کے! مگر ... نواب صاحب کی بہو"

"جی! میں اور نزہت یعنی ڈیڑھ عدد بہوئیں وہاں سے اسی رات سرپٹ بھاگیں اور بریلی میں آکر سورگ باش ہوئیں۔ لوگ مرنے کو سورگ باش کیوں کہتے ہیں حالانکہ زندگی میں بارہا انسان سورگ باش ہونے کے زریں مواقع پا سکتا ہے"

"ہندی کے الفاظ بہت زبان پر چڑھ گئے ہیں"

"آج کل میرے ایک مہربان ادنکارناتھ شرما مجھے ہندو مائی تھولوجی پڑھا رہے ہیں"

"بڑے میاں تمھیں ہندو بنانے کے چکر میں ہوں گے۔"

"بڑے میاں نہیں نوجوان ہیں۔ کافی ہینڈسم مجھے تو ڈر ہے کہ مجھے ہندو بنانے کے بجائے وہی نہ مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔ پتہ ہے وہ میرے ہاتھ کا پُھوا بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں سب بے حد روشن خیال ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے مگر دسترخوان پر رکھا ہو تو چھوت نہیں کرتے۔ بس ایک دن ایک نوالہ حلق سے اتار لیں تو کلیان ہو جائے۔"

"کچھ چکّر معلوم ہوتا ہے۔"

"کسی بھی مرد سے دو باتیں کر لو، وہ چکر چلانے پر مصر ہو جاتا ہے، نہ جانے کیوں مرد عورت کا صرف ایک ہی استعمال جانتے ہیں۔"

"یعنی جنسی ملاپ۔"

"ہاں۔ بس گھوم پھر کر کھونٹے پر لوٹ آتے ہیں۔"

"فرائیڈ کو پڑھا ہے؟"

"مگر مکمل ایمان نہ لا سکی کچھ فراڈ بھی ہے فرائیڈ میں۔ ایک کجی ہے میرے ذہن میں کتنا بھی عظیم انٹلکچوئل ہو، میں آنکھ موند کر ایمان لانے کے قائل نہیں۔ نہ جانے کیا عادت بد ہے کہ سب سے پہلے ان کے قول میں لوپ ہول (Loop Hole) تلاش کرتی ہوں۔ موافقت سے پہلے ساری مخالفت کی دیکھ ریکھ کر لینا چاہیے۔ میں کسی بھی مقولے پر دھڑ سے ایمان لانے کی قائل نہیں۔ پہلا لفظ میری زبان سے شاید "کیوں" نکلا ہوگا۔ حالانکہ اس کیوں نے مجھے بڑی مار کھلائی ہے۔"

"کیا نکاح کے دو بول اتنے اہم ہیں؟"

"قطعی نہیں، خود میرے ابا نے جو اماں کے دیوانے تھے نہ جانے کس پیاس کی طلب میں ایک خاتون سے شادی کر لی تھی، شاید اس لیے کہ وہ اماں سے بالکل مختلف ہوں گی۔ صدیوں سے مرد نئے نئے ذائقوں کا مزہ لینے کا عادی بن چکا ہے۔ وہ تو میری بھولی بھالی جاہل ماں لوہے کی لاٹ ثابت ہوئیں اور سارے خاندان کو رشوت دے کر بھڑکا دیا۔ سب نے مل کر میرے سدھا ابا کو چت کر دیا اور انھوں نے مہینہ بھر کے اندر طلاق دے دی۔ مگر میرے آوارہ دس نمبری چچا میاں ایک دھوبن بھگا لائے تھے، خاندان میں اسے کوئی مرتبہ نہ مل سکا ہمیشہ زمین پر یا پیڑھی پر ذرا فاصلہ پر بیٹھتی تھی۔ چچا میاں کے علاوہ سب ہی کی چاکری کرتی تھی۔ اس کے بیٹے کے نام انھوں نے اپنا آبائی مکان کر دیا تھا۔ اور اس کو لانے کے بعد کبھی کسی دوسری عورت کے پاس نہیں گئے۔ ایک دفعہ مزے دار کھانا پکانے پر خوش ہو کر بولے "بدھیا مانگ کیا مانگتی ہے آج دیا ئے

رحمت جوش میں ہے۔" بدھیا نے لجاجت سے کہا۔ "مجاجی نکاح کرلو۔ یہ حرام نہیں جھیلا جاتا۔" بس ہجّا میاں نے جوتا اُتار کے پلیٹیں نکال دیا۔ "حرام زادی ہم چغتائی۔ بجھ دھوبن سے نکاح کرکے خاندان کو رسوا کریں گے۔"

میرے دل میں ان کی کوتاہ نظری کو چھوڑ کر اس قدر کی بڑی عزت ہے جو دراصل انھوں نے بدھیا کی کی جب کہ نکاح کرکے بھی بے وفائی کرنا مرد کا حق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ مردانگی۔"

"تمھیں ایسی محبت دینے والا ملے تو۔"

"تو زندگی چھلک اٹھے گی۔"

ضیا مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یعنی میں نہایت جوش خروش سے انھیں دعوت دے رہی تھی۔ خدا سمجھے میری زبان کو واقعی لگام نہیں۔

"دیوالی کی تین دن کی چھٹی ہے۔"

"ہاں، سوچ رہی ہوں دو دن کی اور چھٹی لے لوں، پھر اتوار پڑتا ہے۔ چھ دن کے لیے علی گڑھ کا چکر لگا آؤں۔ بہت جی چاہ رہا ہے۔"

"لکھنؤ چلونا۔"

"لکھنؤ؟" کالج چھوڑنے کے بعد لکھنؤ جانا ہی نہ ہو سکا تھا۔

"ہاں۔ بس دو دن کے لیے۔"

"خیال بُرا نہیں، آئی۔ ٹی کالج کی اکثر یاد ستاتی ہے۔"

"تو پھر طے ہے؟"

"قطعی۔"

"اسی طرح بارہ بجے کی گاڑی سے آؤں گا۔"

"میں اسٹیشن پہنچ جاؤں گی۔ سامان رکھ کر کہیں گھومنے چل دیں گے۔"

"اور شام کی گاڑی سے لکھنؤ۔ واپسی میں مجھے بھی ایک دن کے لیے بریلی آنا ہے۔"

رات کو ہوٹل میں کھانا کھایا۔ باتوں میں دس بج گئے۔

"بہت دیر ہوگئی۔ آپا پریشان ہوں گی۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ابھی تو شام شروع ہوئی ہے۔"

"تم نہیں جانتے آپا کو ہول سوار ہو جاتے ہیں۔ سید صاحب اور منیجر صاحب کے پاس آدمی دوڑائیں گی۔ بریلی شہر میں میری ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔ ویسے ہی تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی۔"

"لوگوں کی بکواس کی پرواہ کرتی ہو۔"

"میں شہر کے اکلوتے مسلم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہوں۔ میرے چال چلن رکھ رکھاؤ پر کتنی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ میں نیم پاگل ہو سکتی ہوں مگر غیر ذمہ داری سے مجھے گھن آتی ہے۔ میں جانتی ہوں مسلم اسکول کن مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں، اور مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں پر قوم کی نظر کس امید میں پڑتی ہے کہ یہ ایک بڑھا قدم اٹھائے تو پیروں تلے سے فرش کھینچ لو۔ میں قوم کی خصلت چٹکی بجاتے میں نہ بدل سکتی ہوں نہ امید کرتی ہوں۔ ایک زمانہ چاہیے۔"

"رشید جہاں کو تو گرو مانتی ہو۔"

"ہاں۔ مگر گرو کی ہر بات کی تقلید آنکھیں بند کر کے نہیں کرتی۔ میں اپنی عقل کے مطابق خود فیصلہ کرتی ہوں اور اسے گرو سے بغاوت کا نام نہیں دیتی۔ میں بے حد جاہل تنگ خیال انسان کے وجود پر بھی شدت سے احتجاج نہیں کرتی۔ ہر انسان اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہے۔ اسی ماحول کی گرفت میں قید ہوتا ہے۔ اسے دھکے دے کر یا گھسیٹ کر نہیں نکالا جا سکتا۔"

"روس کے کمیونزم کی بھی قائل ہو، مذہب پر جبریہ پابندی اور منہ پر تالے ڈالنے کی بھی قائل۔ تمہاری باتوں میں بڑا تضاد ہے۔"

"تضاد تو زندگی کی نشانی ہے۔ میں پتھر کا تاج محل تو ہوں نہیں کہ بس توازن ہی توازن ہو۔ میرے دماغ میں ان گنت سوالات آپس میں جو تم بیزار کرتے رہتے ہیں انھیں سلجھانا، الجھانا اور پھر سلجھانا یہی تو زندگی ہے۔ مجھے کھانے کپڑے کی فکر نہیں، آپا اتنی سلیقہ مند ہیں، وہ سب سنبھال لیتی ہیں۔ بچپن میں پھوٹ پھوٹ پر مارا کرتی تھیں اب بڑبڑاتی ہیں۔ کبھی ان سے نفرت تھی اور دعا مانگا کرتی تھی کہ اللہ کرے مرجائیں۔ اسے چھتی ہوں، یہ بیچ میں آپا نہ ہوتیں تو کیسے گزر ہوتی۔ دن بدن آپا کی قدر دل میں بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دن بولیں:

"تمہاری حرکتوں پر خون کھولتا ہے، مگر ٹال جاتی ہوں کہ بڑی استانی ہو۔ لڑکیوں کے سامنے بے عزتی سے رعب نہ رہے گا۔ ورنہ اب بھی تم نے جوتیاں کھانے کی باتیں نہیں چھوڑیں۔"

میں نے تخت پر ان کے حسابوں کو ڈرا پھیلا رکھا تھا۔ کہانی لکھتے لکھتے اٹھ گئی۔ پھنسے ناڑیں اس لیے ان پر چائے کی پیالیاں چمچے اور گلاس جما دیے۔ ساتھ ہی کل کی جلدی میں اتاری سازی بھی پڑی تھی کنگھا بھی آئینہ کی میز پر رکھنا بھول گئی۔ دو سوڈے کی بوتلیں بھی لڑھک رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ اسکول سے لوٹی تو دیکھا تخت نہایت صاف ستھرا پیپرویٹ کی طرح استعمال کیے ہوئے برتن غائب

کاغذ انتہائی سلیقے سے گاؤ تکیے کے نیچے، دم نکل گیا۔ میں لکھتے وقت صفحات پر نمبر نہیں ڈالتی ایسے رکھتی جاتی ہوں کہ بعد میں نمبر ایک ساتھ ڈالوں تو گڑبڑ نہ ہو۔ آپا نے سب اوندھا سیدھا کر دیا۔ ارے میں چلی تم مجھے باتوں میں لگا کر۔۔۔" میں جلدی سے بٹوا اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

ضیا مجھے پہنچانے آئے۔ ہم باہر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آپا کھنکاریں تو پتہ چل گیا میرے آنے کی خبر ہوئی اب اطمینان سے سو جائیں گی۔

ہم رات کے دو بجے تک باتیں کرتے رہے۔ کمرے میں بجلی جلی، آپا شاید بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ضیا جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

"معلوم ہوتا ہے قلعہ میں جگار ہو گئی۔ دو بج رہے ہیں، اب چلنا چاہیے۔ کل صبح۔۔۔"

"تم مت آنا، جاتے ہو آس پاس کی کوٹھیوں کی کھڑکیوں کے پردے ہلنے لگتے ہیں۔"

دوسرا دن بھی نہ جانے کب آیا کب گزر گیا۔

آس پاس اَن گنت خواب چھوڑ گیا۔ ٹرین میں ضیا کو سوار کرا کے میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ایک دم دونوں کو چپ لگ گئی۔ بڑی گھٹن ہو رہی تھی۔ یہ دو دن ایک کوندے کی طرح لپکے اور بجھ گئے۔ زبانوں پر بھاری بھاری تالے جھولنے لگے۔

گارڈ نے جھنڈی ہلائی، ہم چونک کر کھڑے ہو گئے اور دو جسم ایک دھماکے سے ایک ہو گئے۔ میرے اناڑی ناتجربہ کار ہونٹ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

ایک جھٹکے سے ضیا نے مجھے جلدی سے ٹرین سے اتار دیا مگر ہمارے ہاتھ جڑے رہے۔

ریل جیسے ایک دم جھنا کر بھاگ کھڑی ہوئی، ضیا کا لمبی انگلیوں والا ہاتھ دور تک ہوا میں میرے وجود کو پکارتا رہا۔

تھوڑی دیر کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں، پلیٹ فارم جیسے ریل کے پیچھے بھاگ رہا ہو، گھن گرج سے سیکڑوں بھاری بھرکم فولادی تالے دھڑا دھڑ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور ان گنت دروازے کھلتے جا رہے تھے۔ انجانی راہ داریوں کے اجنبی دروازے۔

"ہلو، بھائی صاحب!" جیسے کہرے میں سے سید صاحب کا ہیولا واضح ہوا، "خیریت؟"

مگر سارے تالے کھلنے کے بعد اس دن پہلی بار میرے ہونٹوں پر بھاری سا تالا لگ گیا۔ آپا نے حسبِ دستور جواب دینے کے بجائے انھوں نے میرا بازو پکڑا تو میں نہایت غصے میں ان کے ساتھ چلنے لگی۔

"لڑکا اچھا ہے" وہ بزرگانہ انداز میں بولے۔

"جاسوسی ہو رہی تھی" رنگ لگنے لگا۔

"کیوں بھائی صاحب کیا اس ناچیز پُر تقصیر برادر خورد کو چوکیداری کی بھی اجازت نہیں؟ اے لڑکی یہ دو دن کہاں گل چھرے اڑاتی رہی۔ جب دیکھو جب غائب، آخر یہ قصہ کیا ہے؟"

"مگر آپ میرے چوکیدار کب سے مقرر ہو گئے"

"ارے آدھا بریلی تمہاری چوکیداری پر معمور ہے! آج کل سوائے اس قصے کے اور محفلوں میں ذکر ہی کس بات کا ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے بعد بس تمہارا اور تمہارے گلفام کا ہی ذکر خیر چلتا ہے۔ کل مس فلپس کے ہاں..."

"یعنی بات مس فلپس تک پہنچی"

"وہ انسپکٹرس آف گرلز اسکول ہیں۔ اگر کسی اسکول میں کسی کو چھینک بھی آتی ہے تو انھیں اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ تو اچھا خاصہ تنجائش کا کیس لگتا ہے۔ کیوں یار کتنے پانی میں ہو"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ سید صاحب میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی آپا جو پہلے ان کے آنے پر کلس سی جاتی تھیں۔ اب وہ آتے تو بڑی خاطر کرتیں۔ ان کے گھر بھی جانے لگی تھیں۔

"باقی سب خیریت ہے۔ آپ کی خیریت خداوند تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے" میں نے خوشی سے کہا۔

مگر تالے میرے ہونٹوں سے سرک کر دل کی گہرائیوں میں اور ذہن کے حساس روزنوں پر جڑ گئے۔ میرے ہونٹ طلسم ہوشربا کو دور جھٹک کر زمین پر اتر آئے۔

"چلیے، چھوٹی بی کے ہاتھ کی پنیر کی پکوڑیوں کو بہت جی چاہ رہا ہے"

"چلیے مکرمی بھائی صاحب پنیر کی پکوڑیاں انتہائی مقوی دل و دماغ ہوتی ہیں۔ جیسے خمیرہ گاؤزبان مروارید"

# تعلیمِ نسواں - ایک وبال

پہلا گھنٹہ میں دفتر کے کام میں صرف کرتی دوسرا آٹھویں جماعت کو انگریزی پڑھانے میں تیسرا گھنٹہ حساب کا لینے کے بعد رضیہ بیگم کو قرآن اور دینیات کے لیے سپرد کر کے پھر آفس میں کلرک کو ضروری خطوں کے جواب لکھوانے میں گذر جاتا۔

دفتر میں داخل ہوئی تو منیجر صاحب کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔

پھر ایک دم غصہ چڑھنے لگا میری نجی زندگی میں دخل انداز ہونے کا انھیں کوئی حق نہیں، میں قطعی جھگڑنے کے موڈ میں آگئی۔

"آداب عرض" میں نے نہایت مصنوعی خوش مزاجی سے کہا۔

جواب ندارد۔

میں نے کتابیں میز پر پھینک دیں۔ منیجر صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا ان کے چہرے پر حسب دستور بارہ بج رہے تھے۔ وحشت زدہ آنکھیں، کڑوا منہ، جیسے زبان پر کونین کی گولی رول رہے ہوں۔

"منیجر صاحب معاہدہ جب چاہیں توڑ سکتے ہیں، میں قطعی احتجاج نہیں کروں گی"

"جی!" انھوں نے جیسے کوئیں کی تہہ سے ابھرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا میں ناتجربہ کار ہوں، اسکول ...."

"افوہ، ... مگر ... مگر مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی، میں سمجھتا تھا آپ مختلف ..."

"کیا، یعنی مختلف سے آپ کا مطلب ...."

"دیکھئے، میں بہت پریشان ہوں، میں آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو زاہدہ اور عابدہ کو آپ اپنے ساتھ رکھ لیجئے۔"

"مگر، یعنی، بات کیا ہے منیجر صاحب۔" میں ششدر رہ گئی، میں قطعی اپنے چال چلن پر منیجر صاحب کا لکچر سننے سے پہلے ہی اعلان جنگ کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

"سارا بریلی جانتا ہے تو آپ سے بھی میری بیگم صاحبہ نے دکھڑا رویا ہو گا۔"

"وہ بات یہ ہے کہ منیجر صاحب مجھے گھریلو جھگڑوں کی ایسی عادت سی پڑ چکی ہے کہ ایک آدھ بار کے بعد اگر وہی ریں ریں دہرائی جائے تو میں ایک دم بالکل اپنا سوئچ آف کر دیتی ہوں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے بڑے غور سے سن رہی ہوں۔ باقاعدہ چہ چہ اور توبہ توبہ کہتی ہوں مگر مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ بیگم صاحب اڑاتی رہتی ہیں کبوتر، میں نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہوں۔ مگر لڑکیوں کو میرے ہاں رکھنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دینا چاہتا ہوں۔"

"آپ کی دونوں بیٹیاں نہایت ذہین اور پڑھنے کی شوقین ہیں۔ کون روکتا ہے پڑھانے سے؟"

"مگر میری بیوی جانتی ہیں کہ ان کی تعلیم میں روڑا اٹکا تو مجھے کوفت ہو گی۔"

"اوہ سمجھی، یعنی وہ بلیک میل کر رہی ہیں؟"

"اجی ایک سرے سے پڑھانے کے ہی خلاف ہیں۔"

"آپ کا جی جلانے کو کہتی ہوں گی۔ میں نے انھیں رضیہ بیگم کے بارے میں بہت سمجھایا، میرے خیال میں وہ رضیہ بیگم کو صرف آپ کو جلانے کے لیے بیچ میں لاتی ہیں۔ اصل وجہ کچھ اور ہے۔"

"وجہ پیسہ ہے، یعنی پیسہ نہیں ہے، بس یہ شکایت ہے کہ اسکول کے پیچھے میں نے اپنی روزی کا خون کر دیا۔"

مگر آپ اپنا سارا وقت تو اسکول میں نہیں صرف کرتے۔ میرے خیال میں آپ کو اتنی فکر نہ کرنا چاہیئے۔"

فکر نہ کروں؟ آپ کو پتہ ہے میرے اسکول کو آگ لگانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں! لے دے کے ہے یہ کوٹھی اور ملحقہ اسکول کی عمارت۔ ابھی تک فرنیچر کی قسطیں بھر رہا ہوں۔ پوچھیے کیسے؟

میرے پوچھے بغیر وہ بولے۔

"میں نے محکمہ تعلیم کو تمام خرچ پیش کرتے اسکول کے لیے گرانٹ کی قرض کا ذکر نہیں کیا بالکل ...

فرنیچر والے سے پوری رسیدیں لے کر نتھی کر دیں۔ تین ماہ کی تنخواہ کی رسیدیں اساتذہ سے پیشگی لے لیں۔"

"یعنی بغیر ادائیگی کیے۔"

"جی! اور یہ جرم ہے، فراڈ ہے مگر مسز مارٹس نے میری بڑی مدد کی۔ انھوں نے ہی تمام استانیاں مقرر کیں۔ بغیر تنخواہ تین مہینہ کام کرنے پر تیار کیا۔ اس کے بعد گھر گھر ہم لوگ چندہ مانگنے گئے اور کسی نہ کسی طرح سے گرانٹ بھی مل گئی اور اسکول چلنے لگا۔ لیکن رجسٹر میں دکھائی ہوئی کافی رقم کی ادائیگی نہیں ہو پائی ہے۔ اُف میں آپ کو کیسے بتاؤں کیا چکر ہے۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔ واقعی میں نہیں سمجھی۔ مینیجر صاحب نے خاصی بے ایمانی کر ڈالی۔ سارے رجسٹر، رسیدیں جھوٹی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ چندہ جمع کر کے کھا گئے۔ میرا جی الجھنے لگا۔

"مگر لڑکیوں کو وہ یہاں رکھنے دیں گی۔"

"یہاں نہ رہ سکیں تو انھیں کہیں اور بھیجوں گا۔ وہ انھیں ہر وقت ڈانٹتی ہیں پڑھنے نہیں دیتیں۔ ہمارے لڑائی جھگڑوں سے بھی بچیاں پریشان ہوتی ہیں۔ چھوٹا ہے ہمارا گھر۔"

"آپ بچیوں کو بھیج دیں، آج ہی۔"

"بلکہ ابھی، ہاں میں فی بچی آپ کو تین روپیہ مہینہ دے دیا کروں گا۔"

"تین روپیہ فی لڑکی؟ یعنی بورڈنگ میں تین روپیہ مہینہ!" علی گڑھ میں تو سترہ روپیہ فیس تھی، اور آئی ٹی کالج میں سب ملا کر بیس روپیہ ہو جاتے تھے۔

"کیوں کیا کم ہے؟"

"مینیجر صاحب تین روپیہ!"

"حساب لگا لیجیے۔ ایک روپیہ کا بیس سیر آٹا۔ دس سیر فی لڑکی بہت ہوگا۔ اور چھ پیسے سیر بڑے کا گوشت ہے۔ اگر پاؤ بھر بھی دونوں نے کھایا تو...."

"ڈیڑھ پیسہ روز۔"

"رہا گھی تو میری بچیوں کو تیل کی عادت ہے۔ دو سیر کھایا تو بھی کتنے کا ہوگا۔"

"بارہ آنے کا۔" گھی تیل کا بھاؤ مجھے معلوم تھا۔

"پاؤ بھر دودھ نہیں۔ بس چھٹانک بھر کافی ہوگا چائے دیجیے گا اور پیسے کے روز سست دونوں کے لیے کافی پیٹ بھراؤ ہوتے ہیں۔ یا باسی روٹی دے دیجیے گا۔"

"مگر پھر تو مجھے منافع ہی منافع ہو جائے گا۔"

"نہیں، لالٹین کا تیل، لکڑی کوئلہ میں اگلے مہینے سے بڑھا دوں گا۔ یہ پانچ روپیہ رکھیے۔ شام

کو ایک روپیہ بھجوا دوں گا۔"

"لکڑی ان کے لیے الگ سے تو جلے گی نہیں اور لالٹین بھی۔"

"پھر بھی۔"

"یہ روپیہ آپ رکھیے منیجر صاحب بچیاں بہت ذہین اور پیاری ہیں۔"

"خیر شام کو یا کل بھجوا دوں گا۔ تو انھیں ذرا بلائیے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں آج ہی سے رکھ لیجیے، سامان بھجوا دوں گا۔ بستر کپڑے وغیرہ۔"

"مگر ایک شرط ہے منیجر صاحب!"

"کیا؟ اور کوئی شرطیں باقی ہیں۔"

"جی ہاں، میں بچیوں کو رکھوں گی مگر پیسے نہیں لوں گی۔"

"نہیں، پیسے آپ کو لینا ہوں گے میں اپنی بچیوں کا بار آپ پر نہیں ڈال سکتا۔"

"منیجر صاحب دنیا میں کوئی بچہ نہیں جو کسی پر بار ثابت ہو۔"

"نہیں ... میں۔"

"منیجر صاحب آپ مجھے بہت تنخواہ دیتے ہیں اور میں ٹرینڈ بھی نہیں، سو روپیہ بہت ہوتے ہیں ور پھر مجھے آپ بڑی پابندی سے دیتے ہیں۔ ہاں تو طے ہے۔"

"مگر۔"

"دیکھیے، فضول بحث سے فائدہ نہیں۔ چھ روپیہ پورے خرچ نہیں ہوتے اور میں آپ سے منافع لینے کے لیے تیار نہیں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" ان کے چہرے پر کرب طاری ہو گیا۔ میرا بھی گلا بھر آیا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ماما آئی تو میں نے کہا۔ "زاہدہ عابدہ کو بھیج دو۔ اور تم ذرا جا کر میری آپا سے کہو ایک کیتلی چائے اور بسکٹ بھیج دیں۔"

بچیاں آئیں، عابدہ تو ذرا ہمت والی تھی مگر زاہدہ کا تو میری صورت سے دم نکلتا تھا۔ دونوں چوہیوں کی طرح سہمی ہوئی آئیں۔

"میں ابھی آئی۔" میں اٹھ کر کلاسوں کا چکر لگانے لگی، نہیں چاہتی تھی کہ باپ بیٹیوں کے درمیان ہونے والی باتیں سنوں۔ شاید بچیاں روئیں پیٹیں، زاہدہ رول رول کر رہی تھی۔

ماما چائے کی ٹرے لے کر آئی تو میں اس کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئی، بچیاں کھلکھلا کر ہنس رہی

تھیں مجھے دیکھ کر ایک دم چُپ ہو گئیں۔

"جاؤ اپنی کلاس میں" منیجر صاحب نے پیار سے دونوں کو دروازے کی طرف دھکیلا وہ گرتی پڑتی بھاگیں۔

"آپ سے بہت ڈرتی ہیں خدا کے لیے ان کے دل سے ڈر نکالیے" منیجر صاحب پھر زبان پر کونین کی گولی رونے لگے۔

"ساتھ رہیں گی تو ڈر نکل جائے گا"

"میں نے سُنا ہے آپ سے سب لڑکیاں ڈرتی ہیں"

"اچھا؟ مجھے پتہ بھی نہیں، مگر کلاس میں تو بڑی اچھی طرح سے کام کرتی ہیں۔ خاص طور پر عابدہ۔ ماشاء اللہ بہت تیز ہے وہ قطعی نہیں ڈرتی، بلکہ اسے تو میں ڈانٹتی بھی ہوں۔ ہر سوال کا جواب پٹا پٹ دینے لگتی ہے کسی کو بولنے ہی نہیں دیتی"

"زاہدہ تو لرز رہی تھی، مجھے بڑی تکلیف ہوئی"

"اب میں کیا کروں میری شکل ہی بھیانک ہے"

"اگر ایسی بات ہوتی تو مس داس کو دیکھ کر تو ہارٹ فیل ہو جانا چاہیے تھا۔ واقعی بے چاری جی بھر کے ڈراؤنی ہے۔ پڑھاتی بھی ٹھیک سے نہیں اور بچوں کو مارتی ہے"

"اس کی کلاس میں لڑکیاں قہقہے لگاتی ہیں"

"مگر آپ جاتی ہوں گی تو سانپ سونگھ جاتا ہو گا"

"پتہ نہیں کیوں؟"

"آپ ذرا گرم (Grim) رہتی ہوں گی"

"شاید!"

"حسیب کو بھی آپ سے شکایت ہے"

"اچھا! میں بھول ہی گئی تھی، حسیب ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ سال بھر کی بچی چھوڑ کر ان کی جوان بیوی مر گئی تھی۔

"ہینڈسم لڑکا ہے میرا بھائی نہیں لگتا۔ اس کا رنگ اماں جان کی طرح صاف ہے"
منیجر صاحب کئی بار حسیب کے حسن اور اس کی مرحوم بیوی کا ذکر کر چکے تھے۔ ٹھنڈی سانس بھر کے بولے۔

"میرا خیال تھا آپ اسے پسند کریں گی، مگر آپ بڑی رکھائی ملیں ۔"

"منیجر صاحب ذرا یاد کیجیے آپ نے جب آئی تھی میں تو کیا کہا تھا کہ مسلمانوں کا اسکول ہے لوگ بڑے نیرو مائنڈیڈ ہیں ۔"

"مگر حسیب تو نہایت شریف لڑکا ہے ۔"

"مجھے تو کوئی یہاں ابھی تک رذیل نہیں ملا۔ صدیقی صاحب، شنکر جی۔ اور شرما جی، مسٹر جیکب اور اس دن مسٹر مارکس آئے تھے، بڑے ہی بھلے آدمی ہیں ۔"

"وہ تو مشنری ہے۔ آپ کو عیسائی بنانے کی کوشش نہیں کی؟ تمام بھنگیوں، چماروں کو عیسائی بناتا پھرتا ہے ۔"

"بدقسمتی سے میں بھنگی، چمار نہیں ۔"

"اُہو، میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں۔ آپ اچھے خاندان کی ہیں، آپ خدا نہ کرے کیوں . . . ."

"اچھے برے خاندان اور مذہب سے کیا واسطہ ؟"

"واسطہ تو ہے۔ سُنا ہے شرما جی بہت گیتا رامائن سُنا رہے ہیں آج کل ۔"

"ہاں شاید وہ مجھے ہندو کرنا چاہتے ہوں گے ۔"

"قطعی، بڑا کٹر آریہ سماجی ہے ۔"

"آپ بھی تو کٹر مسلمان ہیں ۔"

"بحمداللہ ۔"

"آپ شاید مجھے مسلمان کرنے پر تلے ہوئے ہوں گے ۔"

"کیا، یعنی کیا مطلب۔ آپ ماشاء اللہ مسلمان ہیں ۔"

"مگر مجھے عیسائی مذہب سے بڑی دلچسپی ہے۔ اور اب ہندو ازم کے بارے میں اتنی تفصیل سے پڑھ رہی ہوں تو . . . . مگر آپ فکر نہ کیجیے میری ذات پر نہ اسلام کو فخر ہے اور نہ کسی مذہب کو فخر کرنے کا موقع ملے گا۔ معاف کیجیے گا منیجر صاحب نعرے بازی اور چیز ہے اور صحیح معنوں میں مسلمان بن یا عیسائی ہونا مشکل ہے۔ مجھے تو سوائے دو ایک کے کوئی نہیں نظر آیا۔ آپ نماز پڑھتے ہیں، میرا مطلب ہے عید بقرعید اور کبھی کبھی جمعہ کے علاوہ ۔"

"نماز نہیں پڑھتا بے شک ۔"

"اور روزہ ؟"

"مگر اس سے یہ تو مطلب نہیں کہ مجھے خدا کے وجود سے توبہ توبہ انکار ہے یا میں منکر یا مشرک ہوں۔"

"آپ بڑے پکے مسلمان ہیں۔ مسلم گرلز اسکول چلا رہے ہیں۔ فکر نہ کیجیے آپ کو ضرور جنت میں زمرد کا محل ملے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں یہ گرلز اسکول قطعی کسی جزا کے امید میں نہیں چلا رہا ہوں۔ آپ .... میرا مطلب ہے ...."

میں ہنسنے لگی۔ "میں جانتی ہوں آپ کو لڑکیوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے۔ اور بخدا مذاق نہیں مجھے یقین ہے خدا آپ سے خوش ہو گا۔ کیونکہ مس فلپس نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں لہ آباد چلی جاؤں تو بہت جلدی کام بن جائے گا اور بورڈنگ کے لیے گرانٹ ... مگر منیجر صاحب بورڈنگ تو ہے ہی نہیں۔ مس فلپس بولیں وہ ایک دن بورڈنگ کا معائنہ کرنے آئیں گی۔"

"اوہ مائی گوڈ۔ میں نے کافی دن ہوئے بورڈنگ کے لیے علیحدہ گرانٹ کی عرضی دے دی ہے۔ آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ وہ فائیل بھی میرے گھر پہ پڑی ہے۔ آپ نے .... ان سے کچھ کہا تو نہیں۔"

"نہیں۔ میں سمجھ گئی آپ نے کوئی بورڈنگ کا چکر چلایا ہو گا۔ مگر مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ جو بھٹ سے منہ سے نکل جاتا تو ...."

"میری مٹی پلید ہو جاتی۔ اچھا تو میں چلا۔ ہاں بچیوں کا سامان بھیج دوں گا۔ فیل تو بہت مچائے گی۔ خیر شام کو حبیب سامان پہنچا دے گا۔"

پھر چلتے چلتے بڑی مسکین صورت بنا کر بولے۔

"ذرا شفیع سے بات چیت کریے گا۔ بڑا دکھی بچہ ہے۔"

"میں کچھ کم دکھی بچی ہوں۔"

"یہ تو نہ کہیے۔" وہ ذرا تنکی سے بولے۔ "پھول کھل رہے ہیں آپ کے چہرے پر۔"

"آپ کے جاسوسوں نے ایک ایک پل کی مخبری ہوگی۔"

کمال کرتی ہیں۔ میں جاسوس لگاؤں گا آپ کے پیچھے۔ اجی یہ شہر بریلی ہے۔ یہاں لوگوں کو سب کی فکر لگی رہتی ہے۔"

"سوائے اپنے گریبان کے۔"

"مگر وہ لفنگا مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ لیانا مرسید آپ اس سے زیادہ میل جول نہ بڑھائیں تو

اچھا ہے "

اسکول چھوٹ گیا تھا۔ ماما دو دفعہ دور سے اشارہ کر چکی تھی کہ آپا بلا رہی ہیں۔ میں نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

"قطعی نہیں بڑھاؤں گی" اگر میں کسی بات پر بغیر بحث کیے راضی ہو جاؤں تو اس کا مطلب بالکل الٹا ہوتا ہے۔ مجھے کہنا چاہیے تھا "قطعی میں بڑھاؤں گی کسی کی مجال ہے جو مجھے روکے" مگر انھیں دوسرے سے میل جول پر کیوں اعتراض نہیں۔ فوراً ہی وجہ معلوم ہو گئی۔

"وہاں ضیا صاحب کا بڑا رسوخ ہے سرکاری آدمی ہیں۔ ان سے کہیے الہ آباد میں ذرا ہمارا کیس آگے بڑھوائیں۔"

"ضرور لکھوں گی" میں نے جل کر کہا۔ اور ان کے باہر جانے سے پہلے ہی گھر کی طرف چل دی۔ گھر پہنچی تو میری چیخ نکل گئی۔

"باجی!"

"ہمقو کتنی دیر سے بلا رہے ہیں، آتی ہی نہیں" باجی نے میری پیٹھ پر دو گھونسے جمائے۔ ہائے میری باجی کے پیارے گھونسے اور میٹھی میٹھی چٹکیاں۔

مدحت دروازے میں سے جھانک رہی تھی۔ تھوڑی دیر شرمائی پھر بھاگی آئی اور دھڑ سے میرے اوپر گر گئی۔

کھانے کی میز پر زاہدہ عابدہ سہمی ہوئی چڑیوں کی طرح بیٹھی ہوئی کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ باجی کے گھونسے میری پیٹھ پر پڑتے دیکھ کر کچھ حیرت زدہ تھیں کچھ مطمئن! میں انھیں کم کلکھنی لگ رہی تھی۔

باجی کو میں نے لکھا تھا کہ مدحت مولوی سے کیسے پڑھ رہی ہو گی اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ دولھا بھائی نے بہت مخالفت کی مگر وہ باجی کی ہر ضد پوری کرتے تھے اس کے علاوہ انھوں نے کہا میں نے بھائی کی بچی لی ہے۔ بڑی بہن پڑھ رہی ہے اگر چھوٹی جاہل رہ گئی تو مجھے کوسے گی۔ اس کے والدین کو بھی دکھ ہو گا۔ اگر پڑھوانے نہیں دو گے تو میں بچی واپس اس کے ماں باپ کو دے دوں گی۔

دولھا بھائی مدحت پر جان چھڑکتے تھے۔ سالے کی بچی ہی نہیں ان کی بھتیجی کی بیٹی تھی رامپور میں چھٹی جماعت تک اسکول تھا۔ اس کے بعد دو سال سے وہ گھر پر ہی پڑھ رہی تھی۔ گیارہ برس کی تھی مگر بے حد ذہین تھی۔ نزہت کی صحت بھی خراب رہتی تھی۔ وہ موٹی تازی تھی۔ نزہت آٹھویں میں تھی اور

وہ ساتویں میں داخل ہوگئی۔
میں نے مُغّن کو بھی داخل کرلیا تھا۔ بچیوں کی کلاس میں آپا بھی ہوم ورک میں مدد کرتی تھیں اب چار لڑکیاں ہوگئیں، تو واقعی بورڈنگ کی بنیاد سی پڑگئی۔ میں نے ایک بڑے سے کمرے میں چار رول کو بھر دیا۔ باجی کو بغیر مدحت کے نیند نہیں آتی تھی مگر وہ "بورڈنگ" میں رہنے پر مُصر تھی۔ باجی ہفتہ بھر رہیں پھر مدحت کو چھوڑ کر چلی گئیں۔
نزہت بڑی سیلین تھی میرے ساتھ بریلی آکر تو بالکل سناٹے میں گُنگ ہوگئی تھی ہر وقت سہمی سی رہتی۔ آپا کا ہاتھ بٹاتی۔ چھوٹے بہن بھائی پر ہر وقت نظر رکھتی۔
مدحت بڑے لاڈوں کی پالی تھی۔ منہ زور بے انتہا شریر۔ پہلے مجھے باجی کے رشتے خالہ جان کہتی تھی۔ بریلی آکر پھوپھی جان کہنے لگی۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولی۔
"آپ ہماری پھوپھی ہیں خالہ تھوڑی ہیں۔ ہمیں خالائیں بری لگتی ہیں۔"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"ہر وقت منع کرتی ہیں بیلیقہ سے چلو، بھاگنے بھی نہیں دیتیں، اور بُری بری باتیں کرتی ہیں۔"
"کیا بُری بُری باتیں؟"
"ہر وقت شادی شادی لگائے رکھتی ہیں۔"
"شادی میں کیا بُرائی ہے؟"
"ہم شادی نہیں کریں گے۔ ہم نے امّی سے کہہ دیا ہے۔"
"وہ کیا بولیں؟"
"کچھ بھی نہیں، وہ تو بس نہ پڑھنے پر مارتی ہیں۔"
نزہت ہماری پہلی بھتیجی تھی اس لیے سب ہی کو پیاری تھی۔ اور امّاں ابا کی تو بے انتہا لاڈلی تھی آپا بھی بہت چاہتی تھیں وہ جانے کیوں اتنی اداس اور پریشان رہتی تھی کہ سب ہی کو اس کی فکر رہتی تھی کبھی میں اسے کھویا دیکھ کر اپنے پاس لٹا لیتی تو مدحت فوراً چڑھ بیٹھتی اور موقع بے موقع نزہت کو پیٹ بھی دیتی۔ میں بہت کہتی نزہت اس چڑیل کو مار مگر وہ مارنا جانتی ہی نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے مدحت کی ٹھکائی کرنی پڑتی مگر وہ بلا کی ڈھیٹ تھی۔ بجائے دکھی ہونے کے مجھ سے لپٹ جاتی۔ اسے کسی نے نہیں مارا تھا، وہ اس مار کو بھی ترستی تھی۔ اتنے لاڈ کیے گئے تھے کہ اوب گئی تھی۔
"بورڈنگ" میں بڑا سا صحن تھا۔ کھیل کود کے لیے خوب جگہ تھی مگر زاہدہ عابدہ بلا کی شرمیلی

اور نزہت مرگھلی۔ اور بیچ بیچ آنکھ مچولی کسی کھیل میں بھی جان نہ پڑپاتی۔ صرف مدحت اودھم مچا کر سب کو چت کر دیتی۔ میں نے گیند اور گلی ڈنڈا بھی سکھایا جس پر منیجر صاحب بڑے پریشان ہوئے۔

"سارے شہر میں خبر پھیل رہی ہے آپ لڑکیوں کو لڑکوں کے کھیل سکھا رہی ہیں۔"

"سب کھیل بچوں کے ہوتے ہیں ان کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ میں نے بحث شروع کر دی، آخر کون سے کھیل سکھاؤں۔ بیڈمنٹن کے لیے آپ سے کہا آپ ٹال گئے۔ پھر بتلائیے بچوں کو کب تک آنکھ مچولی کھلاتی رہوں۔"

نزہت ہر کھیل میں پیچھے رہتی مگر نہ جانے کیسے وہ مدحت پر گلی ڈنڈے میں سبقت لے گئی مدحت ہار کی عادی نہیں تھی کبھی ایک دم بگڑ کے نزہت کو مارنے لگتی۔ ایک قیامت تھی ان دونوں بہنوں کے درمیان سمجھوتہ کرانا۔ نزہت شکایت بھی نہیں کرتی تھی جس پر مجھے بہت غصہ آتا۔ گھر میں ایک بھاوری املی کا پیڑ تھا۔ میں نے بچیوں کو پیڑ پہ چڑھنا بھی سکھانا شروع کیا جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ مگر لڑکیاں میری شہ پا کر کسی کی نہیں سنتی تھیں۔ بلکہ وقفہ میں اسکول کی لڑکیاں بھی آ کر گلی ڈنڈا کھیلتیں اور پیڑ پر چڑھتیں بے حد قابل اعتراض بات سمجھی جاتی اس لیے لڑکیاں سمجھتیں وہ بڑا تیر مار رہی ہیں اور ہفتہ میں قابل اعتراض کھیل کھیلتیں۔

منیجر صاحب بے حد دکھی ہو جاتے۔

"خدا کے لیے، یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ میرے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔"

"آپ کو معلوم ہے اسکول میں لڑکیوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہمارے پاس جگہ بھی نہیں رہی ہے۔ ایک بنچ پر دو دو لڑکیوں کو بٹھانا پڑتا ہے۔ تین لڑکیاں تو گورنمنٹ اسکول سے آئیں کہ ان کا گھر ہمارے اسکول کے پچھواڑے ہے۔ ہم نے کہہ دیا تھا جگہ نہیں کچھ دن چٹائی پر بیٹھنا ہوگا۔"

"مگر . . . . وہ قدیر صاحب کہہ رہے تھے بچیوں کو ہوم ورک بہت ملتا ہے اگر نہیں کریں تو سختی ہوتی ہے۔"

"یہ والدین ہوم ورک اور اسکول کے ڈسپلن میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مار پیٹ پر کس دن سے سختی روک لگا دی ہے جس دن ایک ٹیچر نے لڑکی کو مارا تو خون جاری ہو گیا کسی طرح بند نہیں ہوا تو مجھے ہسپتال لے جانا پڑا۔"

ان کا کہنا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر بات کو بڑھا دیا۔ مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"اگر بچی کو کچھ ہو جاتا تو کیا ذمہ داری آپ لیتے۔ میں جو سمجھوں گی مناسب، وہی کروں گی۔ آپ کی

اجازت لینے نہیں جاسکوں گی کہ اتنے میں لڑکی مرجائے۔ بچوں کو مارنے کی میں قائل نہیں اور مارنا بھی کس طرح کا ہوتا ہے۔ مجھے استادوں کی شقاوت قطعی گوارا نہیں۔"

"اس دن بے چاری بہت پریشان تھیں۔"

"اگر کسی استانی کا شوہر ٹرپدمن سے پینگ بڑھائے تو اس کا غصہ بچہ کی جان پر۔"

"ارے آہستہ بولیے بے چاری بڑی دکھی ہے شوہر گھر کے خرچ کے لیے کوڑی نہیں دیتا۔ چھ بچے ..."

"تو کس نے کہا تھا چھ بچے پیدا کرو اور اب جو ساتواں اٹھائے پھر رہی ہیں۔ میں نے بہت کہا ایک ڈاکٹرنی میری دوست ہے آپ ..."

"خدا کے لیے آپ لوگوں کو ایسی خوفناک رائے نہ دیجیے۔ اسقاط حمل جرم ہے۔"

"ضرورت سے زیادہ بچے پیدا کرنا اس سے بڑا جرم ہے۔ کیا حال ہے ان کے بچوں کا۔ بڑی لڑکی نہ جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی۔ واپس آئی تو وہ اس کا گلا گھونٹنے پر تل گئیں۔ وہ میرے پاس کانپتی تھرتھراتی آئی میں نے اسے پناہ دی تو کون سا جرم کیا۔"

"خواہ مخواہ آپ کو کسی کے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پتہ ہے کیا افواہیں اُڑ رہی ہیں کہ بورڈنگ کی ایک لڑکی حاملہ ہوگئی۔ اور ..."

"افوہ فرزانہ حاملہ قطعی نہیں ہوئی اور نہ میں نے اس کا ابارشن کروایا۔ اور رہا خواہ مخواہ کسی کے معاملہ میں دخل دینے کا سوال تو دنیا کا ہر معاملہ ہر انسان کا نجی معاملہ ہے۔"

"میں ایک لڑکی کی زندگی سے کھیلنے والوں سے قطعی ہمدردی نہیں رکھتی۔"

"مگر دردسر مول لینے سے فائدہ؟"

"قطعی کوئی دردسر نہیں۔ مجھے کوئی ذہنی یا جسمانی کوفت نہیں۔ تھانی بڑی۔ منیجر صاحب خفا ہو کرنے والے اس سے زیادہ کیا کرسکتے ہیں کہ مجھے نکال دیا جائے۔ تو قبلہ:

ملک خدا تنگ نیست

پائے مرا لنگ نیست

"آپ کو بدنامی کا بھی خوف نہیں؟"

"میں صرف اس فعل کو گھناؤنا سمجھتی ہوں جسے میرا ضمیر قبول نہ کرے۔ زندگی میں اب تک جو بھی قدم اٹھایا ہے غلط ثابت نہیں ہوا۔"

"مگر رسک لینے سے فائدہ ؟"

"یوں تو زندگی کے ہر قدم کو رسک سمجھ لیا جائے تو انسان مٹی کا تودہ بن جائے، منیجر صاحب آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ معاہدہ آپ نے کیا ہے۔ میں تو پکّے کاغذ کو کوئی اہمیت نہیں دیتی، پکّے کاغذ کے باوجود اسے کچا بنایا جا سکتا ہے۔ میرے والد جج تھے اور میرے دو بھائی وکیل ہیں۔ میں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ قانون کی حدود سے باہر ہو۔ صرف آپ کی مرضی سے یہاں تقرر ہوا ہے اور آپ کی مرضی . . . ."

"میری مرضی آپ کو معلوم ہے۔ میں نے اپنی بیٹیاں آپ کے سپرد کی ہیں۔ مگر اس دنیا کو کیا کروں۔"

"ایسا کیجیے خود کو ہر جرم سے بری الذمہ سمجھ کر مجھے آگے کر دیجیے۔"

"لاحول ولاقوۃ آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں اتنا بزدل بھی نہیں۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ اسکول کھولا اور چلا رہے ہیں۔ آپ کے علاوہ بابا میاں یعنی علی گڑھ گرلز کالج کے بانی سے ان کے تجربات سے بھی اندازہ ہوا۔ گرلز اسکول اور وہ بھی مسلمانوں کے لیے کھولنا بیٹھے بٹھائے جان پر عذاب نازل کرنا ہے۔ لیکن جو لڑکیاں یہاں سے تعلیم پا کر جائیں گی، وہ آپ کی قربانیوں کو یاد رکھیں گی۔ ذرا سوچیے کتنے گھروں میں اس کا یہ ننھا سا دیا روشنی پہنچائے گا۔"

"بدنامی کیا ہے؟ یہی نا کہ جو لوگ آپ کی مرضی سے زندگی گزارنے پر تیار نہیں، اپنی مرضی سے جیتے اور مرتے ہیں وہ آپ کو بُرے لگتے ہیں۔ اور جو آپ کے یقین پر یقین رکھتے ہیں وہ اچھے لگتے ہیں۔ مجھے اچھا یا برا لگنے کی پرواہ ہے نہ ضرورت۔ میں اپنی زندگی میں کسی کو ٹانگ نہیں اڑانے دوں گی۔"

"زندگی تنہا بڑی کٹھن گزرے گی۔"

"جھیل جاؤں گی۔ کیوں کہ اپنے گناہ اور ثواب کا الزام کسی پر نہ تھوپ سکوں گی۔ رہا تنہائی کا سوال تو میں کبھی تنہا نہیں رہتی۔ ہزاروں یادیں ان گنت خیالات ہنگامہ برپا کیے رہتے ہیں۔"

"آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔"

"ہے، بے انتہا ہے۔ مجھے ہر ایک کی ضرورت ہے کسی کو نہیں کھو سکتی۔"

"ہوں، یہ آپ کے دوست میرا مطلب ہے وہ صاحب جو آپ کو روزانہ خط لکھتے ہیں بلکہ کسی روز دو دو خط روانہ فرماتے ہیں، بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

ڈاک منیجر صاحب کا چپراسی یعنی اسکول کا چپراسی ان کا خانساماں تھا جو اسکول کی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ان کے گھر کا بھی کام کرتا تھا۔ وہی روزانہ ڈاک لاتا تھا اور پہلے منیجر صاحب اس پر نظر

ڈالتے تھے بلکہ شاید سنسر کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ شہر کے لفنگے اسکول کی ٹیچروں اور لڑکیوں کو بیہودہ خط لکھتے ہیں۔ اس لیے وہ محتاط رہتے ہیں۔

میں سنائے میں رہ گئی۔ اگر منیجر صاحب نے خط سنسر کیے ہیں تو بس قیامت ہی ٹوٹی سمجھو جنیا کے خط بے حد خوبصورت شعروں سے سجے اور عشق کے فلسفہ میں ڈوبے بے حد نشہ آور ہوا کرتے تھے۔ وہ دوبار اور بریلی آچکے تھے۔ صبح آتے، ہم دن بھر ساتھ رہتے، شام کو چلے جاتے۔ پچھلی بار کار سے آئے اور ہم نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے تھے۔

منیجر صاحب کی حرکت پر میرا جی تو بہت جلا مگر میں نے اپنے چہرے سے نہ ظاہر ہونے دیا۔ میں نہایت ڈھیٹ ہوں۔

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی سید صاحب آ گئے۔

"بھائی صاحب! ملکۂ عالم نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ ان کے میکے سے امرودوں کا پارسل آیا ہے۔ کچالو بنائے گئے ہیں۔ آپا اور بچوں کے لیے بھیج دیے ہیں امرود۔"

"اچھا میں چلتا ہوں۔" منیجر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب خشک چہرہ بناتا ہے مجھے دیکھ کر جیسے میں اس کی بیٹی کا اغوا کرنے آیا ہوں۔"

"حالاں کہ آپ ملکۂ عالم کی بی بی کی آڑ فوراً لے لیتے ہیں پھر بھی۔ اور نیت میں کھوٹ بھی نہیں۔"

"کیا کھوٹے کھرے کی بڑی پرواہ ہے؟"

"روپیہ کھوٹا ہو تو کھلنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ صرف نیت کا کھوٹ تو..."

"ورغلا بھی نہیں سکتا؟"

"کیا صرف ورغلانے سے بھی قوت مردمی میں اضافہ ہوتا ہے؟"

"افوہ، بڑے بھائی صاحب آپ تو ہر بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔ اس وقت دل بہت اداس ہے۔"

"کیوں کیا کوئی نئے تعویذ سلگائے جا رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں، ہو سکتا ہے۔ پتہ ہے، میں ان تعویذوں سے کچھ ڈرنے لگا ہوں۔"

"کچھ کیا کافی ڈرنے لگے ہیں۔ یہ سعادت مندی کا ثبوت ہے اور آپ کو فخر ہونا چاہیے کہ آپ کافی بیٹی ڈرتا ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کا اُدش کلیان ہوگا۔ بچہ!"

"یہ پنڈا آپ پر بڑا حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ کیا بیہودہ کہانی چھپی ہے آپ کی ساتی میں۔"

"کافر؟ کیوں کیا بہت بُری ہے"

"لاحول ولا قوۃ، نہایت بیہودہ خیالات ہیں آپ کے، منیجر صاحب کو شکر ہے کہ پڑھنے کی فرصت نہیں ورنہ شامت آجاتی"

"کیا شامت آسکتی ہے یہی نا کہ نکال دی جاؤں گی بیک بینی دو گوش تو ویسے بھی میں سال کے آخر میں جارہی ہوں۔ دو مہینہ کی تو بات ہی ہے مگر کہانی پر آپ کو ذاتی طور پر کیا اعتراض ہے۔ کوئی نئی بات تو نہیں کہی آپ خود ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنے پر تلے ہوئے تھے وہی اڑ گئی کہ چھوٹی بی کو طلاق دو۔ اور کتنی ہندو مسلم شادیاں ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر کہانیاں بھی بہت لکھی گئی ہیں اور کسی زمانے میں تو اکثر رومینٹک کہانیوں کی ہیروئن پارسی حسینہ ہوا کرتی تھی"

"وہ قطعی اور بات تھی"

"وہ کیسے؟"

"ہندو عیسائی پارسی لڑکی، یعنی محبوبہ ہو سکتی ہے"

"اور ہندو عیسائی یا پارسی ہیرو نہیں ہو سکتا"

"بھئی میں چلا، جھاڑ کا کانٹا بن جاتی ہو۔ اچھا تو امرود کے کچالو"

"بھاڑ میں جائیں امرود کے کچالو"

"دیکھو تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ یہ بریلی ہے۔ اور یاد ہے وہ اصغری بیگم کا قصہ"

"ہاں یاد ہے، بھلا کوئی بھول سکتا ہے"

"تو پھر چلو"

"بس یہ دو خطوں کا جواب لکھ کر آتی ہوں"

اصغری بیگم!

سوامی سارد انند کا قتل!

ان کے قاتل عبدالرشید کو پھانسی!

جاورہ میں عظیم بھائی کے پاس اصغری بیگم کا خط آیا تھا۔ ان دنوں ان پر ایک آفت ٹوٹی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کے والد نے ایک کتاب "امت کی مائیں" لکھی جس پر مسلمانوں نے اعتراض کیا۔ اور وہ کتاب بین ہوگئی۔ شاہد صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی اسے پھر میدان میں لے آئے۔ اس پر احتجاج ہوا تو عظیم بھائی نے انھیں لکھا کہ کتابیں انھیں بھیج دی جائیں۔ ریاست جو دھپور خود مختار ہے اور برٹش

سرکار کی لگائی ہوئی بندشوں پر یہاں عمل نہیں کیا جاتا۔ میں اس کتاب کی حفاظت کروں گا دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔

یہ خط فوراً اخبار میں چھپ گیا۔ عظیم بھائی خود کو محفوظ سمجھنے لگے اور کتابوں کا پارسل وصول کرنے کی خبر بھی چھپوا دی۔

عظیم بھائی تانگہ میں کچہری جاتے تھے ایک دن دیکھا تانگہ تو موجود ہے مگر تانگہ والا کوئی نیا ہے۔ اس سے پوچھا تو بولا میرا بھائی بیمار ہے میں اس کی جگہ دو چار دن تانگہ چلاؤں گا۔ عظیم بھائی بیٹھ گئے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ دو آدمیوں نے تانگہ رکوایا۔

"ہم بھی کچہری جا رہے ہیں کوئی سواری نہیں مل رہی ہے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔۔۔"

"بیٹھیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

تانگہ والا ایک سنسان جگہ تانگہ لے گیا، روک کر دونوں آدمی اترے اور عظیم بھائی پر لکڑیوں کی بارش کر دی۔ دھان پان سے آدمی پہلی چوٹ میں ہی ڈھیر ہو گئے۔ دو چار اور رنگا کر وہ لوگ غائب ہو گئے مع تانگہ والے کے۔

عظیم بھائی کو ہوش آیا تو بڑی مشکل سے سڑک پر پہنچے تانگہ لیا اور گھر آ گئے۔

"تانگہ الٹ گیا۔" انھوں نے سب کو یہی بتایا۔ مگر اسحاق بھائی سب انسپکٹر تھے وہ ان کے گھسے میں نہیں آئے، کیونکہ تانگہ سے گرنے کی چوٹیں بیتوں کی مار سے مختلف ہوتی ہیں۔

"کتنے آدمی تھے؟" انھوں نے چپکے سے پوچھا۔

"دو، اور تانگہ والا۔" عظیم بھائی تبول دیے۔

دوسرے دن اخبار میں نکلا کہ جودھپور میں برٹش قانون نہ چل سکے لیکن اسلام جودھپور میں بھی زندہ ہے اور مسلمانوں نے ابھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔

دوسرے دن اسحاق بھائی بڑے ماموں چھوٹے ماموں جمع ہوئے اور جودھپور کے مسلمانوں کی شرائط پیش کیں۔

عظیم بیگ چغتائی مسجد میں آکر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں اور کتابیں جلائیں۔ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔

عظیم بھائی کا بخار اتر گیا تھا مگر بغیر سہارے چل نہیں پاتے تھے۔ نہا دھو کر بڑے ماموں کی موٹر میں مسجد گئے نماز پڑھی توبہ کی معافی مانگی اور مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے کتابوں کے ڈھیر کو آگ لگائی۔

مسلمانوں نے بڑی دریا دلی سے معاف کردیا اور خوب گلے ملے جس پر عظیم بھائی کا خیال تھا کہ اتنی زور زور سے بھینچنے کے بجائے دو چار بینت مار لیتے تو بہتر تھا۔

اس واقعے کی تفصیل چھپی تو ان کے پاس سینکڑوں خط آئے۔ کچھ شاباشی کے، کچھ احتجاج کے۔ ان میں ایک خط اصغری بیگم کا بھی تھا۔ عظیم بھائی نے جن خطوں کے جواب دیے ان میں سے ایک خط اصغری بیگم کا بھی تھا۔ ان کی کافی خط و کتابت چلتی رہی۔ ایک خط کے ساتھ انھوں نے اپنی زندگی کی داستان بھیجی جو کہیں شائع نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ نئے سرے سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ عظیم بھائی ہمیشہ مجھے اپنی دلچسپ ڈاک پڑھنے کو دیتے تھے۔

اصغری بیگم کی داستان حیات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اس کا خلاصہ اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ آج وہ ڈائری میری رہنمائی کا کام انجام دے رہی ہے اور میرا قلم وہ امرت اور زہر اگل رہا ہے۔

اصغری بیگم بے انتہا ذہین اور حسین خاتون تھیں۔ انھوں نے زندگی کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا تھا۔ بمبئی سے وہ ایک رسالہ تنویر بھی نکالتی تھیں۔ نظم و نثر دونوں پر دسترس حاصل تھی۔ مجھے ان کی جدّ و جہد نے بے انتہا متاثر کیا۔

میں نے سید صاحب کو ان کی شخصیت کے متعلق بتایا۔ ڈائری میں سے کچھ حصّے پڑھ کر سُنائے، وہ بھی سناٹے میں رہ گئے۔ اکتا کر بولے۔

" بھئی میں کسی ایسے فضیحتے میں ٹانگ نہیں اڑاتا جس میں جھگڑے کا امکان ہو، اور تمہیں بھی یہی رائے دوں گا کہ خواہ مخواہ صرف کسی کے جذبات کو ٹھیس لگا کر چٹخارے لینا حماقت ہے لوگوں کا مضحکہ اڑا کر، چڑھا کر ہم خیال نہیں بنایا جا سکتا۔ فرد کی آزادی پر ایمان رکھتی ہو؟ "

" قطعی "

" تو پھر کوئی کیا سوچتا ہے۔ کیا کرتا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑنے پر ایمان لانا چاہیے۔ تمہیں کسی پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ "

" اور وہ لوگ جو پڑھی لکھی لڑکیوں کو گالیاں دیتے ہیں کیا وہ مجھ پر نہیں جھپکتیں مجھے جواب دینے کا بھی حق ہے! جو پابندیاں میرا دم گھونٹتی ہیں۔ جنھوں نے بہت سی زندگیوں کو مسخ کر رکھا ہے۔ میرا جی جلتا ہے تو...."

" جلے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہو "

"اور کیا ان پر انگارے ڈال دوں"

"بڑے بھائی صاحب برادر خورد معافی چاہتا ہے۔ اتنی کڑوی باتیں کر کے منھ کا مزہ خراب ہو گیا۔ امردوں کے کچالو کا ایک دور ہو جائے پھر چاہے ٹکولیاں پیس کے حلق میں انڈیل دینا"

مگر ہم انجانے طور پر اصغری بیگم کا ذکر کرتے رہے۔

کچالو ہی نہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی کھایا۔ آپا کھانا لے کر بچوں سمیت آ گئیں۔ زاہدہ عابدہ اپنے گھر گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی بی بچوں پر قربان ہوتی رہیں۔

یہ کیا زیادتی ہے اللہ میاں۔ کہیں بچوں کی کیچڑ کہیں کسی گود میں ریت کے بگولے!

مگر چھوٹی بی کوئی بچہ گود کیوں نہیں لے لیتیں؟ کوئی کیا چاہیں تو گھر بھر سکتی ہیں۔ ہندوستان کے تو ہر خاک کے ذرہ کے ساتھ پھول رہا ہے۔

لاڈلی بیٹی۔ خاصی لاڈلی بیوی۔ ان کی زندگی کا المیہ ہے کہ ان کی گود سونی ہے مخلص ہیں!

اور اصغری بیگم کی گود میں تو بس انگارے ہی انگارے تھے۔

اصغری بیگم کی جھولی کے انگارے پھول بن گئے! ان کی ہمت اور جرأت نے انھیں عذاب دوزخ سے نکال کر جنّت ارضی بخش دی۔

انھوں نے عظیم بھائی کے نام ایک خط لکھا۔ خط تو بس نام کا تھا پورا ناولٹ تھا۔ انھوں نے وہ مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں اصغری بیگم سے بے انتہا متاثر ہوئی۔

عام طور پر جب عورت پر برا وقت پڑتا ہے تو وہ کسی مرد کو سہارا بنا کر اس دوزخ سے بھاگتی ہے۔ یہ رواج برہا برس سے ہر ملک میں چلتا آیا ہے اور آج بھی ہندوستان ہی میں نہیں یورپ اور امریکہ میں بھی نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے گھر سے بھاگ کر غنڈوں کے گروہ کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور گمراہی کے راستے پر پڑ جاتے ہیں۔ آج امریکہ کا یہ سب سے اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ پولیس مفلوج ہو چکی ہے کمسن لڑکیاں غربت کی ماری نہیں بلکہ رنگین زندگی کی بھوکی، والدین کے ضرورت سے زیادہ پیار سے اکتا کر یا واہیات ادب اور فلموں کے دکھائے گھر سے مسحور ہو کر بھاگ نکلتی ہیں۔ بڑے شہروں میں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں بڑے طاقتور گروہ انھیں اپنے شکنجے میں کس لیتے ہیں انھیں سبز باغ دکھائے جاتے ہیں ماڈل اور فلمی ہیروئن بننے کے، رومان اور جگمگاتی زندگی کے، پھر انھیں نشہ کی عادت ڈالی جاتی ہے یہ نشہ جب ان کی رگوں میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے بغیر زندگی دشوار ہو جاتی ہے تو پھر انھیں یہ نشہ آور زہر بیچنے اور جسم فروشی، اور مختلف جرائم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس بیوپار میں پولیس بھی ان غنڈوں سے ہار جاتی ہے کیوں کہ چھوٹے کارندے بڑے زبردست غنڈوں سے وابستہ ہوتے ہیں جو ان سے بھی بڑے غنڈوں کی مٹھی میں ہوتے ہیں جن کی پہنچ پولیس افسروں اور حاکموں تک ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار ان کا حکم بجالانے میں خیریت اور منافع حاصل کرتے ہیں ایماندار افسر کا جینا مشکل ہے اپنی روزی اور اپنے بال بچوں کی زندگی کی خاطر اسے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ پولیس کتنی بھی ایماندار ہو بے بس ہو جاتی ہے اور سمجھوتے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔

ہندوستان میں صدیوں سے کمسن لڑکیوں کو بہکا پھسلا کر گمراہ کرنے کا دستور چل رہا ہے۔ سماج سُدھار کی کوئی اسکیم کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ بازار کی زینت کے لیے کمسن لڑکیاں اور زبردست کاراج قائم کرنے کے لیے کارندوں کی ضرورت یہ اغوا کیے جانے والے معصوم بچے ہی پوری کر سکتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں چھوٹے پیمانے پر اور بڑے شہروں میں نہایت شاندار پیمانے پر یہ غیر قانونی قانون پھل پھول رہا ہے۔ مغرب سے ہتھیار مشین ہی نہیں خیالات، اصول سوداگری بھی امپورٹ ہوتے ہیں اور بڑے شہروں میں کمسن بچوں کے استعمال میں مغربی ہتھ کنڈے بڑے سودمند ثابت ہو رہے ہیں۔

آج جب میں ماضی کے گلی کوچوں میں سرگرداں ہوں زمانۂ حال میرے سامنے ہے۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ اور کلکتہ میں میں نے کمسن بچوں کی بدحالی کا مطالعہ کیا تین سال ہوئے میں نے گاؤں کا دورہ بھی کیا۔ ان والدین سے بھی ملاقات ہوئی جن کے بچے شہروں میں گم ہو گئے ہیں۔ پھر ان بڑے شہروں میں بازار حسن کے متعلق معلومات حاصل کیں، دلالوں سے ملاقات ہوئی۔ بڑی مشکل سے انھوں نے مجھے اپنا دوست سمجھ کر میری عزت افزائی کی کہ مجھے وہ معلومات پہنچائیں جس کی امید نہ تھی۔ میرے یہاں کتنی ہی لڑکیاں لڑکے آتے ہیں ہیں انھیں دکھی اور پریشان فنکار کہہ کر لوگوں سے ملاتی ہوں۔ میں انھیں نیچا نہیں سمجھتی بلکہ اس نظام پر لعنت بھیجتی ہوں جو انھیں اس طرح استعمال کر رہا ہے۔

پستی میں گرنے کے ہزاروں قصوں میں چند ایسی بھی داستانیں ہیں جن کے سہارے میرے دل میں انسان کی وقعت زندہ ہے۔

اعلیٰ بی، بانی علی گڑھ گرلز کالج نے مجھے کتنے ہی واقعات ایسے بتائے جن سے انھیں زندگی میں صرف کالج کے وجود کی وجہ سے واسطہ پڑا۔ ان واقعات کی تفصیل نہ پاپا میاں یعنی شیخ عبداللہ نے اپنی اور اعلیٰ بی کی سوانح عمری میں تحریر کی اور نہ کوئی ان کا تحریری ثبوت چھوڑا۔

مگر باتوں باتوں میں وہ ان لڑکیوں کا ذکر کرتی تھیں جو ان کی پناہ میں آئیں، تعلیم حاصل کی اور

زندگی میں کامیابی حاصل کی۔ ان میں سے ایک لڑکی تھی جس کا میں نام نہیں لوں گی جس کا میاں اور ساس اسے جسم فروشی پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ لڑکی پنجاب کے کسی گاؤں سے بھاگ کر آئی تھی بس گھر سے نکل پڑی تھی اس کے پیٹ میں چند ماہ کا حمل تھا یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ریل میں ایک ایسی بیوی مل گئیں جو علیگڑھ گرلز اسکول اپنی بیٹی کو داخل کرانے لے جارہی تھیں رحم کھا کر انھوں نے اس بدنصیب کو سہارا دیا اور اعلیٰ بی کے سپرد کر دیا۔

اعلیٰ بی گھبرا گئیں اسے بورڈنگ میں نہیں رکھ سکتی تھیں اسکول میں بھی داخل نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ اسے الف۔ب کی بھی پہچان نہیں تھی۔

اعلیٰ بی نے اسے اپنی رشتہ کی بھانجی کہہ کر ساتھ رکھا۔ گھر کا انتظام اس کے سپرد کر دیا یہاں تک کہ ان کی بیٹیوں کو بھی بڑے ہو کر اصلیت کا پتہ چلا۔ انھوں نے اسے بیوہ مشہور کر رکھا تھا اس کے لڑکا پیدا ہوا جسے سارا گھر بے حد چاہتا تھا اور دوسرے بچوں کی طرح اس کے نام کے ساتھ بھی عبداللہ لگایا جاتا تھا وہ بچہ اچھا لائق نکلا اور پاکستان میں بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔

اعلیٰ بی بتاتی تھیں ایک دن اچانک تین لڑکیاں سیدھی اسٹیشن سے کوٹھی پہنچیں، ان میں سے سب سے بڑی اٹھارہ انیس کی تھی دوسری چودہ پندرہ کی اور ایک بچی صرف چار سال کی تھی۔

اعلیٰ بی گھبرا گئیں اور بھی کئی لڑکیاں مفت بورڈنگ میں رہتی تھیں۔ نہ جانے کیسے مانگ تانگ کر اپنی ضروریات سے کاٹ کر بورڈنگ کا خرچ چل رہا تھا۔ ایک دم تین لڑکیاں جن میں سے ایک آتی ذرا سی بچی، بورڈنگ تھا یتیم خانہ نہیں کھولا تھا، راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

"اگر آپ نے پناہ نہ دی تو ہم تینوں کپڑوں میں آگ لگا کر بھسم ہو جائیں گے یا کوئیں میں کود پڑیں گے۔" بڑی لڑکی نے دھمکی دی اور اعلیٰ بی سہم گئیں۔

بورڈنگ میں لڑکی گم ہو سکتی ہے کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ کہاں گئی۔ ان تینوں کے والدین بقید حیات تھے۔ بڑی لڑکی کی شادی ایک بڑی عمر کے ٹھیکیدار سے ہوئی تھی جو پہلے ہی دو بیویوں کا شوہر اور درجن بھر بچوں کا باپ تھا اور بدنصیب لڑکی بالکل نوکروں کی طرح سارا کام کرتی پھر بھی سوت کے ایک عدد بھائی اس پر ڈورے ڈالنے لگے جب اس نے احتجاج کیا تو آوارہ اور بدمعاش ثابت کر کے چار چوٹ کی مار دی۔ لڑکی قرآن شریف اور اردو پڑھی تھی کسی رسالے میں علی گڑھ گرلز اسکول کا ذکر پڑھ کر بھاگ نکلی۔

دوسری لڑکی ایک بڑے بد دماغ نانبائی سے بیاہی ہوئی تھی جو اسے بہت دکھ دیتا تھا اور

مزہ یہ کہ تینوں نہایت گوری نازک نقشہ کی حسین لڑکیاں تھیں۔
کبھی ان تینوں بہنوں کا احوال پیش کروں گی کہ کس طرح یہ تینوں تاریکی سے نکل کر روشنی میں نہایت کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہوئیں۔
اصغری بیگم کے ذکر کے ساتھ ہی تین بہنیں یاد آگئیں جنھیں میں آج تک نہ بھول سکی۔

# جہنّم

باجی کی بارات کو خوش آمدید کہنے بہرائچ کے رؤسا اور افسر ہار پھول لے کر اسٹیشن پہنچے کسی نے دولہا کو نہیں دیکھا تھا۔ رات کو نکاح ہوا تھا۔ سب بچے پالے سو رہے تھے۔ ننھے بھائی ذرا پیچھے رہ گئے ایک وہی پہچانتے تھے۔ ڈبے میں سے سب سے پہلے ایک نہایت لمبے چوڑے حسین پینتیس سالہ جوان اترے سبز کمخواب کی شیروانی، چست پاجامہ، سبزی رام پوری باڑی ٹوپی باقی سب کچھ مرجھائے ٹھگنے۔

لوگوں نے جلدی جلدی انہیں دولہا سمجھ کر ہار پہنا دیے۔ انہوں نے ایک گرجدار قہقہہ لگایا اور بولے۔

"صاحبو میں دولہا کا چچا ہوں۔ بہرام خاں۔ وہ رہے صفدر میاں۔"

صفدر میاں کو دیکھ کر ابا میاں کو پسینہ آگیا۔ جیسے دق کا مریض لمبے بانس کی سی داڑھی، ماتھے پر شکنیں، آنکھوں میں تھکان۔

اتنا یاد ہے جھم جھم کرتی گوری گوری ڈھیر ساری عورتیں جب ڈیوڑھی سے اتریں تو چڑیلیں لگ گئیں۔ میں نے ایک نیم کی سوٹی سے سمدھنوں کی پنڈلیاں ادھیڑنا شروع کیں کہ یہ چڑیلیں میری باجی کو لینے آئی ہیں۔ مجھے کوئی گھسیٹ کے لے گیا اور میں باجی کے پاس چپک کر بیٹھ گئی۔ باجی بے حد زور زور سے کھانس رہی تھیں دور دور آواز جا رہی تھی۔

بہت دن بعد ایک دن چھوٹی آپا نے بتایا کہ باجی کی پہلے بھی ایک جگہ سے بات آئی تھی۔ نہایت لفنگا رنڈی باز زمیندار کا لڑکا تھا۔ کوئی خان تھا۔ دو ایک خون بھی کر چکا تھا۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ پڑھا لکھا خاک نہیں تھا مگر ان کے خاندانی جواہرات اور سونے کی پازیبوں کی بڑی

ساکھ بندھی تھی۔ خان کی اماں بیگم جب چند رشتہ دار بیویوں کے ساتھ لونڈیوں باندیوں کا غول سنبھالے آئیں تو ساتھ میں چاندی کی پندتیا اور خاصدان بھی تھا۔ اور وہ لڑکے کا کم سونے اور موتیوں کا زیادہ ذکر کر رہی تھی۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے کان پکڑ کے کہتی ہوں بُوا، پورا پان سیر کا چڑھاوا، پچاس ہزار مہر اور چھوٹی حویلی صاحبزادے کے نام ہے بی، اللہ آمین کا ایک ہی بیٹا ہے۔"

جب وہ چلی گئیں تو باجی بھن بھن کرتی پھریں۔

"ہم نہیں کریں گے اس کتّے سے شادی۔" باجی بڑی منہ پھٹ تھیں۔

"ہے ہے چپ نگوڑی۔ خبردار جو میرے سامنے زبان کھولی، منہ جھلس دوں گی۔" اماں نے ڈانٹا۔

"منہ جھلسو تو ذرا۔ سرکار سے کہہ دوں گی کہ"

"غضب خدا کا مُنّی۔ تجھ پہ اللہ کو سنوار، کسو نے سن لیا تو"

"اُنھ کیا کرے گا کوئی ہمارا"

پھر ایک دن اماں گئی ہوئی تھیں حکیموں گلی۔ صفی نانا کے ہاں وہ ان کے خالو تھے ظہور نانا کے داماد۔ خان کی اماں ایک باندی کے ساتھ آن دھمکیں۔

"اے بھئی ہماری سمدھن کہاں ہیں، اے سمدھن، بی سمدھن"

"کیا ہے؟" باجی اندر سے نکلیں۔

"اے بیٹی تیری اماں کہاں ہیں۔ لڑکی ساس سے رتی بھر شرم لحاظ نہیں، چھاتی پہ چڑھی چلی آتی ہو"

"تم خان کی ماں ہو؟"

"اوئی دیدہ تو دیکھو" وہ چوکی پر بیٹھ گئیں۔

"ہم تمہارے پاجی لڑکے سے شادی ہرگز نہیں کریں گے"

سمدھن کی گھگھی بندھ گئی، انھوں نے خواب میں بھی ایسی دیدہ پھٹی نہیں دیکھی تھی۔

"اری تیرا چیتا تو نہیں پگھل گیا"

"چیتا تو تمہارا پگھلا ہے بڑی بی"

"توبہ کچی . . ."

"تمہارا اتنا تو بیہودہ لڑکا ہے۔ لفنگا۔۔۔"

"بس بس، الٰہی توبہ ـــــ اری چل حرام زادی" انھوں نے باندی کے دھول جما کر کہا اور سر پیٹ بھاگیں، بڑبڑاتی۔

"اے غضب خدا کا لڑکی ہے کہ تیا مرچ، ارے میرے چاند کو ہزاروں لڑکیاں لاکر تھال میں سجا کر دیں گے بتھو ہے، کیا لڑکی اٹھائی ہے پھوپی نے۔"

ان کے جانے کے بعد جب اماں آئیں تو انھوں نے سر پیٹ لیا مگر باجی ہنستی رہیں۔

"اب کے آئیں گی تو اللہ قسم ہم ان کی پٹائی کریں گے۔" باجی دھم دھم کرتی کوٹھے پر چڑھ کر تنکول کے پیچ دیکھنے لگی۔ وہ چھپ کر کوٹھے پر خود بھی پتنگ اڑاتی تھی اور ڈور لوٹتی تھی جبھی تو اماں کو اس کی شادی کی اتنی جلدی تھی۔ لڑکیاں ویسے ہی والدین کی چھاتی کا بوجھ ہوتی ہیں پھر باجی جیسی دھوال دھار تو اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔

اور ابا کے کانوں میں بھی اڑتی اڑتی خبر پہنچی، انھوں نے چپ سادھ لی بھلا کیا کہتے انھیں بھی خان سے چڑ تھی۔ زمینداروں تعلقداروں سے دوستی تھی لین دین تھا کوئی بچہ پیدا ہوتا دور دور سے مہمان آتے طوائفیں آتیں۔ دو تین دن خوب اودھم مچتی، ناچ گانے کی محفلیں جمتیں۔ ابا میاں کو گانے ناچ سے بڑی دلچسپی تھی اور بڑی شاندار محفلیں جما کرتیں۔

مگر انھیں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کے رواج سے بڑی نفرت تھی۔ ایک سے زیادہ بیوی کے بھی شدت سے مخالف تھے۔

بہت پہلے جب صرف سات بچے تھے، شمیم میں اور جتنو نہیں پیدا ہوئے تھے ابا میاں جھنی سے کر آگرہ میں مکان بنوا رہے تھے ایک حصہ بالکل تیار تھا وہاں قیام تھا۔ اماں اور بچے نہیں آئے تھے۔

نہ جانے کیوں ایک دم اماں چھوٹے ماموں اور منے بھائی کو لے کے آگئیں۔ منے بھائی کی کھانسی وبال جان ہوگئی تھی۔ کئی مہینے سے چل رہی تھی۔ کچھ آب و ہوا کی تبدیلی، کچھ صفی نانا کا علاج، افاقہ ہونے لگا۔ اماں زیادہ تر حکیموں لگی رہتیں، کبھی پنجہ شاہی بھی آجاتیں، محلے میں دعوتیں ہوتیں۔ روز کہیں نہ کہیں جانا ہو جاتا۔

ایک دن بھینس والی بڑی اماں کے یہاں چمیلی کے منڈوے کے نیچے کھٹولی ڈالے پڑی تھیں کچھ شوہروں کی محبت اور بے وفائی کے قصے چل رہے تھے۔

"بھئی ہمارے میاں تو بس گوند ہیں، کیا مجال جو کسی سے آنکھ لڑائیں۔ آئے دن کے بچوں سے تو ذرا سانس لینے کی مہلت ملے۔"

"اے ہے خدا نہ کرے۔"

"سچی میں تو کہتی ہوں ایک آدھ اور کرلو۔"

"پھوپی بعض منہ سے نکلی بات پھل جاتی ہے۔"

"خاک پھلتی ہے۔"

"تو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ میں سوچ رہی تھی تم سے کیسے کہوں۔ میرے تو حواس گم ہو گئے جب سُنا تو۔"

"کیا سُنا؟" اماں کچھ بجھ گئیں۔

"سب تمہاری چہیتی نند بادشاہی خانم کا کیا دھرا ہے۔"

"نہ جانے کہاں کی ہانک رہی ہو بڑی اماں۔"

پھر بڑی اماں نے بتایا مکان بنوانے کا تو بہانہ ہے ر‌‌لیبا اٹھنا رہ گیا ہے مگر مرزا قیم بیگ آگرہ میں براجمان ہیں۔

"کبھی سوچا کہ کیوں؟" بڑی اماں بولیں۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔"

پھر بڑی اماں نے بتایا۔

راحت خالہ بڑے ابا یعنی ابراہیم بیگ چغتائی کی چھوٹی سالی کمسنی میں بیوہ ہو گئی تھیں میاں اچھی خاصی جائیداد چھوڑ گئے تھے۔ اردو فارسی کی اچھی خاصی تعلیم پائی تھی۔ کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ اماں سے دو چار سال بڑی ہوں گی۔ اماں تیئیس چوبیس کی ہوں گی۔ گول مٹول پیاری رنگت، سنہری گھنگریالے بال، شربتی آنکھیں، پھیلا ہوا نقشہ۔

اور راحت خالہ کے لمبے سیاہ ریشمی بال، دراز قد، دبلی پتلی حزن و ملال کی پتلی ترنم سے جب شعر پڑھتیں تو سننے والے جھوم اٹھتے کبھی کبھی کوٹھی میں محفل جمتی۔ ابا میاں بھی کچھ فارسی اور اردو کے شعر کہہ لیتے تھے کسی کو سناتے نہیں تھے۔ یا شاید ان کی صحبت میں رنگ شاعری جاگ اٹھی۔ بچوں کی ریل پیل، عہدے کی ذمہ داریاں، کتے مرغیاں گھوڑے بھینس بکریاں ایک ہنگامہ ایک دھوال دھار زندگی! اور پھر آگرہ کی سہانی شامیں، گلابی جاڑوں کی بہاریں، پر سکون نیا تعمیر کیا گھر خوش گوار رومانی سناٹا، اور چھلکتے ہوئے شعر۔

 

ابا میاں بھرپور مرد تھے۔ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے، ٹینس کھیلتے، باغبانی کرتے، یار دوستوں کی محفلیں، قہقہے ہنگامے۔

پھر راحت کا حسن سوگوار، تنہا زندگی، انھیں دولت کا لالچ نہیں، صرف دو میٹھے بول مہکتے ہوئے شعر، عمر خیام کی رباعیاں، انوری، فانی، حافظ شیرازی، میر اور غالب، ذوق، آشفتہ۔

اماں سنانے میں سانس روکے لیٹی رہیں۔ جیسے انھیں ہلتے جلتے ڈر لگ رہا ہو کہ کہیں بکھر نہ جائیں، پھر ریزہ ریزہ کون چن پائے گا۔

واپس آئیں تو میز پر کھانا لگا تھا۔ ابا میاں اخبار پڑھ رہے تھے۔

"کہاں جا کے بیٹھ رہیں، بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔"

اماں نے ہاتھ مار کر کھانے کی قابیں اُچھال دیں۔

"اب بس میری بھتی کھانا۔"

"بیگم!" ابا میاں نے اماں کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا، سہم کے رہ گئے۔ دل میں چور جو تھا۔

آج یہ الفاظ لکھ رہی ہوں تو میرا قلم ڈگمگا رہا ہے۔ وہ ہستی جس کو ہم خدا اور رسول کے بعد سب سے مقدس سب سے معتبر سمجھتے تھے۔ آج میرے قلم کی یہ مجال کہ مرزا قسیم بیگ چغتائی کی اکلوتی بھول، کمزوری اور اصول شکنی پر تنقید کر سکے۔ وہ ہستی جس کی زندگی کا کوئی رخ آلودہ نہ تھا۔ مجھے ان کی کوئی زیادتی کوئی ناانصافی، کوئی غلط قدم نہیں یاد۔ میں نے انھیں ہر پہلو سے ایک بھرپور مکمل انسان کی حیثیت سے دیکھا۔

راحت خالہ کا ذکر عموماً مذاق میں ہوا کرتا تھا۔

وہ بڑی محروم، بے انتہا دکھی اور اکیلی اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ شاید میرے آنے سے پہلے ہی وہ چلی گئیں۔

بات یوں نکلی کہ ایک دن شمیم نے اماں کے پاندان سے پیسے جھپٹ لیے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میرا بی اے کا نتیجہ آ گیا تھا اور ابا جو فالج کے بعد بالکل تندرست ہو گئے تھے آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔

"ہوں، تو تم پاس ہو گئیں۔" وہ بولے۔

"جی۔"

"ہوں، بیگم دعوت کرو گی؟"

"اے ہٹاؤ دعوت اس گرمی میں۔ او کمینے! ادھر لا میرے روپے"!
مگر شمیم نے روپیہ جیب میں ڈالے اور دور نِکل گئے۔
"دیکھ سؤر روپے واپس رکھ دے نہیں تو کھانا نہیں دوں گی"۔
"کونتے پکتے ہیں۔ اور شکر قند کی کھیر"۔ میں نے اطلاع دی۔
اور بڑے ماموں کے یہاں سے خشکہ اور ماری قلیہ آیا ہے۔ بھابی نے تخت پر سے خربوزے کے بیجوں کے چھلکے جھاڑتے ہوئے کہا۔
"کیسی کنجوس ماں ہے۔ ارے ابا میاں راحت خالہ سے خواہ مخواہ کٹی کرلی۔ یہ اماں تو ایسی ظالم ہیں کہ بات بات پہ کھانا نہیں دوں گی پانی نہیں دوں گی کیا حضرت عثمانؓ کی کچھ ظالموں سے رشتہ داری تھی"۔ حضرت عثمانؓ سے ہماری ننھیال کا شجرہ شروع ہوتا ہے۔
"اچھا زیادہ بک بک نہ کر بے حیا کہیں کا۔ غضب خدا کا چھوٹی بہن بی اے پاس ہوئی اور نگوڑا دسویں میں سڑ گیا"۔
"دیکھیے، ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتی ہیں۔ راحت خالہ ہوتیں تو ..."۔
"اے تو کیا ہے، اب بیاہ لاؤ نئی نویلی اماں"۔
"اچھا۔ تو یہ بات ہے"۔ شمیم نے ذرا کھمبے کی آڑ لیتے ہوئے کہا میں بھی سوت نہ لا کے بٹھا دوں تو میرا نام شمیم بیگ چغتائی نہیں۔
شمیم ایسے بھونڈے مذاق کرتا تھا پر اس طرح کہ ہنسی نہیں رکتی تھی۔ اس نے ایسا سنجیدہ چہرہ بنا کر دھمکی دی کہ اماں اور ابا دونوں کو ہنسی دبانی مشکل ہوگئی۔ شمیم نے آکر چپکے سے کہا۔
"دیکھ بڑے میاں کا چہرہ گلنار ہوگیا، دولہا بننے کے ذکر سے کھل اٹھے"۔
"چل بدتمیز"۔
"ارے تو کیا مذاق کر رہا ہوں۔ قسم خدا کی تھوڑا خضاب لگالیں تو اب بھی جوان دھرے ہیں۔ نہ چہرے پر جھری نہ ہاتھوں پر بڑھاپا"۔ پھر اونچی آواز سے بولے۔
"شرع میں تو چار کا حکم ہے۔ سچی نئی اماں کچھ تو خیال کرے گی"۔
اتنے میں ماموں آگئے اور کھانا لگنے لگا۔
کھانے کے بعد میں نے اماں سے پوچھا۔
"بی یہ راحت خالہ کا کیا قصّہ تھا"۔

تب انھوں نے شروع سے لے کر آخر تک سارا قصہ سنایا۔
کھانا الٹ کر اماں رونے بیٹھ گئیں۔
ابا خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔
"بیگم ہم تمہارے مجرم ہیں۔ ہم سے غلطی ہوگئی، ہم نے نکاح کر لیا۔"
"مجھے معلوم ہے۔"
"تم جو سزا دو ہمیں منظور ہے۔"
"میرے بچے بلوا دو، میں آگرہ میں رہوں گی۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم، ہم تمہارے اور بچوں کے بغیر کیسے جئیں گے۔"
"تمہاری لاڈلی۔"
"تم ہو ہماری لاڈلی، ہماری زندگی، ہمارا ماضی اور مستقبل!"
"مگر نکاح کرتے وقت ...." اماں کا گلا بند ہونے لگا۔ "سات بچوں کے باپ ...."
"ہمیں خبر نہیں ہم اس وقت کہاں تھے۔ جب ہمیں ہوش آیا اور نکاح نامہ پر ہم نے دستخط دیکھے تو ہمارے ہوش اڑ گئے۔ ہم اسی وقت وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔"
"پھوپی بادشاہی کے ہاں ہوا نکاح۔"
"ہاں۔"
"ہوں تو ان کے دل کی تمنا پوری ہو ہی گئی۔ میری مانگ اجاڑ کر چین آ گیا۔"
"ابھی تو ہم زندہ ہیں بیگم۔ کاش مر جاتے۔ نہیں ہمیں مرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم جینا چاہتے ہیں۔"
"میں جانتی ہوں بادشاہی خانم نے تمہیں کچھ کھلا دیا ہوگا۔"
"نہیں بادشاہی نے کچھ نہیں کھلایا۔"
"تو پھر اتنے ننھے تو نہیں۔"

اماں نہیں جانتیں انسان کبھی کتنا ننھا ہو جاتا ہے بالکل صفر رہ جاتا ہے۔ مگر ابا میاں جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ انسان اپنے بچاؤ کے لیے ذہن میں دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ جن خواہشوں کے آر پار نہیں دیکھنا چاہتا ان پر خود فراموشی کے دبیز پردے ڈال لیتا ہے خود اندر گم ہو جاتا ہے اور ڈھونڈ کر ہار جاتا ہے۔ ایک با اصول انسان کے لیے کوئی اصول توڑنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ جاگتے میں

خواب کی کیفیت طاری کرلیتا ہے۔ ریشم کے کیڑے کی طرح ایک خول بُن لیتا ہے۔

"مجھے طلاق تو نہیں دو گے؟" اماں نے ننھی سی آواز میں پوچھا۔

"طلاق! بیگم؟"

"میرے بچے طلاق من کے بچے کہلائیں گے۔ کوئی میری بیٹیوں کو قبول کرے گا نہیں کہ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ کوئی تو کھوٹ ہوگا کہ نسیم بیگ چغتائی کو طلاق دینا پڑی۔ اچھا میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ مجھے طلاق نہیں دو گے۔" انھوں نے ابّا میاں کا ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

"ہم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم اسے ہاتھ لگائیں تو ہم کریم بیگ چغتائی کے نطفے سے نہیں۔"

"ہے ہے نہیں، یہ ۔۔۔۔ یہ تو گناہ ہوگا۔"

"ہمارا ضمیر جس بات کو گناہ سمجھتا ہے۔ وہ گناہ ہے۔"

"اللہ کے واسطے یہ دہریہ پن غارت کرو۔ اللہ کا قہر ۔۔۔"

"ہم سہہ لیں گے۔"

"یہ تو کفر ہے۔ اس کا عذاب بچے بھگتیں گے۔"

"خدا کے ہاں قطعی ایسی اندھا دھند نہیں ہوگی۔ یقیناً ہر انسان اپنے اعمال کی سزا اور جزا پائے گا۔"

"سرکار" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

"ہاں بیگم؟"

"اب تم ہزار شادیاں بھی کرلو مجھے پروا نہیں۔"

"کیوں کیا اب تمہیں ہم سے محبت نہیں رہی؟"

"یہ بات نہیں۔"

"شریف بیویاں محبت نہیں کرتیں اپنے خدائے مجازی کی پرستش کرتی ہیں۔"

"بیگم پرستش پتھروں کی کی جاتی ہے، ہم انسان ہیں، تمہارے اپنے۔"

"تو بس آج ہی چلو، خاک ڈالو اس کوٹھی کو بنتا ہوئی بن جائے گی۔"

اسی دن اماں ابّا میاں کو لے کر کانپور روانہ ہوگئیں۔

کانپور میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ ابّا میاں کی عجیب پالیسی تھی ویسے تو انڈسٹرل

اور رئیسوں سے بڑے گہرے تعلقات رکھتے تھے ساتھ ساتھ ہر جمعہ کو نماز پڑھنے شہر کی مختلف مسجدوں میں ضرور جاتے مع بیٹوں کے اور وہاں کے مولویوں اور ملّاؤں سے مذہب فقہ اور حدیث پر بات چیت کرتے۔ دہریے تھے پھر بھی مختلف مذاہب پر مواد پڑھتے رہتے تھے ان کے مخالفین ان کے دہریے پن کی پبلسٹی کرکے ان کی مخالفت کرتے مگر ان کی پالیسی کے آگے مات کھا جاتے۔

ہندوؤں سے ان کے بہت جلدی مراسم پیدا ہوجاتے کہ وہ سمجھتے تھے یہ تو ناستک ہے۔

ابا میاں کی دوستی کی جڑیں بڑی مضبوط اور گہری ہوتی تھیں اور خاندانی دوستی قائم ہوجاتی بیویاں لڑکے لڑکیاں گھل مل جاتے۔ اماں جب اپنی ہندو سہیلیوں کی دعوت کرتیں تو مہاراج کو بلاکر بالکل کورے برتن منگواتیں کسی بچے تک کو اس طرف پھٹکنے کی اجازت نہ تھی بیویاں خود پوریاں بیلتیں پتلیں دھوکر لگاتیں عموماً برآمدہ دھوکر کھانا پروسا جاتا۔ ہمیں چھوت چھات سے الجھن ہونے کے بجائے مزہ آتا۔ بڑے سہمے ہوئے مؤدب سے الگ الگ رہتے۔ کچھ ایسا لگتا تھا ہم نے اسے چھولیا تو یہ لوگ بھسم ہو جائیں گے۔

"یہ لوگ کافر ہیں" جگنو، ہمارے لوجھ بجھکڑ فرماتے۔ "اگر ہم آیت الکرسی پڑھ دیں تو ابھی جل کر خاک ہوجائیں گے۔"

"نہیں جگنو مت پڑھنا شیلا میری دوست بھسم ہوگئی تو میں مر جاؤں گی۔" پچھلی پوجا پر اس نے مجھے سب سے چھپا کر ایک انگلی چندن دیا تھا جو شام تک میری مٹھی میں مہکتا رہا، صبح بھی خوشبو آرہی تھی۔"

اور جگنو تو نہایت پکے مسلمان تھے ہم سب سے پہلے قرآن پڑھ لیا تھا۔ مجھے تو پوری نماز بھی نہیں آتی تھی صرف ایک داڑھ کا روزہ رکھتی تھی۔

ہمیں یہ چھوت چھات کچھ پراسرار اور رومینٹک سی لگتی تھی۔ بیچارے ڈرتے ہیں کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے جب یہ احساس نہیں پیدا ہوا تھا کہ ہمیں گندہ سمجھتے ہیں یہ تو بڑے ہوکر پتہ چلا اور بہت غصہ آیا۔ یہی وجہ تھی کہ ابا میاں کو پتہ چل گیا کہ محرم میں بڑے زور کی فساد کی دونوں طرف تیاریاں ہورہی ہیں۔ انھوں نے کلکٹر سے کہا ہمیں پیش بندی کرنا چاہیے مگر اس نے کہا تمہارا وہم ہے اس قسم کے خیالات مت پھیلاؤ، کہ اسی رویّے سے فساد ابھرتے ہیں۔

کلکٹر نے ساری پیش بندیاں رد کردیں، مگر ابا میاں دونوں فرقوں سے راہ ورسم کی وجہ سے بہت پریشان تھے پلان یہ بنا تھا کہ اب کے تعزیہ اتنا اونچا بنایا جائے کہ جب سڑک پر سے گزرے

تو کنارے اُگے پرانے پیپل کے پیڑ کی ڈالیاں آڑے آجائیں گی۔

"بات راز کی ہے سرکار، پر آپ تو ہمارے اپنے ہیں۔" سرکی والا جس نے کیتو بوا کی کابک اور مرغیوں کے پنجرے بنائے تھے محرم میں تعزیوں کے ڈھانچے تیار کرتا تھا۔ اس نے اپنا محدود راز کی بات کہہ دی۔ "پورا ڈیڑھ فٹ تعزیہ اونچا رہے گا۔"

"ڈیڑھ فٹ نہیں گزر پائے گا؟"

"اچھی طرح پیڑ کی اونچائی ناپ لی گئی ہے سرکار۔ ڈالی کیا پورا تنا کاٹنا پڑے گا۔"

ابا میاں کی کوٹھی پر اس سڑک کے متصل نیم کا پیڑ بہت پرانا تھا اور گھنا تھا اس کی جڑ میں ایک چوکا سا بنا تھا جہاں پر گیروے رنگ چڑھا رکھا تھا۔ پتھر بیچ رکھ دیا گیا تھا جس پر لال اور پیلی سے سجاوٹ کی گئی تھی ایک قسم کا شوالہ سا لگتا تھا۔ پھول پتے کھیلیں بتاشے اور لکڑی دیا بھی کوئی چڑھا جاتا تھا۔ راہ گیر پیڑ کے نیچے پرنام کرتے اور نمسکار کر لیتے۔ نہ جانے کتنے سال سے کوئی اللہ کا بندہ پھول بھی چڑھایا کرتا تھا۔ خود ہماری ملازمہ پٹھانی بی کا عقیدہ تھا کہ پیٹ والی جمعرات کو پھول چڑھائے تو یقینی بیٹا ہونے کی گارنٹی ہے۔ کچھ دنوں سے لوگوں کی توجہ پیڑ کی طرف ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی تھی کلاوے بھی بندھنے لگے تھے مٹھائی کے دونے بھی چڑھنے لگے تھے جو سڑک پر بیٹھا فقیر فوراً جھپٹ لیتا۔ کبھی کوئی دوسرا بھی اپنا حق جتانے لگتا تو مار پیٹ شروع ہو جاتی اور مٹھائی کتے کے حصے میں آتی۔

اس سال محرم پر بڑا جوش و خروش تھا لکھنؤ کے بانکے بلانٹ آرہے تھے۔ کاکوری ملیح آباد کے ڈھول تاشے پیٹنے والے پٹہ باز مشعالچی آرہے تھے غرض بڑی دھوم تھی۔ ابا میاں کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں انھوں نے اپنے چند مخلص دوستوں سے جو دونوں فرقوں کے مہذب اور صلح پسند مزاج کے تھے یونہی تذکرہ کیا اور باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ سرکار اس فساد کی اہمیت کو نظر انداز کرنا چاہ رہی ہے۔ ابا میاں سرکار کے بڑے فرماں بردار مانے جاتے تھے دلوں میں ان کی عزت بھی تھی اور برٹش راج کے مخالفین کو ان سے نفرت بھی تھی۔ کچھ بھی ہو ابا میاں ہندوستانی ہی تھے۔ نوکری بھی اہم تھی اور خون خرابے سے خوفزدہ تھے۔

بڑے سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ جتنے لوگ دونوں طرف سے شریک ہو سکتے ہوں ہوں تکلف نہ کریں۔ کیوں کہ جس سڑک سے جلوس تعزیوں کا گزرنے والا تھا سڑک کے کنارے خلقت جمع ہوگی اگر اس بھیڑ میں خود نہ جا سکیں تو کم از کم تگڑے تندرست جوانوں کو تو بھیج ہی دیں۔ نوکروں ہی کو بھیج دیں۔

چند زمینداروں سے ابا میاں نے بات کی انھوں نے بڑے فخر سے اپنے لٹھیت بھیج دیے جو جلوس والے دن سے پہلے ابا میاں سے دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں ملے۔ اماں کو کچھ خبر نہ تھی۔ ننھے بھائی، اسحٰق بھائی، چھوٹے بھائی۔ اسحاق بھائی کے دو بڑے بھائی شفقت اور مقبول اور ابا کے دوست کے لڑکے ادہم عثمان اور ادہم سلیمان جنھیں انھوں نے چھوٹی سی عمر سے پالا تھا۔ ان کے علاوہ باورچی بہشتی دربان، اور دو تین چوکیدار جو مسلمان تھے مقرر کیے گئے کہ جب محلے سے تعزیہ گشت کے لیے اٹھے تو ساتھ ہولیں اور تعزیہ کے آس پاس ہی رہیں موقع ملے تو کندھا بھی دیں۔

پھر مالی دھوبی مہتر کوچوان گراسکٹ گھوسی اس کا مددگار نادیہ کے کام کے نوکر ہندوؤں کے ساتھ پیڑ کے آس پاس گھومتے رہیں۔

"کیا گولی چلے گی صاب؟" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں گولی نہیں چلے گی۔ مگر ہمارے ساتھ سپاہی انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ ہوں گے ہم جلوس کے آس پاس ہی رہیں گے۔ سپاہیوں میں زیادہ مسلمان ہیں اور ان سے ہماری بات نہ ہو سکی ہم نے کسی سرکاری ملازم سے بات نہیں کی ہے۔ ہمارا مقصد فساد کی روک تھام ہے۔"

"مگر سرکار وہاں تو دور دور سے غنڈے بلائے گئے ہیں۔"

"دس بارہ غنڈے بلائے گئے ہوں گے بس اتنے ہی فساد شروع کرنے کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں اور ہم نے گنتی تقریب تقریب معلوم کرلی ہے۔ ایک دفعہ جھگڑا شروع ہو جائے پھر تو غنڈے جان بچا کر سرک لیں گے احمق جوشیلے نوجوان گھمسان میں کود پڑیں گے۔"

ننھے بھائی کمسن تھے مگر خوب تگڑے تھے۔ باقی لڑکے بھی کافی چھوٹے تھے مگر عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے جب مار پیٹ میں لذت ملتی ہے۔ چند لوگوں نے چاقو لے جانے کی رائے دی ابا نے سختی سے منع کر دیا۔

"بینت بھی نہیں؟"

"تنکا بھی نہیں، ورنہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، جان پیاری ہے تو گھر میں بیٹھو۔"

اماں بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھیں چوڑیاں اتار دیتی تھیں سفید دوپٹہ عشرے تک اوڑھتی تھیں پہلی پانچویں ساتویں نویں دسویں کو شربت شیرمال کباب تر بتر حلوے بانٹے جاتے تھے۔

ابا نے نویں کی رات کو اماں کو بتا دیا کہ فساد کی روک تھام کے لیے ان کی ڈیوٹی لگی

ہے۔ اماں نے ماتم شروع کر دیا، گریبان میں جھول گئیں۔

"اب توزیادت ہو گئی ہم اپنی نوکری سے سبکدوش بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم نے غلطی کی تمہیں بتا دیا۔"

"اگر کچھ ہو گیا تو۔"

"ہم کہتے ہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟"

اماں مرعوب ہو گئیں۔ مگر صبح جب جانے لگے صدقے کا بکرا نیم سے بندھا تھا۔ اماں بار بار بیت الخلا جا رہی تھیں۔ سب لڑکیاں مغلانیاں اور محلے کی عورتیں جمع ہو کر قرآن خوانی کر کے اس میلوں دور سڑک کی طرف پھونک رہی تھیں جدھر سے جلوس گزرنے والا تھا اور موت کا فرشتہ منڈلا رہا تھا۔

اماں دروازے تک دوڑتی ساتھ چلیں۔ چوکھٹ پھلانگنے سے پہلے پکڑ لیا اور واپس لا کر دادی اماں کو سلام کروایا۔ بڈھی بی یعنی ابا کی پھوپھی اور اماں کی دادی سے دعائیں دلوائیں پھر قبلے کی طرف بٹھا کر کہا آیت الکرسی پڑھو۔

"بھئی یاد نہیں، دیر ہو رہی ہے تم پڑھ دو بیگم۔"

اماں کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا مگر خوب سی دعائیں پڑھ کر پھونکیں۔ اور بچوں کو قرآن پڑھنے بٹھا دیا۔

درجنوں ڈھول بج رہے تھے جھانجھ کانوں کے پردے پھاڑے دے رہے تھے پٹکے کمر میں گھنٹیاں ٹھنکاتے قدم بلند کیے بھاگتے نکل جاتے۔ اف اس موقع پر بچے کیسے ماں سے بچھل کر گل پڑتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ انگریز تھا اس کا منہ چقندر کی طرح لال ہو رہا تھا۔ سپاہیوں کی ٹولیاں دو رویہ پیدل چل رہی تھیں۔ اتنے بڑے جلوس کی نگہداشت پر صرف لاٹھی بند بارہ سپاہی تھے۔ انسپکٹر ہندو اور سب انسپکٹر مسلمان تھے۔ پوری پولیس فورس میں صرف تین چار ہندو باقی مسلمان اور ایک انگریز تھا۔ وہی ہوا جس کا پلان بنایا گیا تھا۔ تعزیہ صرف چند انچ بڑا تھا لانے والے جنون سے ابل رہے تھے اور کافی تعداد میں تھے پھر بھی چھ سات انچ کا سوال تھا۔ بوڑھے کندہ کاٹنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ دو چار منچلے پیڑ پر چڑھے۔ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

ابا میاں نے کہا "ٹھہرو" ان کی آواز میں ہاتھی کی چنگھاڑ تھی۔

ابا میاں ٹھیک کندے کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے لگے۔

"اگر کندہ نہ کاٹا جائے"

"تعزیہ نہیں نکل سکتا"

"اگر...."

"تعزیہ جھکے گا نہیں۔ بے حرمتی ہوگی"

"نہیں تعزیہ جھکے گا نہیں۔ مگر نکل جائے گا"

"وہ کیسے؟"

ایک دم تین چار آدمی پھاوڑہ لیے بھیڑ سے نکلے۔

"ہم سڑک کھود ڈالیں گے"

"مگر سڑک؟.... نئی سڑک"

"پھر بن جائے گی۔ کنکری تو کٹے ہیں" ابا پھاوڑہ چلانے لگے جلدی سے خانساماں نے پھاوڑہ چھین لیا اور جٹ گیا۔ ابا میاں نے دیکھا آس پاس بہت سے اپنے پیارے دوست خدمتگار موجود تھے۔

وات از دس نان سینس سپوائیلنگ دی نیو روڈ" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔

مگر دم بھر میں ڈیڑھ گز لمبی چوڑی فٹ بھر گہری قبر کی کھد گئی اور فرقہ وارانہ فساد دفن ہو گیا ابا نے لپک کر تعزیہ کو کندھا دیا۔ ان کا قد چھوٹا تھا دوسری طرف سے بہشتی نے اچک لیا دو چار اور بڑھے باقی کے لوگوں کو تعزیہ کا توازن قائم کرنے کے لیے گھٹنوں میں جھول ڈالنا پڑا۔

ابا میاں کی اس پالیسی کا شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا۔ فسادپسند تو گنتی کے ہی ہوتے ہیں اکثریت تو صلح پسندوں ہی کی ہوتی ہے۔ نہ خون خرابہ ہوا نہ گولی چلی۔

تھوڑی دیر تو انگریز افسر چیں بہ جبیں چلتا رہا۔ پھر اس کے چہرے سے رعونت کی سرخی اترنے لگی اور دہی کے اتوار شکار کا پروگرام بن گیا۔ ابا میاں چٹکیوں میں بڑے دیرپا دوست بنا لیتے تھے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ اتنی کامیاب ترکیب پر ابا میاں کو ترقی ملے گی۔ انھیں حساب سے کلکٹر بنا چاہیے تھا خان بہادر کا خطاب تو سن گیارہ میں مل گیا تھا۔ مگر جب ان پر کمیٹی بیٹھ گئی

اور سسپینڈ کردیے گئے تو سب مبہوت رہ گئے۔

"آپ کو معلوم تھا کہ فساد ہوگا"

"جی ہاں" ابامیاں نے جواب دیا۔

"کیا اس میں شریک تھے"

"نہیں"

"تو پھر آتنی پکی خبر کیسے ملی"

"میرا رسوخ ہے۔ شہر کے دونوں فرقوں کے لوگوں سے میرا گہرا تعلق ہے۔ میں کان کھلے رکھتا ہوں اور دماغ حاضر"

مگر کمیٹی کے ممبر انگریز تھے صرف دو ہندو اور مسلمان تھے جو بالکل گم صم بیٹھے تھے اور ہر بات پر رضامندی کا اظہار کر دیتے تھے۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا اس کے نتیجے میں فساد ٹل گیا اور تمام وہ فسادات جو دوسرے شہروں میں یہاں کی خبر سے ہونے والے تھے ماند پڑ گئے۔ ہوئے ہی نہیں اور ہوئے تو بہت کمزور"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے سڑک کھودنے کی اجازت نہیں لی تھی اور جو بھی پلان بنایا تھا اسے ہمارے سامنے پیش کر کے عمل پیرا ہونے کی اجازت نہیں طلب کی۔ اس سے تمہاری باغیانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے جو حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔" پھر اباّمیاں کے وکیل بولے۔

"ایک شہری کی حیثیت سے میرے موکل نے جو قدم اپنی ذمہ داری پر اٹھایا وہ درست ثابت ہوا۔ صرف سڑک کھودنے پر میونسپلٹی باز پرس کر سکتی ہے اور جرمانہ ہو سکتا ہے"

"سرکاری افسر کو شہریت کے سوال کو بعد میں لانا ہوگا۔ پہلا سوال ڈیوٹی اور پروٹوکول کا ہے۔ ہر بات قاعدے سے ہونی چاہیے۔ اصول توڑنا بغاوت کی نشاندہی کرتا ہے"

اور اباّ کو وہ انگریزی نظم یاد آگئی Charge of the Light Brigade :

They're not to reason why,

They're but to do and die.

جب وکیل نے جو بڑے کٹر ہندو تھے۔ یہ نظم دھیمی آواز میں دوہرائی تو کمیٹی کے ممبر بیحد بگڑے مگر اباّمیاں بالکل مطمئن تھے۔ ان کی ترقی نہیں ہوئی معطلی کے احکامات منسوخ ہو کر تبادلہ

ہوگیا۔ کیوں کہ مشراجی نے لندن تک جانے کی دھمکی دے دی تھی۔ بات رفع دفع ہوئی اور ابا کانپور کے دوستوں کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے جہاں ان کا پہلے بھی تقرر ہوا تھا جب چھوٹی آپا پیدا ہوئی تھیں۔

میری یادداشت مجھے پھر واپس لوٹا کر بہرائچ لے جارہی ہے۔ ہمارا پہلا مکان معمولی سا تھا۔ آس پاس کے مکانات تھے جن سے اماں تو خوش تھیں ابا میاں کو وحشت ہوتی تھی۔ اس گھر کا مجھے املی کا پیڑ یاد ہے۔ جو دیوار کے پیچھے صغریٰ، بتول کے گھر میں تھا مگر آدھا ہمارے آنگن میں جھک آیا تھا قریب نہ کھیت تھے نہ جنگل، پھاٹک کے آگے سڑک تھی اس لیے پہرے دار کسی بچے کو باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ گھوڑے صرف دورہ کے لیے تھے۔ دو بھینسیں بھی تھیں مرغیاں بھی جھابلوں میں بھر کے ریل سے آگئی تھیں۔ احاطہ بہت بڑا نہ تھا مگر دیوار پھاند کر کود جاتے تو ایک پرانی دھنسی ہوئی کوٹھی تھی۔

گرو کا کہنا تھا وہاں بھوت رہتے ہیں۔ ہماری ننھیال کے لوگ بڑے باتونی تھے اور جگنو بھی بڑی لمبی چوڑی باتیں بگھارا کرتے تھے۔ وہ بے گڑھ کے بھوتوں چڑیلوں اور جنوں کے قصے سنا کر روح قبض کیا کرتے تھے۔ بندروں کو ہنومان جی کا رشتہ دار کہہ کر ہمیں انھیں سلام کرنے کی رائے دیتے تھے اور ہم ہنومان جی سے بے حد مرعوب تھے۔ کوچوان جھنگری رام کے پیچھے پڑ کر ہم ان سے رامائن کی کہانیاں سنا کرتے تھے۔

ہنومان جی کی دُم میں آگ لگی تو ساری لنکا پھونک دی۔ بچپن سے میری عادت ہے کہ جو بھی کہانی سنتی تھی تخیل میں وہ سارا ڈرامہ نظر آنے لگتا تھا۔ اب تو فلموں میں دیکھا مگر کس سے پہلے جب بہت چھوٹی تھی جب ہی میں نے کوچوان سے سن کر ہنومان جی کو لنکا پھونکتے دیکھ لیا تھا۔ بندر جو عموماً بے وقوفی کی حرکتیں کرتے ہیں مجھے بے حد ہوشیار نظر آتے تھے جیسے ابھی بول پڑیں گے۔ اور پھر جھنگی پر پہاڑ اٹھانا کمال تھا۔ لکشمن جی گھائل ہو گئے تب سنجیونی بوٹی لانے ہنومان جی چلے، بوٹی بہت ڈھونڈی نہ ملی تو پورا پہاڑ اٹھا لائے۔ مجھے بے حد ہوشیاری کی بات لگتی تھی۔ مجھ سے جب کوئی خاص تاگہ یا سوئی منگوائی جاتی تو میں بار بار کے چکر اور ڈانٹ سے بچنے کے لیے پوری بقچی اٹھا لاتی تھی اس پر مجھے ڈانٹ پڑتی تھی کہ کاہل شخص ہوں۔ اور میں بقچی واپس رکھتے ہوئے بڑی فکرمند ہوجاتی تھی کہ ہنومان جی نے بھی پہاڑ واپس لوٹایا ہوگا کہ نہیں۔ کوچوان سے پوچھنا کبھی یاد نہ رہا۔

جب بھی بڑے سُر میں جھوم کر کوچوان کوی رامائن کی کتھا سُناتے آخر میں کہتے۔

"بولو شری رام چندر کی جے۔"

اور ہم بڑے زور کی جے جے کار کرتے۔ کہانی کا بہترین حصہ گلا پھاڑ کر جے جے کار کرنا ہی لگتا تھا۔ اور کوچوان کا کہنا تھا، جو ایک بار بھی رام نام لے لے اس کا کلیان ہو جاتا ہے۔

لیکن جگنو نے کہا جے جے کار کرنے کے بعد میری زبان دوزخ میں جلے گی مجھے دوزخ سے بہت ڈر لگتا تھا میری سٹی گم ہو گئی۔ دوزخ کے اتنے بھیانک نقشے جگنو نے کھینچے تھے اور میں نے تخیل میں خون پیپ کے پیالے پیتے، آروں سے چرتے، انگاروں پر کباب ہوتے، سانپ منہ میں گھستے دیکھ کر سوتے میں چیخیں ماری تھیں۔ میں کسی شرط پر دوزخ میں جانے کو تیار نہ تھی! ادھر کوچوان کہتا تھا شری رام چندر کی جے نہ بولی تو نرک میں جاؤں گی۔ نرک کمبخت بھی خوفناک جگہ ہے وہاں بھی سانپ بچھو انگارے اور جسم کو چیرنے کے اوزار ہیں۔ جن کے خیال سے ہی روح فنا ہوتی ہے۔

میری بڑی مشکل ہے۔ اندرا کہتی ہے اگر میں نے جیسس کرائسٹ کے اسٹیچو کے سامنے گھٹنے ٹیک کر گناہوں سے توبہ نہیں کی تو صفا ئیل میں جاؤں گی۔ میں ان تینوں خوفناک مقامات پر جانے پر راضی نہیں، مگر جگنو کہتے ہیں گرز مار مار کر مجھے لے جایا جائے گا۔

"میں کہیں بھاگ جاؤں گی۔"

"ارے فرشتوں سے کہاں بچ کر بھاگو گی!"

جب باجی تھی تو کوئی مارنے کی دھمکی دیتا تو باجی کی گود میں چھپ جاتی تھی مگر باجی کہاں ہو گی وہ تو اپنے لمبے بانس دولہا کے ساتھ سسرال گئی۔ اور میں دنیا بھر کی سسرالوں کا ماتم کرنے لگتی۔ اُف! نفرت تھی مجھے ان نامعقول سسرالوں سے۔ یہ بھی کوئی چوتھی جگہ ہو گی، دوزخ نرک اور ہیل کی رشتہ دار سسرال! بھابو کے ہاں بڑی زور دار مجلسیں ہوا کرتی تھیں صغریٰ اور بتول بے حد زور کا ماتم کرتی تھیں۔ میں اور بچوں کے ساتھ مجلسوں میں تبرک کی تاک میں جاتی تھی اور مرثیے سُن کر بے حد بور ہوتی تھی۔

پھر میں کچھ بڑی ہوئی اور غور سے سننے لگی تب بھی کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آیا، مگر ایک دن علی اصغر کی شہادت کا بیان میرے پلّہ پڑ گیا۔ چھ ماہ کے معصوم بچّے کے گلے میں تر چھلا تیر لگا اور

وہ خون میں لت پت ہو گیا۔

سب بیویاں اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ مجھے بھی بہت زور سے رونا آگیا۔ بیویاں تو نہایت مہذب انداز سے نے سُر میں رو رہی تھیں میں بے حساب چنگھاڑنے لگی میری آواز ہمیشہ جملہ رونے والوں سے اونچی جاتی تھی۔ ساتھ میں میں نے دیں چاندنی پر مچلنا شروع کر دیا۔ احتجاج کا یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب ثابت ہوا کرتا تھا۔

مگر الٹا اثر ہوا مجھے ڈھٹائی سے مچلنے پر گھسیٹ کر مجلس سے باہر کر دیا گیا اور دوسرے بھی میرے ساتھ ہی نکال دیے گئے۔

گھر پہنچ کر بھائیوں نے میری شکایت کی۔

"بھتنی وہاں مچلنے لگی ہم سب کو نکلوا دیا۔ مٹھائی بھی نہیں ملی۔"

"کیوں مچل رہی تھی؟"

"تو کیوں مارا؟"

"کسے؟ ناشدنی۔"

"چھ مہینے کے بچے کو۔ ذرا سا تھا بے چارہ۔"

"اے ہے کس کا بچہ مر گیا۔" خالہ اماں خرانے روک کر چونکیں۔

"اے دیوانی ہے کمبخت۔"

"تو مارا ہی کیوں؟" میں اڑ گئی۔

"اے نہ جانے کیا بک رہی ہے خرافات۔ چل دور ہو۔"

میں روتی ہوئی لحافوں والی کوٹھری میں میلے گاؤ تکیے سے لگ کر خوب روئی۔

رات کو مجھے اکیلے سوتے ڈر لگ رہا تھا۔

شیخانی بوا تمہارے پاس آ جاؤں۔"

"آ جاؤ۔" انھوں نے سرک کر مجھے پاس لٹا لیا۔ باجی کے بعد جب شیخانی بوا کو فرصت ملتی تو میری جوئیں نکالتیں۔ پانچ پھول میں تلنے والی شہزادی کی کہانی سناتیں۔

"پھر بھی ایک روز چھ پھول چڑھ گئے پر پلہ نہ جھکا۔"

"کیوں کیا بہت موٹی ہو گئی تھی شہزادی بہت کھاتی تھی۔" میں خود بھی تو بہت کھاتی تھی۔

"ارے ناہیں، اُو کا سپنے میں سہ جادا دکھائی دے گوا۔"
"شہزادے نے اسے بھاری کر دیا۔"
"ناہیں بھائی، اُو بات ای ہے کہ اُو کا سہ جادے سے عسک ہوئی گوا۔"
"عسک کیا ہوتا ہے بوا؟"
"اے بھائی تم تو بھیجا کھائے جات ہو۔ بھاگو ہم نہ سُناویں گے کہانی۔"
اُف، میری "کیوں" بڑی بے ڈھب تھی۔ میں نے ٹیڑھی بوا سے پوچھا۔ "علی اصغر کو کیوں مارا؟"

"کا معلوم۔"
"کس نے مارا۔"
"اُجید مارس رہے۔"
"کیوں۔"

"ارے بھائی ہم کا جانی، اُو کھراب رہے بچے کا مار ڈارس، اب سوئی جاوَ۔" اور میں سو گئی تھی۔ مگر رات کو کئی بار چونک کر چیخیں مارتی رہی۔

وہ تو چند سال ہوئے ایک مجلس میں اصغر معصوم کی شہادت کا ذکر سُنا تو مجھے یاد آیا کہ وہ حضرت ازیس تھے جنھوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

جب رن میں حسین اصغر بے پر کو لائے ۔۔۔ لختِ جگر بانوئے دلگیر کو لائے
جلّادوں میں اس صاحب توقیر کو لائے ۔۔۔ ہاتھوں میں دھرے چاند کی تصویر کو لائے
شبّیر نے اس چاند کو ہاتھوں پہ اُٹھایا
اور پھر، چلّے سے کماں باز نے وال تیر ملایا
تب خم ہو کے اسے مثل کماں شہ نے بچایا ۔۔۔ مانند اجل ناوکِ ظلم و ستم آیا
شبّیر چھپاتے رہے نازوں کے پلے کو ۔۔۔ بازو پہ لگا توڑ کے ننھے سے گلے کو
دل سہم گیا چونک پڑے اصغر مہ رو
گردن سے لہو بہنے لگا آنکھ سے آنسو
فوّارہ چھٹا حلق سے بچّے کے لہو کا ۔۔۔ سب خون میں تر ہو گیا ننھا سا شلوکہ
دم آ کے رکا حلق میں اس تشنہ گلو کا ۔۔۔ خوں منھ سے اگلنے لگا وہ دودھ کا بھوکا

ابا میاں سے میری شکایت کی گئی۔

"ابا میاں، یہ سوریا ماتم کرتی ہے" شمیم کافی بدذات ہے۔ ہر دم لگائی بجھائی سے کام۔

"تم ماتم کرتی ہو" ابا میاں نے مجھے پاس بلا کر پوچھا۔ میں نے منڈیا ہلادی۔

"کیسے کرتی ہو؟" میں نے نمونہ پیش کیا۔

"ایسے نہیں" ابا میاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے سینے پر مارا۔ "جتنی زور سے ماتم کرو اتنا ہی زیادہ ثواب ملتا ہے"۔

"اوئی یہ کیا کمبخت کو شہ دے رہے ہیں۔ ویسے ہی دیوانی ہے۔ ماتم کرنا حرام ہے۔ گناہ ہوتا ہے" اماں بولیں۔

"یاد ہے تمہاری مینا کو بلی کھا گئی تھی تو کتنا ماتم کیا تھا"

"اے واہ میں نے چھاتی تو نہیں کوٹی تھی"

"ماتھا تو کوٹا تھا"

"اے جب تو نادان تھی"

"تو یہ بے چاری کون سی بوڑھی ہو گئی ہے۔ بیگم بھیانک مظالم کے ذکر سے بچے سہم ہی جاتے ہیں تو کیا گناہگار ہوتے ہیں۔ خیر تم اپنی نذر و نیاز سے اچھا خاصہ ثواب کما لیتی ہو۔ ہم سب کی مغفرت ہو جائے گی۔ اور سنا ہے تم نے ہمارے گردے کے آپریشن کے وقت اجمیر میں چادر چڑھائی اور پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو ستیہ نارائن کی کتھا بھی کروائی۔ پنڈت جی کو دھوتی اور دو شالہ دیا۔ ہم نے تم سے پوچھا بھی نہیں۔ تم نے ہمارے لیے جو کچھ بھی کیا وہ گناہ تھا یا ثواب، حرام تھا یا حلال، ہم نے تم سے کبھی کچھ نہیں پوچھا"۔

میری بڑی مصیبت میں جان تھی۔ کوچوان کہانی نہیں سناتا۔

"شبری نے شری رام چندر کو جھوٹے بیر کھلائے تھے۔ وہ کہانی سناؤ کوچوان" میں خوشامد کرتی ہوں۔

"پھر سیا رام چندر کی جے بولو گی؟" وہ شرط لگاتا ہے۔ میں راضی ہو جاتی ہوں۔

"شبری نے شری رام چندر جی کو بیر کھلائے تو آدھے کاٹ کاٹ کر......"

"کیوں؟"

"کہ بیر میں کوئی کیڑا وِیڑا نہ ہو، اچھے اچھے بیر کھلائے، کیڑا لگے بیر پھینک دیے۔" بولو

سیارام چندر کی جے۔ میں ادھر اُدھر دیکھ کر جے بول دیتی ہوں۔ ورنہ پھر وہ سروپ نکھا کی ناک کان کاٹنے کا قصہ ہرگز نہیں سُنائے گا۔ ادھر ادھر اس لیے دیکھ لیتی ہوں کہ جگنو کہتے ہیں جے بولنے سے سخت گناہ ہوتا ہے۔ میری زبان میں فرشتے کانٹے چبھوئیں گے۔ اور دہکتی آگ میں میری زبان جلائی جائے گی۔

میں رات سے بہت ڈرتی ہوں، ڈراؤنے خواب مجھے بہت ستاتے ہیں۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ میری زبان دہکتے کوئلوں پر مینڈک کی طرح پھدک رہی ہے میں چیخنے لگتی ہوں اور دھوکہ مار کے جگادی جاتی ہوں۔ پھر آنکھ بند کرتے ڈرتی ہوں۔ جگنو کی رائے ہے کہ مجھے زبان پہ کونین ملنی چاہیے مگر کونین تالہ میں رہتی ہے اس لیے صرف نمک سے زبان گھس کر پاک کرلیتی ہوں۔ مجھے دوزخ سے بہت ڈر لگتا ہے اور کوچوان کے نرک سے بھی اور شیلا ناس کے ہیل سے بھی، کیونکہ تینوں بہت ڈراؤنے ہیں۔

اب میں ان تینوں مقامات میں سے کسی میں بھی نہیں جاؤں گی۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تو بس جنت ہی میں جاؤں گی۔

" دیکھ لینا فرشتے تمہیں دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔" جگنو ڈراتے ہیں۔

"میں ایسی سرپٹ بھاگوں گی کہ بس۔"

"کہاں بھاگو گی تی۔"

" لحافوں والی کوٹھری میں چھپ جاؤں گی، مگر میں جگنو کو نہیں بتاتی۔ وہ اتنے وثوق سے احکامات الٰہی صادر فرماتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ان کا کافی رسوخ ہے۔ انھوں نے قرآن شریف جو ختم کرلیا ہے۔ اور میں پہلے سیپارے میں ہی پھنسی ہوں۔

نہیں، میری مکتی محال ہے۔

مگر خیر خط آیا ہے کہ باجی آرہی ہیں۔ میرا وجود جاگ پڑتا ہے۔

# روشنی — روشنی — روشنی

لکھنؤ جانے کے لیے میں پہلے علی گڑھ گئی۔ مجھے لکھنؤ کا جغرافیہ قطعی نہیں معلوم تھا بھلا جودھپور سے سیدھے لکھنؤ کیسے جاتی؟ ویسے علی گڑھ میں کچھ دل کو ڈھارس بندھانے والے بھی تھے۔ نیا قدم اٹھانے سے پہلے پاپا میاں اور اعلیٰ بی سے بات چیت کرنا چاہتی تھی بجائے اپنی ممانی جان کے یہاں ٹھہرنے کے خاتون آپا سے اجازت لے کر بورڈنگ ہاؤس ہی میں ٹھہری۔ نصیر تو لاہور کینئرڈ کالج ایک سال پہلے ہی چلی گئی تھیں۔ حمیدہ سلام الدین فرسٹ ایر میں تھی۔ پہلے بھی اس کے ساتھ رہی تھی۔ معلوم ہوا علی گڑھ سے تو کوئی لڑکی لکھنؤ نہیں جا رہی ہے اس لیے اکیلی ہی لکھنؤ روانہ ہو گئی۔

لکھنؤ کا پلیٹ فارم ہی علی گڑھ کے مقابلے میں مرعوب کن ثابت ہوا۔ اس وقت علی گڑھ میں سب ہی سڑکیں کنکری تھیں اور بے حد ناہموار۔ لکھنؤ میں پہلی بار سیمنٹ کی سڑک دیکھی۔ جبکہ جودھپور ابھی نہایت پچھڑا ہوا تھا۔ لکھنؤ ان مقامات کے مقابلہ میں پیرس لگ رہا تھا۔

جب میرا تانگہ کالج کے پورٹیکو کے سامنے رکا تو چند منٹ میں ساکت کھڑی پورٹیکو کے بلند ستون نظروں سے ناپتی رہی۔ میں نے اتنی شاندار عمارت پہلی بار دیکھی تھی۔ آئی ٹی کالج ایشیا کا سب سے شاندار ویمنز کالج تھا اور شاید اب بھی ہے کوئی اور کالج اتنا وسیع اور مرعوب کن نہیں۔ آئی ٹی کالج سے شاندار یونیورسٹی برسوں بعد صرف ماسکو میں نظر آئی۔ جہاں جا کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

پرنسپل مس فتین کے سامنے پہنچی تو انھوں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا خوش آمدید کہا جیسے میں کوئی معزز مہمان ہوں۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، نہایت معصوم صورت، گلاب کی پنکھڑی جیسا رنگ، گہری نیلی آنکھیں، سر پر روپہلے بالوں کا تاج، بھاری بھرکم جسم۔ اتنی زور سے میرا ہاتھ دبایا کہ انگلیاں چٹخ گئیں۔

لی ودق کالج میں تنہائی کے خوف سے میں نے ڈبل روم پسند کیا۔ خدا جانے کون میٹ ملے گی۔ میں چند نووارد طلبا۔ میں سے تھی۔ بورڈنگ ہاؤس خالی پڑا تھا۔ میٹرن نے مجھے کمرہ پسند کرنے کی اجازت دے دی۔ دو پلنگ پڑے تھے میں نے ایک پر بستر بچھا کر ایک نہایت بھڑکدار مارواڑی بندھائی کے کام کا پلنگ پوش بچھا دیا۔ کپڑے الماری میں جما دیے۔

اب سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ بس جدھر منہ اٹھا چلنے لگی۔ چہرے پر بڑی سنجیدگی جیسے نہایت ضروری کام سے جا رہی ہوں اور قطعی جہاں جانے کا قصد ہے پہنچ جاؤں گی۔

دو چار لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی قہقہہ لگاتی گزر گئیں انھوں نے جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ تنہائی کا احساس دم گھونٹنے لگا۔

دوپہر کا کھانا ہی نہیں کھایا کہ پتہ ہی نہیں تھا کہاں ہے ڈائیننگ روم۔ رونے کو جی چاہ رہا ہے۔ شام کی چائے کی گھنٹی پر میں نے آواز کی سمت قدم اٹھا دیے اور ڈائیننگ روم کا سراغ مل گیا۔ اکا دکا لڑکیاں بیٹھی آپس میں بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔

بھوک بہت لگی تھی ورنہ میں تو کھانا گول کر جاتی۔ اکیلا پن کھائے جا رہا تھا۔

"تسیں پنجابی او"۔ ایک چھوٹے سے قد کی گول مٹول سی لڑکی آ کر سامنے بیٹھ گئی۔

"نہیں"۔

"میں پنجابی ہوں، ایلما موہن لال"۔

میں نے اپنا نام بتایا جو مشکل سے گرفت میں آیا۔

حالاں کہ تم پنجابی لگتی ہو اور میں ہندوستانی"۔ عموماً پنجابی اپنے علاوہ سب کو ہندوستانی کہتے تھے۔

"کیا سبجیکٹ لیے ہیں۔ میں نے تو پالٹیکس اور اکنامکس لی ہے"۔

"ارے یہی سبجیکٹ میں نے بھی لیے ہیں"۔ ایلما چہکی "کون سے ہوسٹل میں ہو"۔

"نشاط میں ڈبل روم ہے"۔

"ارے بابا اپن تو ڈارمیٹری میں ہیں"۔

"تو میرے کمرے میں آجاؤ"۔

"نا بھئی بہت مہنگا ہے۔ تم ڈورم میں آجاؤ۔ ایک روپیہ فی کس، چھ لڑکیاں ہیں ہم۔ ابھی دو پلنگ خالی ہیں۔ آجاؤ سچی بڑا مزہ آئے گا۔ ساتھ پڑھیں گے مل کر"۔

تین ہوسٹل تھے نشاط، نوبہار اور میتری بھون۔ سب سے مہنگا اور نیا نشاط تھا، پھر نوبہار اور سب سے پرانا میتری بھون تھا جس میں ڈارمیٹری تھی۔

میں ایلما کے ساتھ اس کی ڈارمیٹری میں گئی تو پانچویں لڑکی آ گئی تھی وہ زہرہ ابوالحسن تھی جو علی گڑھ سے میٹرک کر کے آئی تھی نیتر کی کلاس میں تھی اور ڈے اسکالر تھی۔ بس بلّی کی جان پہچان تھی مگر میں علی گڑھ کی لڑکی دیکھ کر دل جھوم اٹھا۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی بہت میر اور لاڈلی تھی۔ دبلی پتلی سانولی بلکہ کالی۔ مس شیریں نے اس کی مسکین صورت دیکھ کر میتری بھون بھجوا دیا تھا۔

آئی۔ٹی کالج کا بورڈنگ ہاؤس بھی طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ نشاط میں امیر اور ولایتی لڑکیاں تھیں۔ نوبہار میں درمیانہ درجہ کی حیثیت کی اور میتری بھون میں کم حیثیت اور زیادہ تر عیسائی لڑکیاں تھیں۔

کیونکہ مشنری کالج تھا۔ عیسائی لڑکیوں کو بہت رعایتیں حاصل تھیں بہتوں کی فیس معاف تھی کھانے کا کم دینا پڑتا تھا۔ وظیفے سب ہی عیسائی لڑکیوں کو ملتے تھے۔ چوں کہ ہندو باورچیوں نے گائے کا گوشت پکانے سے انکار کر دیا تھا اس لیے سارا عملہ عیسائی اور مسلمان تھا۔ مہتر، مالی، چوکیدار جو تعداد میں درجن بھرے اوپر ہوں گے سب ترکّن سے عیسائی ہو گئے تھے۔ مسلمان بے حد کٹر مزاج تھے اور مسلمان لڑکیوں سے کچھ غصت بھی ہوتے تھے اور مروّت بھی برتتے تھے۔ زیادہ مکھن کے توس دیتے تھے۔

عیسائی جس طبقے سے لائے گئے تھے ان سے ولایتی اساتذہ زیادہ چھوت چھات کرتے تھے۔ وہ ڈائننگ روم میں داخل نہیں ہو پاتے تھے۔ انگریز اور امریکن لڑکیوں کی الگ میز تھی جنھیں کچھ انگریزی کھانا ملتا تھا۔ ان میں بہت گوری اینگلو انڈین بھی شامل کر لی گئی تھیں جن میں اندر دیال ڈاکٹر گرجا دیال ان کی ڈاکٹر میم کی سرخ سفید لڑکی تھی۔ ولایت رہ آئی تھی اسکرٹ اور فراک پہنتی تھی۔ یہ تھیں ڈاکٹر کی بیٹی تھی جن کی میم صاحب نے ہماری ماں کے زیادہ تر جاپے کیے تھے۔ بڑی گہری دوست تھیں۔ ابا میاں کی جب بدلی ہوتی تو وہ گرجا دیال کو بھی کسی طرح وہیں ٹرانسفر کرا لے جاتے۔ بچپن میں بہرائچ میں ہمارا کافی میل جول تھا اور ان کا بڑا بیٹا بھاؤ ہمیں بہت ستایا کرتا تھا۔ خوب ٹھکائی کرتا۔ روتے تو چڑھاتا۔

اندرا نے جب یاد دلایا تو پہلے میں نے اس کے بھائی کی خیریت پوچھی جو نہایت مکھنا اور گورا تھا۔ پھر اسے ہم اپنے ہوسٹل میں لے آئے۔ تیسرے دن سلطانہ اور آمنہ بھی آ گئیں ہم نے انھیں تانگے میں دیکھ کر ہی پکڑ لیا اور ہمارے کمرے کے بعد جو ڈبل روم تھا وہ انھیں دلوا دیا۔ ہم بار بار بیچ کے کمرے سے گذر کر

ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ سینئر لڑکی کمرہ چھوڑ کر میتری بھون چلی گئی جہاں لڑکیاں بہت پڑھاکو تھیں۔ اس کا بی۔ اے کا آخری سال تھا اور سلطانہ اور آمنہ بالکل برابر کے کمرے میں آگئیں۔ زہرہ، سلطانہ، آمنہ ایف۔ اے کے پہلے سال میں تھیں۔ مگر علی گڑھ کے ناطے ہم اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔

سب سے زیادہ جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ لائبریری اور ڈراوئنگ روم تھا اتنی خوبصورت اور وسیع لائبریری میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ علی گڑھ کالج میں ایک کمرے میں چار الماریاں کھڑی تھیں جن میں اردو اور انگریزی کی کتابیں تھیں دو چار ڈکشنریاں اور انسائیکلو پیڈیا بھی۔ آئی۔ ٹی کالج میں کئی ہزار کتابیں تھیں پہلے چند دن تو صرف کتابیں دیکھنے میں صرف ہو گئے پڑھائی شروع ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے۔ ایک ہفتہ تو لڑکیوں کو جمنے میں لگ جاتا تھا۔ مگر لڑکیاں اپنی مرضی سے کھیل رہی تھیں۔ نوٹس بورڈ پر مختلف کھیلوں میں حصہ لینے والی لڑکیاں اپنے نام لکھ رہی تھیں۔ ہم چاروں نے ہر گیم میں نام لکھوا لیے۔ باسکٹ بال، والی بال، اور بیڈمنٹن تو علی گڑھ سے ہی آ گیا تھا۔ بیس بال اور ہاکی اور ٹینس نئے کھیل تھے۔

ہمارے ہوسٹل میں صرف ڈاکٹر نکر تھیں وہ اسی برس کی تھیں اور انگریزی ان کے ذمہ تھی۔ ڈاکٹر نکر چھوٹے سے قد کی کم رو بے انتہا سفید خاتون تھیں اور ہمیں پہلی بار پتہ چلا کہ سفید رنگ بدصورت بھی ہو سکتا ہے۔ سر پر نہایت مختصر سے سفید لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے بال تھے۔ عموماً بہت سادہ لباس پہنا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر نکر کیمبرج ہارورڈ اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں پڑھا چکی تھیں اور ایک طرح سے ریٹائر ہو چکی تھیں۔ ازابیلا تھوبرن کالج میں آرام کرنے آئی تھیں مگر ساری عمر پڑھانے کے بعد بیکاری سے وحشت ہونے لگی اور پھر پڑھانا شروع کر دیا۔ ان کے شاگرد منسٹر اور سینئر تھے۔ کمانڈر ان چیف اور جنرل تھے۔ ان کا علم بحر ذخار تھا جس کی تھاہ نہیں ملتی تھی شیکسپیئر تو انھیں ازبر تھا۔ پڑھانا شروع کرتیں اور کتاب کھول کر صفحہ الٹنے کی بھی ضرورت نہ محسوس کرتیں۔ یہی حال برنارڈ شا اور تمام انگلش شعرا کے کلام کا تھا۔ لڑکیاں کتابیں کھول لیتیں اور وہ ڈائس پر ٹہل ٹہل کر سبق دیا کرتیں۔ اس قدر سحر کن انداز میں پڑھتی تھیں کہ طالب علم مدہوش ہو جاتے۔

علی گڑھ میں خاتون آپا انگلش کی بہترین استاد مانی جاتی تھیں اور ان کے پڑھائے ہوئے سبق دماغ کا ایک حصہ بن جاتے تھے مگر جب خاتون آپا کی استاد ڈاکٹر نکر سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا علم کا ایک

سمندر ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انھوں نے ورڈسورتھ کی نظم Little Match Girl اور We are seven کلاس میں پڑھایا تو پہلے سنایا۔ پھر سسکیاں اور پھر پھوں پھوں شروع ہوگئی خود ڈاکٹر ٹکر کا منہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور چیاں سی پھیکی نیلی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ خود اتنی ڈوب کر پڑھتی تھیں کہ بوڑھے ہاتھ پیر لرزنے لگتے تھے۔

جب دوسری کلاس کی لڑکیاں دروازے پر آکے ڈٹ گئیں تب ہمیں پتہ چلا کہ گھنٹہ ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر ٹکر کی ہر کلاس میں یہی ہوتا کہ بیٹھی ہوئی لڑکیاں اٹھنے کو تیار نہ ہوتیں اور دوسری کلاس کی لڑکیاں گھس کر احتجاج کرتیں۔

ڈاکٹر ٹکر کبھی لان پر چہل قدمی کے لیے نکلتیں تو لڑکیاں انھیں گھیر لیتیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر وہ اتنے پیارے انداز میں گفتگو کرتیں کہ دماغ کی کھڑکیاں کھلنے لگتیں۔ بیحد خوش مزاج تھیں، موڈ آجاتا تو مضحکہ خیز کردار کی اتنی دلچسپ نقل کرتیں کہ ہم لوگ ہنستے ہنستے بے دم ہوجاتے۔ کبھی فالسٹاف بن جاتیں، کبھی ڈیوڈ کاپرفیلڈ کا مسٹر بارکس، کبھی شائیلاک، کبھی ایک دم پورشیا، کبھی برنارڈشا کی کینیڈا تو کبھی قلو پطرہ۔ بائبل بھی کافی ازبر تھی۔ انھوں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ فائنل میں برنارڈشا کا اور شیکسپیئر کا کون سا ڈرامہ لیں گی۔ سلیبس میں تین تین ڈراموں میں سے ایک ایک سلیکٹ کرنا تھا۔ اسی طرح نظم کے حصے میں بھی ورڈس ورتھ، میتھیو آرنلڈ، بائرن، کیٹس، شیلی اور ملٹن کے بارے میں بھی کچھ نہیں طے کیا تھا کہ کون کون سے حصے کورس میں ہوں گے۔ بس کہہ دیا سب شیکسپیئر کے ڈرامے دلچسپ کتاب کی طرح پڑھ ڈالو۔ تمام شعرا کا پورا کلام کتابی صورت میں دو دو روپیہ میں سستا ایڈیشن حضرت گنج سے خرید لاؤ اور سب تیزی سے پڑھ جاؤ۔

میری انگریزی علی گڑھ کے معیار سے بھی کمزور تھی کیوں کہ میں نے انگریزی بہت دیر میں اور بڑی تیزی سے پڑھی تھی۔ انگریزی شعرا کی ایک آدھ نظم کورس میں تھی رٹ ڈالی تھی معنی بھی کچھ کلاس میں کچھ "کنجی" کی مدد سے ازبر کر لیے تھے۔ مگر جانکاری ہوتے ہوئے بھی تحریری طور پر مار کھانا پڑتی تھی جو سمجھتی تھی اسے لکھنے کے لیے زبان کی کمزوری کھل دیتی تھی۔ بیان میں بھی مار کھانا پڑتی تھی، کیوں کہ بولنے کی مہارت نہ تھی۔ باقاعدہ ہر جملہ کا ترجمہ کر کے بولتی تھی۔ دماغ میں بہت کچھ بھرا ہو اور ادائیگی کا راستہ نہ ملے تو بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ مگر کالجوں میں "کنجی" ایک ایسی نعمت ہے کہ وقتی تو ہوئی مگر شوق میں کمی نہ آئی پھر ڈکشنری بھی کام آئی۔

لائبریری میں جا کر مجھ پر عجیب نشہ سا سوار ہوجاتا ہے۔ پرانی اور نئی کتابوں کی ایک عجیب مسحور کن

خوشبو ہوتی ہے جو داخل ہوتے ہی ہر چہار طرف سے دماغ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ میں گھنٹوں کتابیں کھول کھول کر انھیں جی بھر کے سونگھا کرتی۔ اب بھی نئی کتاب اور رسالہ نہ جانے کیوں میں کھول کر پہلے بے اختیار سونگھتی ہوں۔ چینی اور روسی کتابوں میں خدا معلوم کیسا گوند لگا ہوتا تھا کہ سڑے ہوئے گوشت کی بو آتی تھی اور جی متلانے لگتا تھا۔ میں نے چاہا تھوڑا یوڈی کولون چھڑکوں تو اور بھی بھیانک بدبو آنے لگی۔ میں ہی جانتی ہوں میں نے کیسے ناک بند کر کے ان کتابوں کو پڑھا ہے۔ مجھے کتابوں سے عشق ہے۔ میرے بستر پر کتابیں اور رسالے نہ پڑے ہوں تو وحشت ہوتی ہے۔ میرے گھر کے ہر کونے میں کسی نہ کسی صورت میں کتابیں رکھی ہیں۔ یہاں تک کہ غسل خانہ میں بھی کانک اور ادھر اُدھر کے ہلکے پھلکے رسالے رکھے رہتے ہیں۔ یہی حال میری بیٹیوں کا ہے اور میرا نواسہ بھی کتابوں کا دیوانہ ہے جب سوجاتا ہے تو اس کے سینے اور پہلو سے کتابیں سمیٹنی پڑتی ہیں۔ شاہد کو بھی کتابوں سے عشق تھا، ان کے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں کتاب ضرور رہتی تھی۔ کتابیں خریدنے کا تو جنون تھا شاید ہی کوئی مہینہ ایسا جاتا ہو جو دو تین سو کی کتابیں نہ خریدتے ہوں، ایسی کتابیں جو نایاب ہوں پرانی کتابوں کی دکانوں سے خریدتے تھے انھوں نے اتنی لاجواب کتابیں جمع کی تھیں کہ میرا پڑھتے پڑھتے دماغ گھوم گیا۔ انھیں پڑھنے کی کم فرصت ملتی تھی۔

میں نے ان کی زندگی میں خود کتاب کبھی نہیں خریدی۔ ضرورت ہی نہ پڑی۔ اتنی کتابیں پڑھنا آسان کام نہ تھا مگر خدا کتاب چوروں کو سمجھے، بہت سی کتابیں اڑا لے گئے، تب میں نے بہترین کتابیں لوہے کی الماری میں رکھ کر کنجی کھو دی ہے جس کی جائے رہائش صرف مجھے معلوم ہے۔

میں نے مکمل کلام ان تمام شعرا کا، اور شیکسپیئر اور برنارڈ شا کو پڑھ ہی ڈالا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد پھر کنجی کی ضرورت نہ رہی اور نثر میں۔ براونٹی سسٹرز سے شروع کر کے تمام روسی ادیب خاص طور پر چیخوف، ٹالسٹائی، گورکی، دستووسکی۔ پھر چارلس ڈکنس، ایمیلی زولا۔ بالزاک، مام، ہیمنگ وے کو بھی پڑھا۔

میں کبھی حسرت سے کتابوں سے بھری الماریوں کو دیکھتی کہ زندگیاں چاہئیں ان سب کو پڑھ ڈالنے کے لیے۔ پھر کالج کی پڑھائی، مقررہ وقت پر لائٹ بند کر دینا پڑتی۔ کبھی کوئی کتاب جان کو لگ جاتی اور روشنی بجھانے کا گھنٹہ بج جاتا۔ پھر میٹرن آکر ٹوکتی اور بغیر روشنی گل کیے سرے نہ ٹلتی تو جی جل کر خاک ہو جاتا۔ میرے اوپر اکثر جرمانہ ہوتا، تب میں کسی سینیئر یعنی بی۔ اے فائنل ایم۔ اے یا بی۔ ایڈ کے کمرے میں جا کر پڑھتی۔ اگر وہاں بھی میٹرن کے آنے کی چاپ سنتی تو باتھ روم میں جا کر بیٹھ جاتی۔ اُف میرے

مزاج میں بلا کی ضد تھی۔

ڈاکٹر شکر نے میرا اور نانس مارادہ میرے کمرے سے تھوڑی دور رہتی تھیں بڑھاپے میں نیند مشکل سے آتی ہے۔ کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے آتیں تو میں ان کی تاک میں بیٹھی رہتی۔ ہیں انھیں وش کرتی اور وہ باتیں کرنے لگتیں پھر مجھے کمرے میں بلا لیتیں۔ سونے کی گھنٹی بج جاتی پانچ پھر دس اور پندرہ منٹ گزر جاتے، ان کی باتوں سے میری پیاس اور بڑھتی۔ وہ جن کتابوں کے کردار کا ذکر کرتیں دوسرے دن میں انھیں کتابوں میں ڈھونڈتی۔ اس کے علاوہ انھوں نے شام کو کھانے کے بعد علمی بات چیت کے عنوان سے ایک دلچسپ مشغلہ شروع کیا تھا، جو لڑکیاں چاہیں آدھ گھنٹہ ان کے پاس جاکر سوال و جواب میں شرکت کرسکتی تھیں۔ لڑکیاں ٹوٹ پڑیں، ان کا چھوٹا سا کمرہ کھچا کھچ بھر جاتا۔ تمیزین پر بیٹھ جاتے وہ آرام کرسی پر، کبھی کوئی نظم یا ڈرامے کا ٹکڑا، کبھی ہومر اور ورجل کے بارے میں مثالوں کے ساتھ بات چیت، کبھی بائبل کی تفسیر۔ چند لڑکیوں کا خیال تھا کہ بڑھیا ہمیں کرسٹان بنا رہی ہے کچھ بھی ہو ہماری معلومات میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ انھوں نے ایک دن انگریزی موسیقی کے بارے میں بھی بتایا۔ ہر ہوسٹل میں ڈرائنگ روم تھا جہاں پیانو رکھا رہتا تھا، لڑکیاں پریکٹس کرتی تھیں یا پروفیسر دل بہلانے کو شغل کرتی تھیں۔ ہمارے کان مغربی موسیقی سے قطعی ناآشنا تھے بس گوڈ سیو دی کنگ علی گڑھ میں پہلے گایا جاتا تھا جسے ہم بس منہ پھاڑ پھاڑ کر بغیر آواز کے گاتے تھے۔ ابا میاں گانا سننا پسند کرتے تھے مگر گھر میں کوئی ہندوستانی گانا بھی نہیں جاتا تھا۔

ڈاکٹر شکر نے میوزک اپریشیشن کی بیٹھک میں ہمیں جو گانا سنایا تو مارے ہنسی کے دم نکل گیا۔ لایق سُر ہمارے کانوں کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ ہم لوگ منہ پر پلو رکھ کر بے دم ہو گئے۔

ڈاکٹر شکر کا منہ سرخ ہو گیا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ گانا ایک حبشی گویئے پال روبسن نے گایا ہے اور شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے بار بار ریکارڈ بجایا اور کہا غور سے سنو، اس گوئیے کی آواز میں والگا ندی کی گھن گرج ہے۔ آنکھیں بند کرلو اور سوچو تم ناؤ میں سوار والگا ندی پار کر رہی ہو۔ دریا میں بھیانک طوفان آرہا ہے، دیوزاد موجیں، بادل کی گرج، پانی کا عتاب اور اکیلا بے سہارا مانجھی مجبور ولاچار نیگرو مانجھی جب کی زندگی ایک طوفان میں گھری ہوئی ہے۔

ہم کھسیانے شرمندہ سنتے رہے اور جب تیسری بار انھوں نے بجلی بجھا کر ریکارڈ بجایا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پھر انھوں نے امریکی نیگرو کے بارے میں پڑھنے کی رائے دی۔ شمال اور جنوب کی جنگ نیگرو

کی درگت، اور میں نے Uncle Tom's Cabin . پڑھا اور پال روبسن کی آواز کی عظمت پہچانی۔

دوسرا مضمون سیاست پہلے سبق سے ہی دل کو جکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ پالیٹکس کی پروفیسر مس چاکو ساؤتھ انڈین تھیں۔ بالکل نیگرو جیسا چکنا مخملیں رنگ، گھونگروالے بال، بڑا سا جوڑا سیدھی مانگ، بے حد رسیلی چمک دار اور بڑی بڑی آنکھیں، کھنچی ہوئی بھوئیں، گہرے اودے ذرا پھیلے ہوئے ہونٹ اور جگمگاتے ہوئے سفید جھک دانت، نہایت موزوں سڈول جسم، لانبی ہنسنی جیسی گردن۔ زیادہ تر سفید فام استاد متر سبھدی اور کم رو تھیں ان میں مس چاکو سیاہ ہنسنی کی طرح پروقار چال سے چلتیں تو بالکل کسی ملک کی شہزادی معلوم ہوتیں۔ ان کی آواز بھاری مگر انتہائی گہری اور پُراثر تھی۔

کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں ہم سب ہی ان پر مرتے تھے کیوں کہ وہ بے حد اچھا لیکچر دیتی تھیں کہ ذہن میں بیٹھ جاتا تھا۔

مس چاکو بہت بھڑکدار کاہی، کاکریزی، اودی، نیلی، مدراسی ساڑیاں پہنتی تھیں جن سے ان کی ہستی نہایت پُراسرار اور گمبھیر لگتی۔ وہ بہت کم ہنستی تھیں عموماً طلبا کی کسی کوتاہی اور غلطی پر ہنس پڑتی تھیں اور وہ لڑکی رو پڑتی تھی۔

سیاست کے ساتھ تاریخ پڑھنا ضروری تھی۔

کیڑے سے مینڈھک پھر بندر سے انسان۔ تھیوری آف ایوولیوشن، یعنی ارتقا کی منزلیں۔

کن فیکون! خدائے برتر نے فرمایا، "ہوجا" اور دنیا تعمیر ہوگئی، پھر مٹی سے حضرت آدم کو تخلیق کیا اور سجدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

فرشتوں کا سردار اعلیٰ، ابلیس بغاوت پر تُل گیا۔ مٹی کے حقیر پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ اور راندۂ درگاہ ہوا۔ مگر اسے رہتی دنیا تک انسان کو ورغلا کر خدا کی حکم عدولی کی اجازت مل گئی۔

آدم جنت میں بور ہوئے تو ان کی دل بستگی کی خاطر حوّا بنادی گئیں۔ عورت مرد کا کھلونا۔

ابلیس جانتا تھا کہ آدم اس کے چکمے میں نہیں آئیں گے لہٰذا حوّا کو بھڑکایا اور بادل ناخواستہ آدم نے بھی شجر ممنوعہ سے پھل توڑ کر کھالیا کیونکہ ابلیس کی بہکائی حوّا نے آدم کو بھی ورغلایا شیطان کی چیلی عورت! اسی کی وجہ سے دونوں دنیا میں پھینکے گئے۔

آدم اور حوّا کے روز ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہونے لگے۔ ایک دن پیدا ہونے والے جو فوراً جوان ہوجاتے تھے ایک دوسرے پر حرام قرار پاتے تھے ایک دن پیدا ہونے والے دوسرے دن پیدا ہونے والے سے ہی شادی کرسکتے تھے۔ مگر بدذات قابیل نیک نہاد ہابیل کی جائز عورت پر ریجھ گیا۔

شیطان نے اسے قتل کرنے کا ہنر سکھایا اور اس طرح قابیل کے ہاتھوں دنیا کا پہلا قتل ایک عورت کے کارن ہوا۔ بھائی نے بھائی کا خون بہایا۔

عورت پھر فساد کی جڑ!

سیاست کے مضمون میں ہسٹری کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ مس چاکو جونز تھیں بڑی خوبصورتی سے ارتقا کی تھیوری پڑھا رہی تھیں۔

کیڑے سے مینڈھک، پھر بندر، پھر انسان ظہور میں آیا۔ پچھلے ہفتہ وہ یسوع مسیح تسام کی دنیا میں انھوں نے کن فیکون ؟ کی روداد سنائی تھی۔ دماغ قلا بازیاں کھانے لگا۔ ڈرتے ڈرتے اظہار خیال کیا۔

مس چاکو کی طنزیہ ہنسی بڑی زہریلی ہوتی تھی، بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں سانپ پھنکارنے لگتے تھے۔ تھوڑی دیر کلاس میں سناٹا سا رہا۔

"عقیدے اور تاریخ کو خلط ملط مت کرو۔" انھوں نے جھک کر میری نوٹ بک دیکھی۔ گھبرا کر اور بھی غصے سے بولیں "یہ کیا لکھ رہی ہو؟"

"نوٹس۔" میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"مگر یہ ...... یہ۔" انھوں نے کاپی اٹھا کر کلاس کو دکھایا۔

"یہ تو اردو ہے!" کشور بولی۔

"میری کلاس میں سنجیدگی سے کام ہوگا۔" مس چاکو نے کاپی پٹخ دی۔

"حروف اردو کے ہیں، مگر الفاظ انگریزی کے ہیں۔" میں نے ان کے دیے ہوئے نوٹ پڑھ کر سنائے۔

"مگر......"

"مس چاکو آپ بہت تیز بولتی ہیں ہم اتنی تیزی سے نہیں لکھ پاتے۔ میں اردو میں نوٹ لکھتی ہوں میں انگریزی میں آسانی سے منتقل کر لیتی ہوں۔ اردو بہت تیز لکھی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی شارٹ ہینڈ ہے۔"

نوٹ سن کر مس چاکو مطمئن ہو گئیں۔ لڑکیاں میرے نوٹ سے اپنے چھوٹے ہوئے الفاظ لکھا کرتی تھیں۔ اس طرح لکچر سننے کا اچھا موقع ملتا تھا۔

یہ ترکیب میرے بہت کام آئی۔ ہندی کے حروف اتنے مختصر نہیں ہوتے۔ ہندی کی لڑکیاں بھی میرے نوٹ مانگا کرتی تھیں۔

کئی دن ہم بائبل کے پہلے سبق پر بحث کرتے رہے۔ عورت پر ساری غلطیوں کا بوجھ۔ اس کی ثانوی حیثیت۔ ہمیں قطعی یہ ذاتی حملہ محسوس ہوا۔ دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

تو پھر کورس کی کتابیں مذہبی عقیدوں کی کاٹ کیوں کرتی ہیں۔ دو متضاد باتیں طلبا کو کیوں پڑھائی جاتی ہیں اور دونوں پر صدق دلی سے ایمان لانے کا حکم ہوتا ہے۔ تھیوری آف ایولیوشن سے اور ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر عقیدے پر سوال کا جواب دیں تو ممتحن کا کیا فیصلہ ہوگا۔

پتھر کا زمانہ پھر لوہے کی دریافت، ہزاروں سال بندروں کی طرح پیڑوں اور غاروں میں رہا۔ پھر مکان کا تصور ابھرا۔ غول قبیلوں کی صورت میں جم گئے۔ کاشت اور مویشی پالنے کا گر سیکھا شکار کے لیے ہتھیار نے جو قبیلوں کے درمیان خون خرابے کے کام آنے لگے۔

ابتدا میں عورت اور مرد قریب قریب برابر تھے۔ جسمانی طور پر بھی زیادہ فرق نہ تھا قبیلوں کے رہن سہن میں تقسیم محنت کے اصول لاگو ہوئے۔ عورت بچہ پیدا کرتی تھی جو قبیلہ کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا۔ لہٰذا اس کی زیادہ اہمیت تھی۔ شادی کے رواج سے پہلے بچّے ماں کے ہی ہوا کرتے تھے۔ جن کے مختلف باپ ہوا کرتے تھے اور حق جتانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ نام ماں سے چلتا تھا اور ماں ہی قبیلے کی سردار مانی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ آرام طلبی نے جسمانی طور پر کمزور بنا دیا۔ جیسے عیش پرست حاکموں بادشاہوں کا وجود ناکارہ ہو گیا اور نام کو بادشاہت رہ گئی ہے اسی طرح عورت کی اہمیت ختم ہو گئی، اور وہ بچے بنانے کی مشین رہ گئی، یا گھر کا کام کاج اس کے حصّہ میں آیا۔

کیوں کہ قبیلے ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ کام ہی کیا تھا سوائے اس کے کہ ایک دوسرے کو مار کر ان کی ملکیت پر قبضہ کرلیں۔ عورت جو مرنے والوں سے پیدا ہونے والی خلا کو پورا کرتی تھی اس لیے وہ بھی مال غنیمت بن گئی۔ ڈھور ڈنگر کے ساتھ وہ بھی لوٹ لی جاتی جس کے قبضہ میں زیادہ عورتیں ہوتیں اس کا کنبہ بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا اور وہ سردار بن جاتا۔

اور مال اسباب کی طرح عورتوں کی بھی لوٹ ہوتی اور قبضہ کا تصفیہ کرنے کے لیے قبیلہ کے افراد اپنی اپنی عورتوں کی تعداد بھیڑ بکریوں کے ساتھ گن دیتے۔ کوئی نئی عورت کا اضافہ ہوتا وہ بھی قبیلہ کو جتا دیا جاتا کہ مال فلاں کی ملکیت ہے۔ یہ بعد میں شادی کی صورت اختیار کر گئی۔ لوگوں کو جمع کرنے کے لیے تاکہ بعد میں گڑبڑ نہ ہو، ڈھول پیٹ کر اطلاع دی جاتی۔ یا گاؤں میں گھوم پھر کر جتا دیا جاتا کہ بھائیو اچھی طرح پہچان لو یہ مال فلاں کا ہے۔ بعد میں یہی رسم شادی کی دھوم دھام بن گئی۔

قبیلے کے افراد دوسرے قبیلوں ہی سے نہیں آپس میں بھی لڑا کرتے تھے۔ باپ اور بیٹے میں سے جس کو موقع مل جاتا یا زیادہ طاقتور ہوتا تو مار ڈالتا۔ اس لیے رشتوں کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ باپ بیٹے کو پالے پوسے محبت دے۔ اس کے جواب میں بیٹا باپ کا شکر گزار ہو اور عزت کرے فرماں بردار ثابت ہو۔

باپ کے مرنے کے بعد بیٹے اس کی دولت کے مالک ہوتے تھے۔ ساتھ میں اس کی بیویوں پر بھی ان کا حق ہو جاتا تھا۔ آپس میں چھین جھپٹ اور خون خرابہ ہونے لگتا۔ عموماً سب سے بڑی عورت کا سب سے بڑا لڑکا اور بچوں سے زیادہ طاقت ور ہوتا تھا۔ عمر میں بھی باپ سے قریب ہوتا تھا وہ اپنی اہمیت منوا لیتا تھا۔ اس لیے بڑا بیٹا ولی عہد مان لیا گیا۔ اس کی وجہ سے اس کی ماں بھی دلیر ہو گئی اور پٹ رانی بن گئی سردار کی پہلی بیوی یعنی خاتون اول۔

شادی کی اتنی غیر رومینٹک تفصیل پڑھ کر سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ رنگین خواب چت کبرے بن گئے۔ عورت کی کھیت کھلیان اور مویشیوں کی طرح حفاظت ہوتی تھی۔ مالک اور ملکیت کے لیے الگ الگ اصول زندگی بن گئے۔ مرد پالن ہار پتی اور خدائے مجازی۔ عورت کے فرائض مرد کی خدمت۔ کہ روزی روٹی کی خاطر براہ راست حوادث زمانہ کا مقابلہ نہیں کرنا پڑتا تھا جب تک مرد کو خوش کرتی۔ زیادہ سے زیادہ سپاہی پیدا کرتی۔ محفوظ چین کی زندگی گزارتی۔ اس کے بعد وہی انجام ہوتا جو بوڑھے ناکارہ مویشیوں کا ہوتا ہے۔ اسی لیے عورت بڑھاپے سے ڈرتی ہے عمر چھپاتی ہے کہ آج بھی وہ شوہر اور بیٹوں کے رحم کی محتاج ہے۔

بڑھاپا تو ٹھوکریں کھاتا ہی ہے۔ جب اپنی حفاظت کا دم نہیں رہتا تو سب سے پہلے آدم خور کمزور اور بوڑھے ہی کا صفایا کرتے تھے۔ کچھ ہوشیار بڑھیاں نئی نوجیوں کی تربیت کے لیے زندہ چھوڑ دی جاتیں جو انھیں مرد کا دل جیتنے کے گر سکھاتیں۔ ماتا کا درس دیتیں تاکہ ان کے بچے بڑے ہو کر ان سے دور نہ ہو جائیں۔

"ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے" بچوں کے دل میں بٹھایا جاتا۔

بزرگوں کا قول تھا، اب بھی ہے کہ لڑکی کو زیادہ تعلیم نہیں دینا چاہیے۔ تباہ ہو جاتی ہے اچھی ماں بیوی بننے کی صلاحیتیں مر جاتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ مقولہ مردوں پر کیوں نہیں لاگو ہوتا۔ علم خطرناک ہے تو ہر جاندار کے لیے برابر کا سم قاتل ہے۔ یہ نہیں کہ عورت کے سانپ کاٹے تو مر جائے اور مرد سرخرو ہو۔ ایک کے لیے زہر دوسرے کے لیے تریاق۔ کیا احمقانہ مقولے بنائے ہیں یار لوگوں نے!

ہماری سب ہی پروفیسر دو کے سوا، غیر شادی شدہ تھیں۔ یہ دو ہندوستانی تھیں بال بچوں والی تھیں۔ ڈاکٹر شکر، ڈاکٹر شیلین، مس ہیرس، مس جونسن، غرض سب ہی نے شادی نہیں کی۔ ایک دن ہم نے ڈاکٹر شکر سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔"

"کسی نے چاہا ہی نہیں۔"

"کیوں؟ آپ جوانی میں بہت پیاری ہوں گی۔ لڑکوں کی کمی تھی۔"

"ہاں، لڑکوں کی کمی تھی۔ ہر ملک میں عورتیں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ پھر میرا اصل وطن انگلینڈ ہے ہے۔ نوجوان وطن سے دور کالونیز میں سلطنت برطانیہ کا سکہ جمانے میں جٹے ہوتے تھے صرف بوڑھے اور نکمے رہ گئے تھے۔ جو وطن سے برسوں کے لیے جاتے تھے ان کی بیویاں کنواریوں سے بدتر، ساتھ جائیں تو صعوبتیں برداشت کرنے کا دم نہ تھا۔ کسی زمانے میں تو مرد نیٹو عورتوں میں ہی دلچسپی لینے لگتے تھے شادیوں سے کتراتے تھے۔ اس پر عورتوں نے بہت غل مچایا۔ سفید لوگوں پر کالے نیٹوز سے میل جول پر سرکار نے پابندی لگادی۔ عورتیں خود کالونیز میں شوہر کی کھوج میں گئیں۔ بڑے دکھ جھیلے۔ مرنے کٹنے میں مرد ہی کام آجاتا ہے۔ عورتوں کو ان کی جگہ وطن میں سنیاس لینی پڑتی ہے۔ شادیاں نہ ہوسکیں تو تعلیم نسواں لامحالہ بڑھی۔ میرا خاندان، بس کھاتے پیتے لوگ تھے ہم لوگ۔ تعلیم اتنی گراں نہیں تھی۔ میرے دو بھائی افریقہ میں فوت ہوگئے۔ ان کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی کہ موت کی پکار آگئی۔ چھوٹی بہن بیوہ ہوگئی۔ کچھ ایسے حالات تھے کہ علم کے سوا ہر چیز دائرہ اختیار سے باہر تھی ——— مگر تم لوگ شادی ضرور کرنا۔"

"کیوں؟"

"تاکہ دنیا کو اعلیٰ دماغ بچے دے سکو۔ میرے خاندان میں صرف ایک بہن نے شادی کی تین بچے ہوئے۔"

"تعلیم یافتہ تھیں؟"

"ہاں، اڑتیس سال کی عمر میں ایک ٹانگ کا دولہا ملا، اسکول ٹیچر تھی ایلس۔ اس کی اولاد نے تعلیم پائی۔ پوتے نواسے دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ملک کو ترقی کرنے کے لیے تعلیم یافتہ ماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تم کوئی ایسی مثال دے سکتی ہو کہ ماں گریجویٹ ہو اور اولاد جاہل رہ گئی ہو۔ جس خاندان کی عورت تعلیم پالے اس کے مرد اعلیٰ تعلیم پالیتے ہیں۔"

آج ڈاکٹر شکر کی باتیں یاد کر کے حساب لگاتی ہوں تو واقعی ان کی پڑھائی ہوئی جتنی طالبات

ہیں کسی کے بچے جاہل نہیں۔

"ذہین ماں کا دودھ ذہانت بخش ہوتا ہے۔" ڈاکٹر شکر نے کہا تھا۔

پھر ایک دم نئی طالبات کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب ہم آئی۔ ٹی کی روایات اور اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ کرسمس اکزامس شروع ہونے والے تھے اس سے پہلے ہم آئی۔ ٹی کے "شہری" بنا دیے گئے۔

اعلان کیا گیا کہ سب لڑکیاں آئی۔ ٹی کلر یعنی سفید اور سنہرے رنگ کے لباس پہنیں گی زیادہ تر نے سفید سوتی ساڑیاں زردکنی کی خرید لی تھیں۔ ہفتہ اتوار چھٹی ہوا کرتی تھی، اس لیے جمعہ کی سہ پہر کو سارا اسٹاف اور طالبات پورٹیکو میں جمع ہوئیں۔ نئی لڑکیاں پورٹیکو کے باہر سیڑھیوں کے نیچے، اور اسٹاف اور پرانی طالبات پورٹیکو میں۔ سنہری اور سفید کریپ پیپر کے لمبے لمبے فیتے ستونوں سے باندھ کر دربندی کی گئی۔ دور میموریل پیانو کی سُر چھڑ رہی تھی۔ مس شنین نے بڑی گمبھیر آواز میں قسم لی۔ ہم ان کے الفاظ دہراتے گئے۔

"ہم کالج کے اصولوں کی پابندی کریں گے۔"

"آپس میں مذہب، رنگ، ذات پات کی تفریق کو بھول کر محبت اور دوستی کا مان کریں گے۔"

"دل لگا کر علم حاصل کریں گے تاکہ اسے دوسروں تک پہنچا سکیں۔"

"کالج کے سامان کو اپنا جان کر احتیاط سے استعمال کریں گے۔"

"لائبریری کو عبادت گاہ کا درجہ دیں گے۔"

"پروفیسر کو اپنا بزرگ دوست سمجھیں گے اور بے تکلف اپنی مشکلات میں رائے لیں گے۔"

"کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے کہ کالج کے نام پر حرف آئے۔"

"پابندی وقت کی قدر کریں گے۔"

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

اس کے بعد مس شنین نے سنہری سفید فیتے کھول دیے اور کہا۔

"آج تم اصلی معنوں میں کالج میں داخل ہو کر اس کنبے کا ایک فرد بن گئیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، جو علم ہمارے استادوں نے بطور قرض ہمیں دیا ہے ہم تمہیں دیں گے کہ تم دوسروں تک پہنچاؤ تاکہ یہ علم کا لین دین چلتا رہے۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

ہم لوگ سیڑھیاں چڑھتے وقت بڑے جذباتی ہو گئے۔ جیسے کسی عبادت گاہ میں داخل ہو رہے

ہیں۔ تالیوں کے شور میں بالکل مہمانوں کی طرح استقبال کیا گیا۔

پھر ڈنر ہوا۔ کالج کے گانے گائے۔ چٹکلے سناتے اور بے تحاشہ قہقہے لگائے۔ سال بڑا مبارک گزرا۔

ایک تو مہاتما گاندھی کے درشن ہوئے۔ آئی ٹی کالج امریکی ادارہ تھا۔ میتھڈسٹ چرچ سے وابستہ کلاس میں ہم آزادی سے حکومت برطانیہ کی پالیسی پر اعتراض کر سکتے تھے۔ غدر اور برٹش راج پر کھل کر بات کر سکتے تھے۔ امریکہ نے برطانیہ کا راج کیسے ختم کیا۔ یہ برطانیہ کی نوآبادیات میں سے ایک تھا۔ ہمیں ہندوستانی لیڈروں کی تقریریں سننے کی اجازت ہی نہیں بلکہ تلقین کی جاتی تھی۔ امریکہ اس وقت تک سامراجی طاقت نہیں بنا تھا۔ اور برطانوی نوآبادیات سے ہمدردی تھی۔ امریکی قوم کھلے دل کی صاف گو اور مخلص تھی۔ نہ ہتھیار کا دھندہ ہوتا تھا۔ نہ دوسرے ملکوں سے تجارتی لین دین اتنا وسیع تھا۔ ضرورت کے مطابق پیداوار تھی اور کسی ملک کا خام مال کے معاملے میں دست نگر نہیں تھا امریکی مصنوعات کو بازار کی ضرورت تھی۔

اور بڑے مزے کی بات ہے کہ آج امریکہ کا سب سے بڑا حریف روس امریکہ کی ہمدردی وصول کر رہا تھا۔

ہم نے روس کی مدد کے لیے کپڑے اور چندہ جمع کیا تھا کیونکہ مس شنین نے بتایا تھا کہ اس سال روس میں بڑی سخت سردی پڑی تھیں اور ملک بڑے کٹھن دور سے گذر رہا تھا۔

انھیں دنوں ایک فلم "راسپوٹین" آئی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے زار روس اور زارینہ کے بارے میں باقاعدہ لکچر دیے گئے۔ کس طرح زارینہ راسپوٹین کی دیوانی تھی۔ اسے پیغمبر سمجھتی تھی۔ امیرزادیاں اس کی محبت میں دیوانی تھیں۔ اور وہ سب پر دست شفقت پھیرتا تھا۔

"کیتھرین دی گریٹ" فلم دیکھنے سے پہلے ہمیں کیتھرین کے بارے میں مواد جمع کرنے میں مدد دی گئی۔ بڑی گرما گرم بحثیں کلاس میں ہوئیں۔

یونیورسٹی میں کبھی کسی مشہور شخصیت کو مدعو کیا جاتا تو ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی۔

خالدہ ادیب خانم سے یونیورسٹی میں ملنے کے بعد انھیں اپنے کالج میں بھی مدعو کیا۔ ان کے متعلق جتنا بھی مواد مل سکا ہم نے پڑھا۔ وہ آئیں تو ان سے سوالات کیے۔ ترکی کے انقلاب کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ کوئی اکنامکس یا پالیٹکس کا پروفیسر لکچر ٹور پر آتا تو ہم باقاعدگی سے شریک ہوتے پھر کلاس میں مباحثہ کرتے۔

یونیورسٹی پہلی بار گئے تو مس شفیق نے اسمبلی ہال میں ہمیں سمجھایا۔ چونکہ پہلی بار ہم لڑکوں کے ساتھ بیٹھیں گے اس لیے ہمیں احتیاط برتنی ہوگی۔ بعض چھچھورے لڑکے اوچھے مذاق کرنے لگتے ہیں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ معترض ہوں ابھی لوگ مخلوط تعلیم کے عادی نہیں ہیں۔

مجھے عام طور پر بزرگانہ نصیحتوں سے چڑھ تھی۔ مگر آئی۔ ٹی کی پروفیسر ایسی نرمی سے مسکرا کے دوستانہ انداز میں رائے دیتیں کہ میں بڑی فرماں برداری سے سن لیتی اور کبھی سرکشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بات کہنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ اتھارٹی اور دباؤ کی بو نہیں آتی تھی۔

مجھے ہر بات میں دلچسپی تھی، مزہ آتا۔ وہ آزادی اور روشنی جو اس ماحول میں مل رہی تھی میرا دماغ تیزی سے جذب کرنے میں غرق تھا۔ نئے نئے دروازے اور کھڑکیاں دماغ میں کھل رہی تھیں علم و دانش کے اس بے پناہ طوفان میں چند بوندیں بھی انسان سمیٹ لے تو راہیں روشن ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ میں نے فولادی دیواروں سے سر ٹکرایا تھا اور سر میں کوئی دراڑ نہیں پڑی تھی۔ دن بدن مجھے اپنے شعور کا قد بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور دنیا بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

مشکل یہ ہے کہ دماغ کے ساتھ قدرت نے جسم بھی منسلک کر دیا ہے دماغ اور جسم میں کبھی کھٹ پٹ بھی ہو جاتی ہے کبھی اس دھر پٹخ میں راہوں کے دیے بجھ بھی جاتے ہیں۔ توازن قائم نہیں رہتا۔ ان میں سے ایک کی موت دونوں کو لے ڈوبتی ہے۔

لکھنؤ میں پہلی مرتبہ آزادی سے بازاروں میں گھومنے کے مواقع کے ساتھ لڑکوں سے بھی واسطہ پڑا۔

علی گڑھ میں تو کالج کے لڑکے دور فاصلے پر ایک گنجلک سا خواب تھے۔ لڑکی کے دل میں جو خوف جنس مخالف کے لیے بچپن سے بٹھایا جاتا ہے اس کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہوتی ہیں۔ میں چونکہ بھائیوں کی صحبت میں پلی تھی باپ کا سر پہ سایہ نہیں تقرب میسر ہوا تھا رشتہ کے بھائیوں کو بھگتا تھا لہٰذا لڑکے مجھے ہوّا نہیں لگتے تھے اور ایک شریف لڑکی مردذات کو ہوّا نہ سمجھے تو یقیناً وہ نیک نہاد نہیں ہوگی۔ سلطانہ، آمنہ بھی ذہنی طور پر مردذات سے خائف تھیں نہ مرعوب، ہر خاندان میں نالائق مرد ہوتے ہی ہیں۔ ان سے موازنہ کرکے تعلیم یافتہ لڑکی کے ذہن سے عورت کی کمتری کے سارے متھ ڈھول ہو جاتے ہیں۔ عورت کا مرد پر سبقت لے جانا خلاف قدرت نہیں ہے اور بنا ہوا یقین کہ عورت مرد سے کمتر ہے فرد کی سطح پر آکر احمقانہ ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر بھی یہ قدرت کا تقاضہ ہے کہ جنس مخالف کا وجود ایک دوسرے کے لیے ہنگامہ خیز

ہوتا ہے۔ جب یونیورسٹی جاتے تو اس احساس سے خوفزدہ ہو کر ہم بس گٹھ بنا کر ساتھ ساتھ رہتے، کیوں کہ گروہ میں ہر حملہ کی مدافعت کی طاقت ہوتی ہے۔

یونیورسٹی میں کلاس روم یا لکچر ہال میں اگر لکچرر قابل اور زوردار ہوتا تو ایسے محو ہو جاتے کہ ایک دوسرے کے جنسی وجود کو بھی فراموش کر دیتے۔ ہاں کوئی بور لکچرر ہوتا تو نگاہیں آس پاس بھٹکنے لگتیں اور مانس گند کی نقشہ پردازیاں شروع ہو جاتیں۔ مگر عموماً ایسا بہت کم ہوتا اور لکچرار چاہے اپنے مضمون پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس رویہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عموماً یونیورسٹی جب ہی جانا ہوتا تھا جب کوئی مشہور دانشور آتا اور ہم ایسے مسحور ہو جاتے کہ کبھی دھیان نہیں بھٹکا۔ لڑکے لڑکیاں معیاری طالب علم ثابت ہوتے۔

لیکن ہال سے نکل کر پھر فضا میں بارود کی بو پھیل جاتی اور لڑکیاں گٹے کی صورت میں الگ اور لڑکے بھیڑیوں کے غول کی طرح پیچھے پیچھے۔ خاص طور پر ایک لڑکا ہیری تو بس بے پناہ تھا۔ لڑکیاں "اے" ہائے" کہا کرتی تھیں۔ اس کا نام میڈوسا بھی رکھ دیا تھا کہ میڈوسا وہ آسیب تھا جسے دیکھنے والا پہلی نظر میں پتھر ہو جاتا تھا۔ ہیری کا چھ فٹ سے بھی کچھ نکلا ہوا قد، ڈس لینے والی غلافی آنکھیں، ولایتی ماں اور بنگالی باپ کے میل سے میٹھا شہد جیسا رنگ، اودے ہونٹوں میں سے بجلی کی طرح کوندتی ہوئی موتیوں کی قطار۔

ہیری کی دہشت صنف نازک پر بے طرح بیٹھی ہوئی تھی اس نے بڑے بڑے شکار کیے تھے جب اسکول ہی میں تھا تو کانوینٹ کی ایک نن کا تقدس بھنگ کر چکا تھا۔ کافی دن سے وہ آئی ٹی کے گروہ کو کالج کے پھاٹک تک پہنچانے جا رہا تھا اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ نشاط محل گروپ پر دست شفقت پھیر رہا تھا۔ ہمارے گروہ میں سلطانہ اور کئی قتالۂ عالم تھیں سلطانہ تو نہایت پھکڑ تھی، مگر آمنہ اس کی چھوٹی بہن بے حد بھولی اور گلاب کے پھول کی طرح نازک تھی۔ بے حد پڑھاکو، جنس مخالف سے بے خبر قطعی لقمۂ تر تھی سب سے چھوٹی مگر سب سے زیادہ بردبار، بزرگانہ نصیحتیں، اصولوں کی پابندی کی یاددہانی، دولت علم کی اہمیت پر کافی زور رہتا۔ ایک دن ہم سیڑھیوں پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے کہ آمنہ منہ سجائے کمرے سے نکلیں اور ڈانٹنے لگیں۔

"خود نہیں پڑھتیں تو دوسرے کو بھی نہیں پڑھنے دیتیں۔" جب وہ بڑبڑانے لگ گئی تو میں نے کہا۔

"اچھا دادی اماں، اب منہ پر تالہ ڈال لیں گے۔"

ایک دم آمنہ روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ صبح بات کا جواب ندارد۔ دو تین دن گزر گئے۔ ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا مگر بات کا جواب ندارد۔ یا خدا کیا ماجرا ہے۔

"کہتی ہے تم نے اسے گالی دی۔"

"گالی؟"

"ہاں دادی۔"

"اوہ یعنی اپنے دادا کی بیوی۔ مگر وہ تو کبھی کے انتقال فرما گئے۔" نہ جانے کیوں ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ بھولی سی بچی اور میرے دادا! جو آگرہ میں منوں مٹی تلے بے خبر سو رہے تھے اور میں ان کے ناطے جوڑ رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ تو کہاوت ہے۔ جو چھوٹی بچیاں بزرگانہ باتیں کرتی ہیں انھیں طنزیہ دادی اماں کہہ دیتے ہیں۔ بڑا پھسلایا تب جا کے ہنسیں۔

ہم جب بھی باہر نکلتے آمنہ ہمیشہ بیچ میں رہتیں یعنی قلعہ بند، کہیں کوئی لڑکا کہنی مارتا نہ نکل جائے۔ میرے ایک دفعہ ایک لڑکا کہنی مار کے آگے چلنے لگا۔ بے ساختہ میں نے بڑھ کے اس کی پیٹھ پر ایک کس کے دھموکا جڑ دیا۔ حرکت ایسی بے اختیاری تھی کہ میں خود بوکھلا گئی اور لڑکوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ وہ لڑکا سرپٹ بھاگا۔ میرے ساتھ ایلما تھی اس نے بہت ڈانٹا۔

شمیم جب مارتا تھا تو میرا بھی بے اختیار ہاتھ اٹھ جاتا تھا پھر بھی جب میری بہت مے دے ہوئی تو مجھے اپنی حرکت بہت بےجا لگی۔ بات پھیل گئی اور استادوں تک پہنچی لیکن کسی نے ذکر نہ چھیڑا نہ ملامت کی۔ کلاس میں کبھی استاد ایسے دیکھتیں کہ جی چاہتا چوہے کے بل میں گھس جاؤں۔ میں نے نسوانی وقار کو ٹھیس لگائی تھی۔

مگر دل کے کسی کونے میں کوئی کہتا تھا میں نے کوئی جرم نہیں کیا: وہ یقیناً شیطان ہوگا۔ اس شیطان نے بچپن میں بھی مار کھلوائی اور اب بھی رسوائی کی ذکر پر لے جا رہا ہے۔ شیطان کے سر الزام تھوپ کر مجھے کورنہ سکون ہوا شیطانی حرکتوں کی میں ذمہ دار نہیں تھی۔

مجھے نہیں یاد کہ مجھے کبھی کسی نے چھیڑا ہو۔ راہ چلتے یا تو میں ساتھ والوں سے اتنے جوش و خروش سے باتیں کرتی ہوں کہ سوائے اپنی آواز کے اور کچھ نہیں سنائی دیتا۔ ورنہ نہ جانے کہاں دور خلاؤں میں کھو جاتی ہوں کہ کچھ نہ سنائی دے نہ دکھائی دے۔ اکثر حادثہ سے بچی ہوں۔ موٹر کا ہارن ایسی حالت میں کبھی نہیں سنائی دیتا اکثر کہیں کی کہیں نکل جاتی ہوں لیکن جب جاگتی ہوں تو پلٹ کر سیدھی راہ چلنے لگتی ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتی ہوں کسی کو میری حماقت کا پتہ تو نہیں چلا بھلا کسی کو کیا پتہ میں بھٹک گئی ہوں۔

میں نے اپنے بڑے الجھے ہوئے مسائل بھی چہل قدمی کے دوران سلجھائے ہیں، کہانیاں ایڈٹ کی ہیں، برے وقت ٹالے ہیں۔ اب بھی جب کہیں سوئی اٹک جاتی ہے میں میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے چوپاٹی کی طرف چلنا شروع کر دیتی ہوں۔ راستہ میں کبھی کوئی جان پہچان کا مل جاتا ہے میں باتوں باتوں میں اپنے مسئلہ کو کسی کہانی کا پلاٹ کہہ کر یا کسی اور کے سر تھوپ کر نہایت غیر جانبداری سے تبادلۂ خیال کرتی ہوں۔ تنی ہوئی ڈوریاں نرم پڑ جاتی ہیں۔

سال کے خاتمہ پر جب بی۔ اے سینیر کی لڑکیوں کو الوداعی ڈنر دیا گیا تو پھر آئی۔ ٹی کالج کی روایت کے مطابق خوب رنگ جما، بہت ہی جذباتی رسم ادا کی گئی۔ ہال کا سارا فرنیچر دیواروں سے لگا دیا گیا۔ بیچ میں رخصت ہونے والی لڑکیاں ایک حلقے میں کھڑی ہوئیں اور جن کا آخری سال تھا وہ ان کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ اگلی قطار کی لڑکیوں کے ہاتھ میں مٹی کی ہانڈیوں کی رنگ برنگی قندیلیں تھیں جن میں چراغ روشن تھے۔ کالج کے گانوں کے بعد آخری رسم میں سینیر لڑکیوں نے وہ قندیلیں جونیر لڑکیوں کو سونپ دیں۔

"یہ علم کی شمع جو ہمیں ہماری سینیر بہنوں نے تھمائی تھی ہم تمہیں سونپتے ہیں۔"

"یہ بجھنے نہ پائے۔"

بے اختیار لڑکیاں پھوٹ کر رو پڑیں۔ پروفیسروں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

ان قندیلوں کی روشنی آج تک دماغ میں محفوظ ہے۔

ISBN - 81 - 230 - 0269 - 6

Price: Rs. 65/-



پبلی کیشنز ڈویژن
وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱